سید میرزا المحسن مالک نسخہ

رجسٹر نمبر بی ۔ ۲۱۵۰

انجمن معین الادب کا علمی و ادبی

رسالہ

ادبستان

مرتب

رشید صدیقی

معاون	معاون
منیر الہ آبادی	خلیل احمد سکروی

پرنٹر و پبلشر

جہانگیر [illegible] پریس [illegible] میں چھپوا کر رشید صدیقی نے

دفتر ادبستان [illegible] سے شائع کیا۔

جلد ۱ فہرست مضامین بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء نمبر ۲

تصاویر :- نورمحل - ڈاکٹر ٹیگور

بزم ادب

"ادبستان" کا ملک نے جو شاندار استقبال کیا وہ ہر طرح امید افزا ہے۔ اگرچہ یہ پہلی ہی کوشش تھی اور ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک علمی، ادبی رسالہ کے لئے بمبئی کی فضا کیسی ثابت ہوگی۔ تاہم نہایت مسرت ہے کہ اس ابتدا کو دیکھتے ہوئے مستقبل بہت شاندار نظر آتا ہے۔

ادبستان کے سلسلہ میں ہمیں بمبئی کے مسلمانوں کے ذوق اردو کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ نہایت خوشی ہے کہ مرہٹی اور گجراتی کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگوں میں اردو دانی کا کافی شوق پیدا ہوچکا ہے۔ بہت سے گھرانے تو ایسے ہیں جہاں اردو اپنے اصلی رنگ میں موجود ہے۔ یہ باتیں ادبستان کی ترقی اور بہبودی کے راستہ میں اور زیادہ ہمت افزا ہیں۔

مرہٹی انسائیکلوپیڈیا میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں جو ذلیل ترین گستاخیاں کی گئی ہیں انھیں کوئی مسلمان برداشت نہیں کرسکتا۔ اخبارات میں اس کے متعلق کافی طور پر مسلمانوں کے جائز غیظ و غضب کا اظہار کر دیا گیا ہے۔ تاہم اس باب میں خاموش رہنا ہم ایک ناقابل معافی گناہ تصور کرتے ہیں۔ حکومت کو لازم ہے کہ جلد از جلد اس اہم مسئلہ کے ازالہ و انسداد کی جانب متوجہ ہو۔

مضامین کی کثرت کی وجہ سے ہم بہت سے مفید مضامین شریک اشاعت نہ کرسکے حتیٰ کہ خلیل احمد اور منیر الہ آبادی صاحبان کے مضامین کے لئے جگہ نہ نکل سکی۔ مضمون نگار صاحبان ان مجبوریوں کا احساس کرتے ہوئے آئندہ اشاعت کا انتظار فرمائیں۔

ادبستان کے نظم و اشاعت میں بعض مخلص احباب اسقدر سرگرمی سے امداد فرما رہے ہیں کہ ہم ان کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سیٹھ عبدالغفور و سیٹھ الٰہی بخش صاحبان کی جو خاص توجہ ادبستان کی طرف ہے اس کا اظہار زبان قلم سے غیر ممکن ہے۔ خدا ان کے ارادوں کو مستقیم کرے اور آئندہ ہر قومی خدمت میں حصہ لینے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

ہماری سبھا کے اولوالعزم رکن جناب اسلامی نے "ادبستان" کے لئے باوجود ناسازی طبیعت جو کاوش گوارا کی ہے وہ ہمارے شکریوں سے بالاتر ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ "بن پرساد" ڈرامہ کے بعد کسی دوسری بہتر تصنیف کے ترجمہ پر قلم اٹھائیں گے۔

آخر میں ہم ملک کے ان تمام اہل قلم حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے "ادبستان" کے لئے قلمی اعانت کا وعدہ فرمایا ہے۔

رابندرناتھ ٹیگور

ہندوستان کے مشہور فلسفی شاعر رابندرناتھ ٹیگور آجکل اٹلی کی سیاحت میں معروف ہیں۔ گذشتہ سال ڈاکٹر ٹیگور امریکہ سے لوٹتے ہوئے اٹلی گئے تھے۔ اس وقت وہاں ان کا نہایت شاندار خیر مقدم کیا گیا تھا اور متعدد شہروں کی طرف سے دعوت نامے دیئے گئے تھے۔ لیکن صحت کے خراب ہوجانے کی وجہ سے وہ ان دعوتوں کو قبول نہ کرسکے تھے اور ہندوستان واپس چلے آئے تھے اس کے بعد اٹلی کے نئے فرمانروا بنٹو مسولینی نے روم کے ایک پروفیسر کے ذریعہ اٹلی کی بیش بہا کتابوں کا ایک ذخیرہ بطور تحفہ بھیجا اور ڈاکٹر ٹیگور کو مدعو کیا۔ چنانچہ اس سال مئی میں وہ دوبارہ اٹلی گئے۔ حکومت کی طرف سے ڈاکٹر ٹیگور کا شاندار استقبال کیا گیا اور وہ روم میں حکومت اطالیہ کے مہمان رکھے گئے۔ ڈاکٹر موصوف اٹلی اور ہندوستان کے مابین خوشگوار تعلقات قائم کرنے میں کوشاں ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستانی طلبار وہاں کے علوم و فنون سے فائدہ اٹھاسکیں گے۔



نورِ محل

(از رشید صدیقی)

ملکۂ نور جہاں پہلے ہوئی نور محل — اس کے حق میں تھی یہی مرضیٔ قسامِ ازل
زینتِ قصرِ شہنشاہ ہوا اسکا جمال — محفلِ حسن کے اسکی تھے مہ و خور مشعل
نظرِ عام پہ مصروفِ تماشہ تھی کہیں — اتفاقاً ہیں شہزادہ سلیم آیا نکل
تابشِ حسن سے منظورِ نظر بن بیٹھی — دیکھتے ہی دلِ ناداں گیا پہلو میں مچل
لاکھ تدبیر کی لیکن کوئی قابو نہ چلا — سختیٔ ہجر سے ہوتی ہی گئی جاں بیکل

پارسے قسمت کے لکھے سے وہ زمانہ آیا — کہ تکالیف ہوئیں دور مصائب ہوئے حل
ہو چکا تھا جو شہنشاہ جہانگیر سلیم — قصر میں آکے ہوئی نورِ محل نور محل
تن بیجاں میں محبت نے نئی جاں پھونکی — کھل گیا غنچۂ دل شاہ کا مانندِ کنول

رونقِ بزم ہوئی نور محل، نور جہاں — نخوتِ حسن سے ڈالے ہوئے منھ پر آنچل
نغمہ و ساز نے ساغر سے ہم آہنگی کی — ناز و غمزے نے حجابوں کے نکالے کس بل
محوِ دیدارِ جہانگیر ادھر جام بکف — بادۂ عشق میں سرشار ادھر نور محل
اس کی دنیائے تخیل میں تلاطم برپا — اس کے جذبات کے عالم میں مچی اک ہلچل
واں چھلکتا تھا کبھی نغزشِ مستانہ سے جام — اور یہاں ناز سے کھاجاتے تھے نغمے سو بل

اس تعلق میں، تھا قدرت کا یہ نکتہ پنہاں
عشق اور حسن۔ "جہانگیر" یہ ۔ وہ "نور جہاں"

پن پرچھاؤ

(از رام گنیش گڈکری)

(مترجمہ جناب اسلامی)

پہلا ڈراپ

(پہلا سین)

(آرند صحن میں شیو کا مندر)

ایشور ۔ (دل ہی دل میں) اگر ترک محبت نے مجھے نیکی کے راستہ پر گامزن نہ کیا ہوتا تو تاایک میں دیوانگی کی نذر ہو جاتا ۔ اے خدا! جس کام کو میں نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے اس میں مجھے بامراد کر ۔ میری زیست ہر آن پلٹتی رہتی ہے تو اپنے عبادت گذار بندوں کے طفیل میں میرے ارادوں کو مستقل کر دے ۔ اے خوش نصیب بھوپال تجھے وسندرا مل گئی تو اس کے عشق و محبت میں چین و سکھ کی زندگی بسر کر ۔ یہ تارک الدنیا ایشور تیری راحتوں میں خلل انداز نہ ہوگا ۔ لیکن میرے دل کی بیکلی نہیں دور ہوتی اس میں شک نہیں کہ اس مندر کے دروازہ پر میں وسندرا کی آمد کا منتظر ہوں لیکن ہوا کی آہٹ اور پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ مجھے وسندرا کے پیروں کی چاپ معلوم ہوتی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے چاروں طرف سے وسندرا آرہی ہے ۔ میں یہ کیوں سمجھتا ہوں؟ مجھے اتنی بیقراری کیوں ہے؟ کیا اس کا سبب صرف یہ ہے کہ میری وسندرا آج کئی سال کے بعد مجھے ملنے والی ہے ۔ کیا مجھے ارمانوں اور آرزوؤں نے بیقرار کر رکھا ہے؟ لیکن مجھے اس کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا ۔ کسی کے دل کو مبتلا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ اپنے دل کو مصیبت میں ڈالنا مشکل! نہیں نہیں مجھے اب یہ خیال چھوڑ دینا چاہئے ۔ دیکھو دیکھو وسندرا مندر سے باہر آرہی ہے آہ میرے دل کی تمام تمنائیں اسے دیکھ کر آنکھوں میں سمٹ آئیں ۔

(وسندرا اور اس کے پیچھے دامینی وسندرا کے بچہ کو گود میں لئے آتی ہے)

وسندرا۔ دامینی: دینار کو گود میں لے کر سیڑھیوں پر تیزی سے نہ اتر۔ میں نے تجھے ہزار بار منع کیا ہے لیکن تو باز نہیں آتی۔ تو بڑی ضدن ہے۔ سنتآم تیری اس بری عادت کی جو شکایت کرتا ہے وہ مجھے سچ معلوم ہوتی ہے۔

دامینی۔ بائی جی آپ بہت جلد ڈر جاتی ہیں۔ آپ بالکل بےفکر رہیں آپ کا دینار آپ کے لئے صرف دینار ہی ہے۔ لیکن ہمارے لئے وہ ہیرا ہے آیا سمجھ میں؟

وسندرا۔ اچھا دیکھ تو! تونے اس کا کنٹوپ بھی سرکا دیا۔ شام کے وقت کوئی میرے بچے کو دیکھیگا تو کیا نظر نہیں لگ جائے گی؟ سب کی نظر ایک جیسی تھوڑی ہی ہوتی ہے۔

دامینی۔ بائی جی بھلا مجال ہے کہ نظر لگ جائے؟ اگر خدا نخواستہ ایسا ہوا تو لوگ نیمو نچھاور کرتے ہیں میں اپنی جان نچھاور کر دونگی۔ تمہاری اس ڈرپوک عادت سے ہمارے بابو جی (دینار) کو بہت دشمنی ہے۔ دیکھو دیکھو! تم نے نظر کا نام لیا تو اس نے غصہ کے مارے بڑی بڑی آنکھیں نکالدیں۔ ارے بھگوان! میں تو اس کی آنکھیں دیکھ کر کانپ گئی۔ اور تم کہتی ہو اسے نظر لگ جائے گی۔ کیا نظر لگنے کے ڈر سے ایسے بے بہا ہیرے کو گھر میں بند کرکے رکھیں۔ یہ سب تو اتفاق کی بات ہے۔ اللہ میاں نے یہ لاکھوں چمکیلے ستارے کیا آسمان میں چھپا کر رکھے ہیں؟

وسندرا۔ ہاں۔ ہاں! لیکن کیا ستاروں پر نظر نہیں لگتی؟ کیا تونے ستاروں کو ٹوٹ کر گرتے ہوئے نہیں دیکھا؟ پھر کیا وہ کسی پاپی کی نظر لگے بغیر ٹوٹتے ہیں؟ بہت سی ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو ہمارے وہم میں بھی نہیں آتیں۔

دامینی۔ بائی جی دیکھو وہ کون موا دیکھتا ہے۔

وسندرا۔ دامینی تجھے بغیر بدکلامی کے بات کرنی نہیں آتی۔

دامینی۔ اے پھر کیا کروں بائی جی! وہ میری طرف برابر گھورے جاتا ہے۔ ان کمبختوں کو اپنی آنکھوں کا کچھ دھیان نہیں رہتا۔ اچھا چلو جانے دو ادھر مت دیکھو۔

(وسندرا ایشور کی طرف دیکھتی ہے۔)

دامینی ۔ ارے بدمعاش! ہماری طرف کیوں گھورتے .... ـــــ

وسندرا ۔ دامینی! ذرا چپ رہ! ـــ کون تم ایشور!

ایشور ۔ جی ہاں میں وہی آپکا پرانا خادم ایشور ہوں ۔

وسندرا ۔ معاف کرنا ایشور! میں نے پہلے تمہیں نہیں پہچانا۔ تمہاری حالت ہی کچھ ایسی بدل گئی ہے کہ سچ مچ دھوکہ ہوتا ہے

ایشور ۔ ہاں! سچ کہتی ہو ۔ میری جسمانی حیثیت ہی نہیں بدل گئی ہے ۔ بلکہ میری اندرونی کیفیت میں بھی تغیر ہوچکا ہے ۔

وسندرا ۔ کیا میں سبب دریافت کرسکتی ہوں؟ لیکن تم اسے بناوٹ تو نہ سمجھوگے؟

ایشور ۔ آہ! وسندرا! اس غم کے مارے کی کہانی سنکر تیرا کلیجہ پھٹ جائیگا ۔ اس لئے میں خاموش رہنا ہی بہتر سمجھتا ہوں ۔

وسندرا ۔ آہ! ایشور! کیا میں اتنی بدقسمت ہوں کہ تمہاری حالت بھی نہیں معلوم کرسکتی! جس حال میں تم زندگی گذار رہے ہو کیا اس کے سننے کے لائق میں نہیں ہوں؟ میں اس سے پہلے تم سے ملنے کے لئے آنے والی تھی ۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم عزت و ثروت حاصل کرنے کی غرض سے کہیں باہر چلے گئے ہو ۔

ایشور ۔ جھوٹ ہے! سب جھوٹ ہے!! جو کچھ تم نے سنا غلط سنا ۔ جب کوئی شخص اپنی روش بدل دیتا ہے تو لوگ اس کے متعلق بدگمانیاں کرنے لگتے ہیں ۔ اگر امیر ہے تو تعریفیں ہوتی ہیں ۔ غریب ہے تو ملامت سنتا ہے ـــــ ہاں سچ ہے وسندرا! تم نے جو کچھ سنا ایک طرح سے ٹھیک سنا ۔ میں نام پیدا کرنے کے لئے نہیں بلکہ ایک نیا نام تلاش کرنے کے لئے گیا تھا ۔

وسندرا ۔ ایشور! سچ کہتی ہوں: تمہاری پردرد کہانی سن کر مجھے رونا آتا ہے ۔ افسوس کہ تمہیں ہنسی سوجھتی ہے ۔

ایشور ۔ پیاری! مجھے اور رنج و غم سے دوستی ہوگئی ہے ۔ میں مصائب سہنے کا اتنا عادی ہوگیا ہوں کہ مجھے اب بالکل پرواہ نہیں ہوتی

(باقی دارد)

افسانے

جوانی دیوانی

(از قاضی اشفاق احمد)

یوں تو برطانیہ خود ایک جزیرہ ہے۔ مگر اس کے گرد و پیش سمندروں میں بہت سے اور بھی چھوٹے چھوٹے جزائر ہیں جنہیں سے ابنائے برطانیہ یا برٹش چینل کے جزائر خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں ان میں باغبانی کے ساتھ کاشت سے خوب آمدنی ہوتی ہے اور چونکہ فرانس اور انگلستان دونوں سے ان کی آمد و رفت ہے اس لئے یہاں کی پیداوار سے اچھا خاصہ منافع ہو جاتا ہے۔ انہیں جزائر میں سے ایک چھوٹا سا جزیرہ انتہائی مغربی جانب واقع ہے اور اپنی جغرافیائی حیثیت سے یہ برٹش چینل اور بحر اٹلانٹک دونوں سے متعلق ہے اور اس لئے بیحد زرخیز۔ یہ جزیرہ بحر اٹلانٹک کی جنوب سے آتی ہوئی گرما گرم لہروں سے (جسے انگریزی میں گلف اسٹریم کہتے ہیں) بیحد فائدہ اٹھاتا ہے اور یہاں کی ترکاری یہاں کی سبزی اور یہاں کے دودھ اور مکھن وغیرہ کی پیداوار بہت معقول اور عمدہ قسم کی ہوتی ہے جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت یہ جزیرہ قریب قریب غیر آباد تھا جزیرہ کے مشرقی جانب چند ماہی گیر اور ملاح رہتے تھے اور ایک دوکاندار اہل جزیرہ کی ضروریات کی چیزیں الڈرنی یا سینٹ ہیلیر سے دسویں پندرھویں یا پندرھویں دن لایا کرتا اور جزیرہ والوں کی حاجت پوری کر دیا کرتا۔

جزیرہ کے مغربی جانب ولیم نامی ایک کسان آباد تھا جس نے جزیرہ کے جنگل کو صاف کر کے ایک مزرعہ بنا لیا تھا اور اپنی ایک چھوٹی لڑکی میری کے ساتھ محنت مشقت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ میری ابھی مشکل سے آٹھ برس کی ہوئی ہوگی کہ ولیم بیمار ہوا۔ دوا علاج تو خیر کیا ہوتا ہی بہت تھا کہ اس کا ایک دوست ماہی گیر اس کی تیمارداری کے لئے آ گیا اور مریض کی تیمارداری کے ساتھ ساتھ میری کی بھی خبر گیری کرتا۔ بیماری میں ولیم کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی اور اب وہ وقت قریب تھا جبکہ یہ سوال پیدا ہونے والا تھا کہ میری کی آئندہ کون خبر گیری کریگا۔ ایک روز جبکہ ولیم غشی میں مبتلا تھا ایک نووارد جلد جلد مگر گھبراہٹ کے ساتھ ولیم کے مکان میں آتا ہوا نظر آیا۔ اس نے آتے ہی ماہی گیر کو تیمارداری اور خبر گیری

سب نے شکریہ کے ساتھ سبکدوش کر دیا۔ اور خود ایک قریبی عزیز کی طرح رہنے سہنے لگا۔ آنا تو سب کو رفتہ رفتہ معلوم ہو گیا کہ اس کا نام ہنری ہے اور ولیم کا شناسا ہے مگر یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

دو چار روز کے بعد ولیم ہمیشگی کی نیند سو گیا اور ہنری اب مستقل طور سے یہیں ٹھیر کر کاروبار کرنے لگا۔ اس نے کچھ جنگل اور صاف کر کے مزرعہ کو بڑھایا۔ مویشیوں میں چند اور گایوں کا اضافہ کیا اور پوری تندہی سے کاشت میں مشغول ہو گیا۔ یہ نہ کہیں آتا نہ جاتا۔ صرف وہی تیار دار ماہی گیر کبھی کبھی اسے اپنی کشتی پر قریب کے ایک بڑے جزیرہ میں لیجاتا جہاں ہنری اپنی سبزی۔ پھل مکھن اور دوسری پیداوار فروخت کر آتا مگر دن رہے ہی لوٹ آتا۔

دن جاتے جاتے دیر نہیں لگتی اس واقعہ کو ۸ سال ہو گئے۔ اب میری ۱۶ برس کی تھی اس کا بچپن جوانی سے گلے مل رہا تھا اور یہ خود خانہ داری کے کام میں ہنری کو مدد دیا کرتی۔ ہنری کی عمر بھی کسی طرح تیس برس سے کم نہ تھی۔

ایک روز بہار کے موسم میں جبکہ ہنری اور میری دونوں مکان کے باہر سمندر کی جانب بیٹھے ہوئے آفتاب کی کرنوں کے مزے لے رہے تھے بحر اٹلانٹک کی جانب سے ایک کشتی آتی ہوئی نظر آئی اور تھوڑی دیر میں وہی تیار دار ماہی گیر ایک نو وارد کے ساتھ اوترا۔

ہنری۔ (خشک لہجہ میں) اوہو ٹامس تم کیسے آ گئے۔

ٹامس۔ میں نے سوچا کہ میں خود چلکر پیرس کی ترکاریوں کا بیج تمہیں دے آؤں۔

ہنری ٹامس اور میری ماہی گیر کو بھی ساتھ لئے ہوئے اپنے مکان میں آئے جہاں میری نے ان سب کی چاء توست دودھ مکھن اور مختلف پھلوں سے تواضع کی اور کھانے کے بعد برتن سلیقہ سے ٹھکانے رکھ کر خود مکان سے باہر نکل گئی۔

ٹامس بھی کچھ دیر باتیں کر کے ماہی گیر اور ہنری کو چھوڑ کر باہر نکلا اور خراماں خراماں وہاں پہونچا جہاں میری کسی ادھیڑ بن میں بیٹھی ہوئی تھی۔

ٹامس ۔ اچھا تو اٹلانٹک کی شہزادی تمہیں ہو ۔ ؟

میری نے استعجاب سے اسے دیکھا ۔

ٹامس ۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے مجھ سے ماہی گیر کہہ چکا ہے کہ ان جزائر میں تم سے بڑھکر کوئی حسین نہیں۔ اور تم واقعی اٹلانٹک کی شہزادی ہو ۔

اِس کے بعد کوئی آدھے گھنٹہ تک دونوں باتیں کرتے رہے اور ٹامس نے گو صاف اظہار عشق تو نہ کیا مگر اس کی گفتگو لب ولہجہ اور حرکات وسکنات میں محبت کی بو ضرور تھی اور آخر میں اس نے یہ بھی کہا کہ تمہاری یاد مجھے جلد ہی واپس لائیگی ۔ اتنے میں ماہی گیر بھی باہر نکلا اور ٹامس اور ماہی گیر کشتی کی طرف چلے۔ راستے بھر ماہی گیر اس جزیرہ کی تعریف کرتا رہا اور آخر میں یہ بھی کہا کہ یہاں ایسا امن ہے کہ ہنری اپنا سارا روپیہ ایک لکڑی کے صندوق میں اپنے سونے کے کمرے میں رکھتا ہے اور نہ چور کا ڈر ہے نہ ڈاکو کا . . . .

میری کی نگاہیں برابر کشتی ہی کی طرف تھیں ہاں ایک دفعہ اس نے ذرا کے ذرا ادھر اُدھر بھی جو نظر دوڑائی تو . . . . . . دیکھا کہ ہنری ساحل کی طرف سے کھیت کی طرف جا رہا ہے ۔

اس واقعہ کو ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے برسیں گذر گئیں ۔ میری کا مشغلہ بجز انتظار اور کچھ نہ تھا یہ بتانا بیکار ہے کہ میری کو ٹامس پر اعتبار تھا اور اپنے دل سے مجبوری ۔ پورے تین سال انتظار میں گذر گئے مگر ٹامس نہ آج آتا ہے نہ کل ۔ وہ مایوس نہ تھی مگر اس کی افسردگی بڑھتی جاتی تھی اور جوں جوں دن گذرتے جارہے تھے اس کی قوت ضبط جواب دیرہی تھی ۔ ہنری اس کی اس حالت پر دل ہی دل میں کڑھتا مگر کبھی ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتا ۔ مگر ایک دن جبکہ میری جنگل میں بیٹھی رو رہی تھی اتفاقاً ہنری وہاں آگیا اور روتے دیکھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور یوں گویا ہوا ۔

ہنری ۔ میری یہ تم نے آخر اپنی کیا حالت بنائی ہے مجھ سے کہو کیا غم ہے ۔

میری (روتی ہوئی) آہ وہ اب تک نہیں آیا ۔

ہنری ۔ (چونک کر) کون ۔ کیا کہا ۔
میری ۔ ٹامس نے مجھ سے پھر جلد آنے کا وعدہ کیا تھا مگر تین سال ہو گئے (پھر رونے لگی)
ہنری (غصہ میں) کیا اس بدمعاش نے تم سے کچھ کہنے کی جرات کی اس کی یہ مجال ہے کہ یہاں پھر قدم رکھے اچھا آنے دو ۔
میری مارے غصہ کے حواس میں نہ تھی آنسو خشک تھے اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح چہرہ تمتمانے لگا
میری ۔ اچھا تو تم اس کے مخالف ہو (یہ کہہ کر وہاں سے بھاگی)
ہنری نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی گو دل ہی دل میں اسے سخت دکھ ہو رہا تھا ۔ اور میری تو اسے اپنا جانی دشمن سمجھ رہی تھی ۔ اور حالت یہ ہو گئی تھی کہ کھانا پینا بھی دونوں کا الگ تھا ۔ ہنری نے ایک دن کسی موقع سے یہ ضرور کہا کہ میری ۔ آج چاہے تم میری بات کا برا مانو مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہیں اپنی اس غلطی پر ایک روز پچھتانا پڑیگا ۔ اور اس وقت تم میری قدر کروگی ۔
میری نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور جنگل کی طرف چلدی اس واقعہ کو ایک سال اور گذر گئے اور دونوں میں غیریت اور بڑھتی گئی اگرچہ ہنری اپنی طرف سے خاطرداری میں کمی نہ کرتا ۔ ایک روز دوپہر کو میری سخت بے چین ہوئی اور اٹھ کر لب ساحل جنگل میں جا بیٹھی ۔ ہنری اس وقت کھیت میں کام کر رہا تھا ۔ اور آج بہت خوش تھا ۔ ساحل پر سناٹا تھا ۔ اتنے میں ایک کشتی نمودار ہوئی جس پر صرف ایک شخص سوار تھا ۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ شخص ٹامس تھا ۔ ہاں چار سال کے بعد اس کی آمد ضرور تعجب خیز تھی مگر اب اس کے پوشیدہ رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں کہ ٹامس ایک جواری اور بدچلن شخص تھا اور جب وہ اپنی ساری دولت ہار چکا اور دنیا میں اس کے پاس ۔۔۔ کچھ نہ رہ گیا تو اسے ہنری کے صندوق کی یاد آئی جسے وہ بقول ہاری گیر اپنے خوابگاہ میں رکھتا تھا ۔ اور میری کی محبت نہیں بلکہ اشرفیوں کی کشش اسے کشاں کشاں لے آئی ۔
ٹامس نے جنگل کی اوٹ میں اپنی کشتی روکی اور خود چھپے چھپے ہنری کے جھونپڑے تک پہونچا جنگل ہی سے وہ ہنری کو کھیت میں کام کرتے دیکھ چکا تھا اب جو کچھ دھڑکا تھا وہ میری کا تھا ۔ ہمت کرکے

یا قسمت یا نصیب کہتا ہوا آگے بڑھا ۔ مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا ۔ یہ اندر داخل ہوا ۔ ادھر اُدھر دیکھا میری کا پتہ نہ تھا ۔ یہ تو پہلے ہی چکا تھا بید حرک ہنری کی خوابگاہ میں گھسا ۔ سامنے چھوٹا سا لکڑی کا صندوق رکھا ہوا تھا مگر مقفل تھا ۔ صندوق کو توڑ کر روپیہ نکالنا تو طول عمل تھا ۔ ٹامس نے جلدی میں صندوق اٹھایا اور چلدیا ۔

دروازہ کے پاس ذرا رک رک کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور میدان صاف پاکر تیزی سے جنگل کی طرف بڑھا ۔ سانس پھول رہی تھی دم چڑھ رہا تھا ۔ قدم قدم پر افشائے راز کا دھڑکا تھا ۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا ۔ پاؤں چلنے سے عاری تھے اور صندوق بھی بوجھل معلوم ہوتا تھا ۔ کسی نہ کسی طرح ٹامس جنگل میں داخل ہو گیا اب اسے ذرا اطمینان تھا مگر ساتھ ہی یہ فکر بھی تھی کہ یہاں سے جلد نکل چلنا چاہیئے ۔

ٹامس کشتی کے پاس پہونچا اس نے جھک کر صندوق کو کشتی کے نیچے والے حصے میں رکھدیا اور خود درخت سے بندھی رسی کھولنے کے لئے کنارہ پر آیا تاکہ کشتی لے کر روانہ ہو جائے ۔ رسی وہ کھول ہی چکا تھا کہ کسی نے آکر اسے لپٹا لیا اور یوں کہنا شروع کیا کہ :-

" دیر میں آئے مگر خیر تم آئے تو ۔ مگر بڑے وعدہ فراموش ہو ۔ آہ نہیں کیا خبر کہ ان چار سال میں مجھ پر کیا گذری ۔ میری کی اس تقریر نے ٹامس کو پرانے زمانہ کی یاد دلائی اور دل میں اس نے کہا کہ واہ رے تقدیر ۔ روپیہ کا روپیہ ملا اور عورت کی عورت ۔ اس وقت چوکنا بیوقوفی ہے ۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے میری کو گود میں اٹھایا اور لاکر کشتی میں بٹھا دیا ۔

میری ۔ (اطمینان کے لہجے) آخر تم مجھے کہاں لے جاؤ گے ۔

ٹامس ۔ چلو پیرس چلیں گے وہیں پڑے رہیں گے ۔

ہنری آج خوش خوش کھیت سے لوٹا ۔ سوچتا آرہا تھا کہ آخر اب اس محنت کا پھل کھانا چاہیئے مجھے بارہ سال کام کرتے ہو گئے ۔ اب تک میں نے یہ نہیں دیکھا کہ میں نے کتنی اشرفیاں جمع کی ہیں ۔

اندازاً ہزار اشرفیاں ہونگی۔ اچھا آج چلو انہیں شمار تو کریں کہ واقعی کتنی ہیں۔ مگر شمار کرکے کیا ہوگا ابھی تو میری کا غصہ نہیں اترا مگر حق حق ہے۔ میری کا غصہ اترےگا وہ نیک اور بدمعاش میں خود تمیز کریگی۔ آہ میں خود کس منہ سے کہوں کہ ٹامس بدمعاش اور جواڑی ہے۔ مگر خیر اشرفیاں تو آج گنونگا ہی۔

یہ سب سوچتا ہوا ٹامس مکان میں داخل ہو کر سیدھا اپنی خوابگاہ میں گیا۔ ادھر ادھر نگاہ ڈالی تو صندوق غائب صبح کو جس وقت اٹھا صندوق موجود تھا۔ آخر ان دو گھنٹوں کے اندر کیا ہو گیا۔ گھبرا کر باہر نکلا۔ اتفاقیہ سمندر کی طرف نگاہ گئی سامنے ایک کشتی نظر آئی۔ کشتی کا نظر آنا تھا کہ ایک برقی رو جسم میں دوڑ گئی اور "بیشک وہی بدمعاش ہوگا" کہتا ہوا اپنی ڈینگی کی طرف دوڑا اور جلدی سے سوار ہو کر چلا۔ ٹامس نے بھی جلد ہی اسے دیکھ لیا۔ مگر ہلکی پھلکی ڈینگی کے سامنے سے بھاگ کر نکل جانا آسان نہ تھا۔ پھر بھی کشتی کو تیز چلانے کی کوشش کرنے لگا۔ میری کو اس کی خبر نہ تھی۔ وہ اپنے سوچ میں بیٹھی تھی کہ اتفاقیہ اس کی نظر صندوق پر پڑی اور وہ حیران رہ گئی۔

میری۔ کیا تم ٹامس کی اشرفیوں والا صندوق بھی اٹھا لائے۔

ٹامس۔ ہوں ہوں نہیں چپ بیٹھی رہو۔

میری۔ نہیں نہیں یہ نہایت کمینہ حرکت ہے میں اسے پسند نہیں کرتی۔ چلو کشتی پھیرو ہمیں اس کا صندوق رکھ آنا چاہیئے۔

ٹامس۔ پاگل ہو۔ بھلا یہ بھی ہو سکتا ہے۔

میری۔ تو معلوم ہوا کہ تم میرے لئے نہیں بلکہ ہنری کی اشرفیوں کے لئے آئے تھے۔

میری یہ کہہ کر کھڑی ہو گئی۔ اور ٹامس کی طرف بڑھی کچھ ٹامس کا ہاتھ رکا کچھ کشتی کو حرکت ہوئی اور میری کا منہ اب جزیرہ کی طرف تھا۔ اور سامنے ہنری ڈینگی پر سوار تھا۔

میری (چلاکر) ہنری ہنری آؤ اپنا صندوق لے جاؤ۔

ہنری۔ یا اللہ یہ کیا دیکھ رہا ہوں ارے میری تم یہاں کہاں

میری کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ٹامس نے میری کو زور سے ایک دھکا دیا اور وہ سمندر میں گری۔

ٹامس تو کشتی بڑھا کر نکل گیا مگر ہنری بدحواس تھا اور اس کی بدحواسی کی کوئی انتہا نہ رہی جبکہ اس نے دیکھا کہ مردم خور شارک مچھلی منہ کھول کر میری کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہنری ڈانڈ ہاتھ میں لے کر پانی میں کود پڑا۔ ڈانڈ کو تو شارک کے کھلے ہوئے منہ میں ڈال دیا اور خود میری کی طرف بڑھا اور بہ آسانی تمام اسے گھسیٹ کر ڈونگی کے پاس لایا اور کسی نہ کسی طرح اس میں سوار کیا پھر خود بھی پھرتی سے ڈونگی میں آبیٹھا۔ اور ایک معمولی سا چپّو ہاتھ میں لے کر ڈونگی کو کنارہ کی طرف لے چلا۔

جزیرہ میں ہنری اپنے مکان میں بیٹھا ہوا ہے اور میری سامنے دو زانو ہے اور رو رہی ہے۔

ہنری۔ میری غمگین ہونے اور رونے سے کیا فائدہ خدا کا شکر بجالاؤ کہ اس نے تمہاری جان بچائی۔

میری۔ مگر تمہاری اشرفیاں۔

ہنری۔ پیاری اشرفیاں تم پر سے قربان۔ تم مجھے مل گئیں۔ ساری دنیا مل گئی۔ ہم تم ہیں تو اشرفیاں بہت ملینگی۔

اب میری ہنری کی گود میں تھی۔ اور یہ بتانا فضول ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں میری دنیا میں مسز ہنری بن گئی۔

واردات قلب

(از محمد صدیق مسلم ایگانوی تلمیذ مولانا عزیز مدظلہ العالی)

فراہم نقش فطرت کی میں سب رنگینیاں کرلوں
یہی جی چاہتا ہے دل کو صحن بوستاں کرلوں

پیام ظلم اب ہر صبح میرے حق میں لاتی ہے
یہ جھگڑا ایک دن کا ہو تو کچھ ضبط فغاں کرلوں

دم وعدہ تو ان کے رخ سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا
وہ وعدے پر نہ آئیں گے یہ میں کیونکر گماں کرلوں

مرا افسانۂ غم وہ سنیں اتنی کہاں فرصت
نہ کیوں چہرے ہی کو جذبات دل کا ترجماں کرلوں

یقیں تو لا رہا ہوں وعدۂ فردا پہ میں ان کے
مگر پہلے کچھ اپنے ضبط دل کا امتحاں کرلوں

بیاں کرنے لگوں قصے اگر شبہائے فرقت کے
یقیں ہے قصۂ محشر کو زیب داستاں کرلوں

بڑی مشکل سے ہاتھ آیا ہے دامن اس ستمگر کا
نہ کیوں فریاد ہی فریاد میں دل کا بیاں کرلوں

کہاں فرصت ملی اتنی کبھی صحرا نوردی سے
کہ میں کچھ جستجوئے نقش پائے کارواں کرلوں

ہجوم اشک حال درد دل کہنے نہیں دیتا
اشارہ ہے کہ میں آنکھوں ہی آنکھوں میں بیاں کرلوں

مرے شعروں میں مسلم درد دل کی ترجمانی ہے
معاف اے دوست! اس پر بھی گر آہ و فغاں کرلوں

شب انتظار

افسانے

(از غلام علی خاں صاحب مانی اجمیری)

انتظار ایک جانسوز التہاب ہے جس کا آغاز ایک آن مخصوص کے الفت آمیز تکلم اور مسرت آفرین عہد و پیمان سے ہوتا ہے جسکی شعلہ باریاں ہر گھڑی افزوں اور ہر لحظہ فراواں ہوتی جاتی ہیں حتیٰ کہ اپنی تابش و گداز کے نمایاں تاثرات سے جذبات محبت کو برانگیختہ کرکے ایک نئی سی جان کو از خود رفتہ کر دیتی ہیں۔ مگر ہائے اس اشتعال کا انجام کیا؟ نہیں نہیں اس کا انجام وہ ہے جو میری حاشیۂ خیال سے متجاوز ہے۔ مگر مجھے اس سے کیا واسطہ، میں تو محض اس کے علاج کے درپے ہوں لیکن بدبختی دیکھئے کہ وہ علاج وہ لافانی درماں مجھے معلوم ہے مگر میں اس کی تحصیل سے قاصر ہوں میں جانتی ہوں کہ اس آتش نہاں کے فرو کرنے کے لئے جس آب جاں بخش کی ضرورت ہے وہ ایک پیاری ہستی ہے، مگر اس کا حصول میری دست قدرت سے باہر اور دور ہے"۔

شکیلہ نے یہ پرمغز الفاظ کہے اور طبیعت منتشر پر ایک ہلکی سی ٹھیس کھا کر اپنے حزین بستر سے اتر گئی اور کمرے میں ادھر ادھر مضطربانہ انداز سے ٹہلنے لگی۔ دریچے سے باہر بوقلموں رنگینیوں سے لبریز افق کو دیکھا اس شاہ خاور کا دن بھر کے اضمحلال سے تنگ آکر سنہری چادر میں بغرض آرام ملبوس ہوتے ہوئے مشاہدہ کیا۔ شام کی آمد پر ہر طرف سامعہ نواز راگنیاں سنی گر مسرور نہ ہوئی بلکہ ایک حسرت بھری صدائے عمیق میں کہا۔

"آج کا وعدہ تھا۔ آج میں مدت کے چھوٹے ہوئے دل و جان کے مالک "واحد" کو دیکھتی اور اپنے بیتاب قلب کو تسکین دیتی، لیکن افسوس کہ سارا دن گذر گیا۔ سورج غروب ہونے کو ہے شام اپنی ہولناک آنکھیں دکھارہی ہے مگر واحد۔ واحد ابھی تک نہیں آیا۔ آہ ؎

شام آئی ہوا بیمار محبت بے کل
سامنا پھر ہے اسی عالم تنہائی کا!

سیاہی محیط ہے اور اشجار ساکت ، پرندوں کی نغمہ سنجی مفقود ہے اور ہر طرف خاموشی طاری ہے
اس سکوت کے عالم میں شکیلہ افکار پریشاں میں اس قدر مستغرق تھی کہ معلوم ہوتا تھا ایک
مرمریں مورت ہے جو صامت کمرے میں اپنی حسن پاشی میں سرگرم ہے یا ایک نو تراشیدہ بت ہے
جس پر انواع و اقسام کی رنگ آمیزی ایک کامیاب مصور کے قلم ساحر سے کی گئی ہے اس کے
لمبے اور سیاہ گیسو اس کے بھرے ہوئے شانوں پر بکھرے ہیں ۔ اور ان کے درمیان وہ چہرۂ روشن
حقیقتاً ایک ماہِ منور کی طرح ابر سیاہ سے نکلتا نظر آتا ہے ۔ وہ جسم حسین ایک شاندار پلنگ
پر ہے ۔ اس کے دونوں ہاتھ سینہ پر ہیں ۔ اور گردن جھکی ہوئی ہے آنکھیں قمیص کی سنہری گوٹ
پر گڑی ہیں اور وہ تصویر خاموش بنی ہوئی ہے ۔

یکایک کسی کے پیر کی چاپ مخل ہوئی ۔ شکیلہ چونک کر اٹھی اور دروازہ پر گئی تو ملازمہ
کی آواز کان میں آئی ۔

اچھی بی کھانا کھالو ، بہت وقت ہو گیا ہے ۔

شکیلہ ۔ تم کھالو ، میری طبیعت کچھ ناساز ہے ، میں نہیں کھاؤنگی ۔

ملازمہ ۔ خیر بی بی ۔ کچھ تو کھالو ، جتنا جائے اتنا ہی سہی خالی کلیجہ نہیں سوتے ہیں ۔

شکیلہ ۔ مجھے بھوک مطلق نہیں ہے ، تم جاؤ میں نہیں کھاؤنگی ۔

ملازمہ لوٹ گئی ۔ شکیلہ نے دروازہ نیم باز کیا ۔ اور پھر اسی طرح فراق کی گھڑیاں
کاٹنے کے لئے غمکدہ میں آ بیٹھی ۔

ابھی پلنگ پر بیٹھے چند ہی لمحات گذرے ہونگے کہ اس نے رات کاٹنے کے لئے کسی شغل کے
انتخاب کا ارادہ کیا ، پھولوں کے ہار جو اس کی دبی امنگوں کے ، تڑپتی ہوئی تمناؤں کے بر لانے
کے لئے اختصاص کے ساتھ شریک حال تھے ۔ اپنے ہاتھ میں لئے اور کچھ دیر تک ان کو ادھر ادھر
ہلایا ، سونگھا ۔ کبھی گلے میں ڈالا ، کبھی سر پر رکھا آخرکار نہایت متنفر ہو کر زمین پر پھینکدیا اور بولی :
ان پھولوں کو کیا ہو گیا ۔ یہ کیوں اب میری نظر میں خار ہیں ۔ نہیں نہیں میں ایسے ہار کو

ہرگز ہاتھ نہیں لگاتی جو بظاہر اچھے ہیں۔ مگر نہ ان میں خوشبو ہے نہ تازگی "۔

(۲)

شب کا منظر خاموش ہے، چاند ایک دلکش ٹھنڈی روشنی تمام اشیاء پر پھیلائے ہوئے ہے۔ صبا میں ہلکی سی تحریک ہے جو راہ میں اشجار کو جو اسکی چھیڑ چھاڑ کے نہایت مشتاق ہیں اپنی خرامِ ناز کا شکار کرتی ہے۔ تارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس منظرِ فریب ارتباط کا مشاہدہ کر رہے ہیں، غرضکہ ہوا میں فرحت ہے اور سماں نہایت دلکش۔

شکیلہ کے کمرے کی کھڑکی متحرک ہوئی اور سراتی ہوئی شمیم اپنے پہلو میں [illegible] جملہ اسباب مستور کئے داخل ہوئی، دبے دبے اس کے ریشمی آنچل کو ہٹایا، زلفِ مشکیں کو [illegible] کر کے کہدیا کہ دیکھ خموش رہنا۔ اور بس ان رشکِ گل رخساروں کو گدگداتی ہوئی اپنا مدعائے دلی اشاروں ہی اشاروں میں کہہ گئی۔ شکیلہ نے بہت ہی نابردائی سے کام لیا آنچل سے [illegible] چہرے کو چھپایا مگر شبِ ماہتاب کی روح افزا کیفیات نے اس کے پر شباب جذبات میں ایک ناقابلِ ضبط تلاطم بپا کر دیا۔ امنگوں نے محشر کا سماں دکھلایا۔ حسرتوں نے نکلنے کے لئے بڑی جد و جہد کی۔ پہلو فوراً کسی زینتِ آغوش کے لئے وا ہو گیا، اس کے دل میں ایک [illegible] اٹھی اور بے چین ہو کر کھڑکی کی طرف گئی۔ ماہ کی نرم اور ٹھنڈی شعاعیں ہر سمت مسعود [illegible] رات کے سناٹے میں فضا کی طراوت کو محسوس کیا۔ گو حیف کہ اس کو اس سے کوئی فرحت حاصل نہیں ہوئی۔ نہ معلوم کس تخیل نے اس کے نازک دماغ پر اپنا قوی تسلط کیا کہ بہت حسرت سے دیکھنے کے بعد اپنا پژمردہ چہرہ لئے ہوئے مڑ گئی اور کھڑکی کی طرف دیکھ کر کہا:—

"ہائے ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں۔ آج کی رات کس قدر طویل ہے، اے خدا یہ شب کیونکر کٹیگی۔ آنکھوں سے نیند اس طرح گئی ہے گویا کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ بارہا ارادہ کرتی ہوں کہ ذرا کمر سیدھی کروں، اگر واحد نے اپنا وعدہ ایفا نہیں کیا تو میں کیوں تکالیف سہوں، کیوں [illegible] ہوں، اگر اس کا تار غلط ہے تو اس بھیجنے والے کو خدا سمجھے، اور اگر صحیح ہے تو ممکن ہے کہ [illegible] گاڑی

چھوٹ گئی ہوگی۔ آج نہیں کل آجائیں گے مگر جب کبھی لیٹنے کے لئے جھکتی ہوں کوئی جگر میں چٹکی لیتا ہے۔ کاش کہ آج تار نہ آتا! اور میں آرام کی نیند سوتی لیکن قسمت کا نوشتہ تھا نہیں۔ اس کو آج ہی آکر مجھے بے چین کرنا تھا ؎

بے چین کرنے آیا تھا بے چین کر گیا

(۳)

" واحد! تمہارے خیر مقدم کے لئے میں نے کیا کیا سامان مہیا کئے کن کن ارمانوں نے تمہاری آمد کی دعائیں مانگیں، کس کس طرح میں نے امنگوں کو دبا دبا کر سینہ میں رکھا۔ کمرے کو آراستہ کیا ہار بنائے، وقت سے قبل ہنسی ہنسی تمہارا دروازہ پر انتظار کیا کہ کب وہ چاندسی صورت ظہور میں آئے اور میں اپنی امیدوں کو اس کے پیروں میں غرط مسرت سے لوٹتے ہوئے دیکھوں مگر افسوس ؎

وہ ساری امیدیں ملیں خاک میں

جو بدلی امڈی تھی ہوا ہو گئی !!!

واحد! میں سچ کہتی ہوں کہ اگر تم یہاں ہوتے اور میری اس پریشانی اور بیکسی کی حالت کو دیکھتے تو یقین ہے کہ تمہارے ناز پرورده دل پر غم انگیز اور رحم انگیں محسوسات کے لئے گہرے جرکے لگتے۔ مگر ہائے تم کو کیا خبر کہ تمہاری ادنیٰ کنیز، تمہاری محبت کی پیاسی شکیبہ انتظار کی تلخی سے اسقدر بے چین ہے تم کیا جانو کہ وہ اپنی جان نازک پر کیسے کیسے صدمے اٹھا کر اس شب بلا خیز کا سامنا کر رہی ہے۔ واحد! آج کی پہاڑسی رات کٹ رہی ہے مگر ذرا آکر تو دیکھو کہ کس طرح ؎

آہٹ کسی کی ہو مرا اٹھ اٹھ کے دیکھنا

یوں کٹ رہی ہے رات ترے انتظار میں

از خود رفتگی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے، تنگ آکر رونے بیٹھتی ہوں تو اس میں بھی جی نہیں لگتا۔ بار بار یہی جی چاہتا ہے کہ باہر جاؤں اور تلاش کروں عجب دیوانگی طاری ہے کہ میں کچھ چاہتی ہوں اور دل نے کئی بار سمجھایا کہ واحد کا خیال چھوڑ اور آرام کر مگر ؏ ۔

افسوس دل نہیں ہے مرے اختیار کا

شکیلہ نے کسی خاص خیال میں منہمک ہو کر گردن جھکالی اس کے چہرے سے کچھ رنج کے آثار نمایاں ہوئے اور یکایک ایک آہ کے ساتھ بڑے بڑے آنسوؤں کی جھڑی ان جادو بھری سرخ سرخ آنکھوں سے جاری ہو گئی

پھر یاد کوئی آیا آنکھوں میں بھرے آنسو

پھر دیدۂ پرنم میں طوفان نظر آتا ہے

متواتر دو گھنٹے تک اسی طرح سکوت الم میں درخشاں موتی اپنے گلنار رخساروں پر ڈھلکاتی رہی آخر کار نہیں معلوم کس چونکا دینے والے قیاس نے اس کی گردن کو حرکت دی، اس نے سامنے میز پر دیکھا اور جلتے ہوئے لیمپ پر نگاہ جمادی۔

"سب کہتے ہیں کہ سوائے چراغ کے کوئی تنہائی میں ساتھ نہیں دیتا۔ ہاں یہ سچ ہے اسی لئے تو یہ میری مانند جل رہا ہے۔ بیشک میں اس کی ہمدردی کی معترف ہوں، مگر میرے پہلو میں ایک ستایا ہوا دل ہے، میں جانتی ہوں کہ کسی کو تکلیف دینا کیا ہوتا ہے۔ نہیں نہیں میں ہرگز تجھے جلتا ہوا نہیں دیکھ سکتی، لے آ، ادھر آ تاکہ میں تجھے بجھا دوں"۔

اتنا کہکر انداز سے اٹھی اور تھوڑی دیر میں کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔

شکیلہ ٹٹولتی ہوئی پلنگ پر آئی۔ اس تاریکی نے اس کے سینے سے دل میں سراسیمگی کی مو...پیدا کی۔ اس نے دوشالہ اوڑھا اور آڑی ترچھی جس طرح تھی اسی طرح لیٹ گئی۔ اب بھی اس کی دلخراش سسکیاں کسی قدر دبی ہوئی آواز میں سنائی دے رہی تھیں۔ دیر تک یہی کیفیت رہی، ادھر گھڑی نے ٹن ٹن ۵ بجائے اور ادھر ع

نیند آہی گئی جنبش دامان سحر سے

شکیلہ نے رو رو کر شب گذاری لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ قدرت کا کیا راز تھا کہ صبح ہوتے ہوتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ مگر جس وقت اس نے نیم خوابی کی حالت میں "شکیلہ! پیاری شکیلہ" کے محبت بھرے الفاظ سنے اور اپنے سرخ و نرم لبوں پر کسی کو مہر الفت ثبت کرتے ہوئے محسوس کیا تو گھبرا کر آنکھ کھولدی

جب نظر پڑی تو اپنے سامنے اس ماہِ منور کو جس کے لئے وہ اس درجہ بیتاب تھی موجود پایا، بیخود پایا
فوراً دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھی اور بھرائی آواز میں کہا :-
"اخاہ! شبِ انتظار روزِ عید میں مبدل ہوگئی"۔
شکیلہ بغلگیر ہے اور واحد جوشِ محبت سے بیتاب، دونوں پر خاموشی قابض ہے
اور اسی خاموشی میں واحد نے شکیلہ کے درماندہ شباب میں آسودگی کی روح پھونک دی، اور
شکیلہ نے اپنے خاوند کی بے قرار محبت کا تسکین دہ استقبال کیا۔

جنگِ عناصر

(از منشی سید سلیمان صاحب آحسنؔ دہلوی)

مخالف حضرتِ انساں سے آج ان کے نگہباں ہیں
موافق تھے جو آپس میں وہ دشمن چاروں جہاں ہیں!
حسدؔ کے شعلے اٹھتے ہیں غضب میں جسم خاکی ہے!
پریشاں عقل ہے اور جان پر آفت بلا کی ہے!!
برائے دوست ہیں زر کے یگانے جان کے دشمن!
کہ گھر کے غیر دشمن اپنے ہیں ایمان کے دشمن!!
تلاطم ہے بپا مٹی کے گھر میں آگ پانی کا!!
ہوا سرکش ہے طوفانی سماں ہے بزمِ فانی کا!

(۲)

لگا ہے نفس کا دربار دربانی پہ شہوت ہے!
مشیر سلطنت غصہ۔ غضب جانِ حکومت ہے
کھڑی ہے اک طرف رشوت گذر مشکل ہے بے زر کا!
تکبر منصفِ اعلیٰ فسل ہے ؟ حقہ میں پر کا !!!
کمربستہ ہے اب کینہ چڑھا کر آستینوں کو !!!
حقیقت میں خدا ہرگز نہ دے طاقت کمینوں کو
جدھر کرتا ہے رُخ بد بیں مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے!
جو باہم دوست ہوتے ہیں انہیں میں پھوٹ پڑتی ہے!

(۳)

حکومت نفس بد کردار کی جنجال ہے جی کا !!
پڑی ہے سب کو اپنی اور سماں ہے نفسی نفسی کا!
ہوا کا زور دیکھا۔ آگ ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے!
اثر پانی کا کم اور سر دہتی ہوتی جاتی ہے!!
بظاہر صلح کے ساماں نظر آتے ہیں عالم میں!
حقیقت میں بپا ہے اک قیامت جسم آدم میں
سمندر کے کنارے بن رہا ہے گھر خیانت کا!
خدا حافظ ہے طغیانی میں بالو کی عمارت کا!

مقالات

جدید دائرۂ معارف اسلامیہ پیرس

(از محمد صدیق مسلم مالیگانوی)

گذشتہ دنوں یہ خبر حلقۂ صحافت میں نہایت سرعت کے ساتھ گشت کر رہی تھی کہ سلطانِ مراکش پیرس تشریف لے گئے ہیں، اور وہاں ان کے ہاتھوں سے پیرس کی شاندار مسجد کا افتتاح عمل میں آیا ہے۔ سچ پوچھئے تو حکومت فرانس کے ساتھ مسلمانوں کے چند ایسے تعلقات وابستہ ہیں جن کی بنا پر مذکورہ حکومت سے اس مبارک فعل کا وقوع پذیر ہونا کسی طرح غیر متوقع نہیں ہو سکتا۔

(۱) جس ملک میں مختلف بلاد اسلامیہ کے مسلم افراد کسب معاش کے لئے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر بس رہے ہوں۔

(۲) جس خطے میں افریقی۔ ترکی۔ عربی۔ ہندی۔ افغانی۔ ایرانی۔ چینی اور روسی مسلمان سیاح اکثر و بیشتر آتے رہتے ہوں۔

(۳) جس سلطنت کے مستعمرات میں اسلامی بستیوں کا بیشتر حصہ مشتمل ہو۔

(۴) اور سب سے اہم بات یہ کہ گذشتہ جنگ عظیم میں کامیاب ہونے کے لئے جس حکومت کی امداد کرنیوالی افواج قاہرہ میں سرفروش مسلمانوں کا عنصر غالب ہو۔ وہ حکومت اگر اپنے دارالسلطنت میں مسلمانوں کے لئے کوئی خدا خانہ تعمیر کرا دے تو جائے تعجب نہیں۔ بلکہ یہ امر حکومت کی ادائیگی فرض کا ایک احسن طریقہ متصور ہوگا۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے ساتھ دولت فرانس کی ایک ایسی شاندار تاریخی روایت منسوب ہے جو مندرجہ بالا تمام وجوہات پر مقدم ہے اور جس کا اعتراف کرتے ہوئے افواج فرانس کے سپہ سالار جنرل فاش نے مذکورہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھتے وقت اپنی تقریر میں بیان کیا تھا کہ:۔

"نپولین قضا کر گیا۔ لیکن اس کے خیالات و جذبات ہنوز باقی ہیں وہ اسلام سے اتحاد کا متمنی تھا اور اس کی امداد سے فائدہ اٹھانے کا آرزومند۔ پس اس مسجد کی تعمیر بھی انہیں سلسلۂ خیالات و جذبات کو عملی جامہ پہنانے کی ایک کڑی ہے"۔

اس تاریخی روایت کا لب لباب یہ ہے کہ جب نپولین نے مقام کرا پر مسلمانوں کی شمشیر خارا شگاف:

سے سخت ہزیمت اٹھائی اس نے مصر آکر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا اور اس طرح اخوت اسلامی کے ٹوٹنے والے رشتے میں منسلک ہو کر اقصائے عالم کو اپنے زیر نگیں لانے کے منصوبے گانٹھنے لگا۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر فرانس کے ارباب سیاست ایک مدت سے اس امر کا احساس اپنے دل میں پاتے تھے کہ دارالسلطنت پیرس میں ایک ایسی شاندار مسجد تعمیر کی جائے جو دنیا بھر میں اپنا جواب نہ رکھتی ہو۔ اور جس کی وجہ سے فرانسیسیوں اور افریقی مسلمانوں میں گہرے جذبات رفاقت پیدا ہو جائیں نیز وہ مسلمان جو کسب معاش یا حصول تعلیم کی غرض سے اپنے وطن سے دور فرانس میں ایسے لوگوں کے درمیان پڑے ہوئے ہیں جن کی طرز معاشرت جن کا مذہب اور جن کے رسم ورواج ان سے بالکل مختلف ہیں اپنے دل میں یہ خیال رکھیں کہ وہ بھی دولت فرانس کی شرکت کا فخر رکھتے ہیں۔ چنانچہ حکومت کی جانب سے ۵ لاکھ فرانک عطا ہوئے۔ باقی مصارف تعمیر مراکو۔ الجیریا۔ ٹیونس وغیرہ مقبوضات فرانس سے بذریعہ چندہ حاصل ہوئے۔ مجلس بلدیہ پیرس نے ایک وسیع قطعہ اراضی چڑیا گھر کے سامنے عنایت کیا فیض (مراکو) سے ماہرین فن کاریگر بلائے گئے اور ہسپانیہ کے قدیم شیران اسلام موروں کے طرز تعمیر کے نمونے پر عمارت کھڑی کرنے کا کام شروع ہوگیا۔

تقریباً چار سال کی متواتر کوشش کے بعد اس عالیشان مسجد کی تکمیل اب جاکر ہوئی ہے۔ یہ ایک ہی عمارت نہیں ہے بلکہ ایک سلسلۂ عمارات ہے جو متعدد قطعات پر ختم ہوا ہے۔ اسے "جدید دائرۂ معارف اسلامیہ" کے نام سے نامزد کیا جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مذکورہ ادارہ ایک اعلٰے درجے کے انگریزی کالج کا نمونہ نظر آئیگا۔ وسط میں مسجد ہے اس کے برابر میں پیش امام مسجد کا کمرہ ہے۔ امام مسجد مولانا عبدالرحمٰن صاحب مقرر کئے گئے ہیں۔ دوسری جانب مفتی صاحب کا مکان ہے۔ یہی مفتی صاحب ادارہ کے ناظم ہیں۔ مسجد کے سامنے پختہ فرش کا صحن ہے جس میں خوشنما فوارہ اپنے ترشحات سے شبستان کا منظر پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے اس صحن کے دوسری جانب درس تدریس یا لکچروں کے لئے ایک وسیع ہال ہے۔ اس ہال کے بالائی حصے میں اُن مسلمان لڑکوں کے لئے دارالاقامت بنے ہوئے ہیں۔ جو پیرس میں بغرض تعلیم آئیں۔ ان طلبار کی اعانت وامداد کے لئے حکومت کی طرف سے بھی کچھ نہ کچھ انتظام ہوگا۔ اس تعلیمی قطعہ سے علیحدہ ایک تجارتی قطعہ ہے

جیسے مراکشی قہوہ خانہ۔ ترکی حمام۔ شفا خانہ۔ دکانیں اور ان مسلمان معززین کے لئے مہمان خانے بنے ہوئے ہیں جو پیرس میں بغرض سیر و تفریح آئیں۔ علمی قطعہ تجارتی ہنگاموں اور شور و شر سے محفوظ رہے اس لئے اس قطعے کا رخ اوس کے عکس عام شاہراہ کی طرف رکھا گیا ہے جس سے خریدار یا اس قطعے سے تعلق رکھنے والے اصحاب مسجد و مدرسہ میں گھس کر جانے کی بجائے براہ راست دوکانوں تک پہونچ جائیں۔

ادارہ کی دیواریں سنگ خارہ کی بنی ہوئی ہیں اور چھتیں سبز رنگ سفالین کی۔ عمارت کے اوپر ایک خوبصورت مگر نازک مینار اس کی شان کو دو بالا کرتا ہے۔ اندرونی صحن کے چاروں طرف عربی وضع کے محرابوں کے دالان ہیں۔ دیواروں کے برابر چھوٹے چھوٹے چوبی خانے ہیں جنمیں نمازیوں کے جوتے محفوظ رہتے ہیں۔ فواروں کے گرد اگرد گلاب کے تختے ہیں جنہوں نے یہاں اور بہار پیدا کر دی ہے۔ الغرض یہ عمارت اپنی آس پاس کی سیلی اور بدرنگ عمارتوں میں ایک خوبصورت دلہن کی طرح معلوم ہوتی ہے جس وقت آفتاب یا مہتاب اپنی پُر تمازت اور تیز کرنیں فرش زمین پر ڈال رہا ہو اور ایسے میں کوئی سرخ ٹوپی یا عمامے والا مسلمان یہاں کھڑا دکھائی دے تو بلاشبہ الجیریا یا مراکش کے کسی بڑے شہر کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

کاش یورپ کی دیگر حکومتیں بھی اس سے سبق حاصل کریں اور اپنے حدود سلطنت میں مسلمانان عالم کی دلدہی کے اسباب فراہم کرنے کی کوشش کریں۔

نوائے ہاتف

ان کا آنا گھر میں میرے جان کا دلمیں آنا ہے
جانا ان کا گھر سے میرے جان کا دل جانا ہے

اچھا اچھا، بات نہ مانو، جاؤ، جو تمکو جانا ہے
مرنے کا سنکر میرے لیکن پھر بھی سویرا آنا ہے

کام کرو کہ نام رہے تم ہو کہ نہ ہو پر کام رہے
مدت سے نہیں مجنوں تو یہاں مجنوں کا مگر افسانہ ہے

یار ہمیں تو اپنا ہی انجام نظر اب آتا ہے
سہتے سہتے ہجر کے صدمے قبر میں اک دن جانا ہے

دیکھنا ان کا میری طرف کچھ جو نہیں کچھ ظلم نہیں
اصل جفا تو اس کا تصور دلمیں مرے بند ہو جانا ہے

اک دن آکر پاس مرے اغیار سے بولے دیکھو تو
ہاتف اس کو کون کہے گا یہ تو کوئی دیوانہ ہے

(ہاتف بھوپالی)

تحریکِ نسواں

نسائیات

(از جناب سرخوش زیدی)

کسی سوسائٹی کی ترقی کا انحصار اس سوسائٹی کے ہر فرد کی انفرادی کوشش و جد و جہد پر ہے۔ انسانی سوسائٹی میں عورتیں برابر کی شریک ہیں اس لئے تمام سوسائٹی کی ترقی کے لئے ان کی انفرادی کوشش ضروری ہے۔ دور موجودہ میں عورتیں ترقی کی خواہ کسی اعلےٰ ترین منزل پر کیوں نہ پہونچ گئی ہوں جب تک کہ وہ ان شعبہائے حیات میں ترقی کرنے کے لئے تگ و دو نہ کریں گی جنہیں قدرت نے ان کے لئے مخصوص کر دیا ہے وہ سوسائٹی کی ترقی کے لئے زیادہ مفید نہیں ہو سکتیں۔ کہا جاتا ہے کہ دول مغرب میں خواتین کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہیں اور انہوں نے ہر پہلو سے ترقی کر کے مردوں کی ہمسری کا ثبوت دیدیا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو یہ ترقی انسانی سوسائٹی میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ کیونکہ ان کی عزت و وقار۔ مساوات و ہمسری صرف مغربی دنیا تک محدود ہے ایک مشرق کا باشندہ انہیں ویسا ہی کمزور و بیچارہ سمجھتا ہے جیسا کہ اپنی خواتین کو۔ انسانی سوسائٹی میں ترقی کے یہ معنی ہیں کہ دنیا کے شمال و جنوب مشرق و مغرب کا ہر متنفس اس بات کا احساس کرنے لگے کہ عورتوں کو قدرتاً وہی مرتبہ حاصل ہے جو مردوں کو۔ اس احساس کے پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عورتیں اپنے دائرۂ عمل کے لئے صرف ان لوازمات زندگی کو منتخب کر لیں جو قدرتاً ان سے متعلق ہیں۔ مثلاً امور خانہ داری۔ تربیت اولاد۔ اور تعلیم وغیرہ تاکہ مرد اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو جائیں کہ عورتوں کا وجود ان شعبہائے حیات کے لئے اتنا ہی اہم اور ضروری ہے جتنا کہ دیگر شعبہائے حیات کے لئے خود ان کا وجود۔ لیکن اگر برخلاف اس کے وہ مساوی حقوق حاصل کرنے کے لئے وہ ذرائع اختیار کریں جو فطرتاً ان کے لئے موزوں نہیں ہیں تو کامیابی کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔ گھر کے کاموں کو چھوڑ کر انجنیرنگ ہوا بازی اور فوجی خدمات اختیار کرنے یا کونسلوں اور اسمبلیوں کی امیدواری کی کوشش کرنے سے کیا فائدہ مرتب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک میدان عمل ہے جو قدرتاً مردوں کے لئے مخصوص ہے۔ مقابلہ کی ان میں فطرتاً طاقت و قدرت نہیں۔ پھر کیونکر کامیاب ہو سکتی ہیں۔ اور ناکامی کے معنی یہ ہیں کہ وہ مردوں کی نظروں میں

ہمیشہ خوار و ذلیل رہیں۔ ہندا مساوات کی کوشش خام اور ہمسری کی سعی ناکام ثابت ہوتی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو دنیا میں عورتوں کے تنزل کا سبب بھی یہی خیال خام ہے۔ اقوام عالم میں مقابلہ کی ایک لا ختنا ہی کوشش جاری ہے۔ ایک غالب آتی ہے تو دوسری مغلوب ہوتی رہتی ہے۔ اس کشمکش میں اگرچہ صنف نازک بھی شامل ہیں لیکن جنس قوی کی جدوجہد نمایاں ہوتی ہے۔ اور جب وہ مغلوب ہو جاتی ہے تو جنس لطیف کی عزت و وقعت اور بھی گر جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی ہی قوم کی نظروں میں ذلیل معلوم ہونے لگتی ہیں۔ تواریخ عالم بتلا رہی ہے کہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ایک قوم دوسری پر غالب آتی ہے تو وہ اس کے طبقہ اناث کو اپنی ملکیت مقبوضہ تصور کرنے لگتی ہے اور اس طرح ان کے رہے سہے اقتدار میں بتدریج تنزل شروع ہوتا ہے اور نوبت یہاں تک پہونچ جاتی ہے کہ انسانی سوسائٹی میں ان کے لئے کوئی خاص جگہ باقی نہیں رہتی۔

ایک اور سبب عورتوں کے تنزل کا غلامی ہے۔ غلامی کے رواج نے جب دنیا میں ہمجنسوں کو ایک دوسرے کی نظر میں خوار و ذلیل کر دیا تو جنس مخالف کے لئے کونسی صورت باقی رہتی ہے۔ اور آج جو دنیا میں عورتوں کی پست حالت ہے اس کا بڑا سبب محض غلامی ہے۔

اس گری ہوئی حالت سے ترقی اور ایک مستقل ترقی کرنے کے لئے ضروری تھا کہ عورتیں اپنا ایک خاص دائرہ عمل طیار کرتیں جس میں مردوں کو تاب مداخلت نہ ہوتی۔ اپنی ترقی کی ایک خاص فضا بناتیں جو مردوں کے خراب کرنے سے خراب نہ ہوتی۔ تاکہ وہ اطمینان سے اپنی اہمیت و اقتدار کو دوبارہ قائم کر لیتیں اور اسے پھر مٹنے کا خوف باقی نہ رہتا۔ لیکن بجائے اس کے وہ فروعات میں الجھ پڑیں۔ غیر ضروری باتوں میں وقت صرف کرنے لگیں جو ہرگز کارآمد نہیں ہیں۔ مسلمان و ہندو عورتوں نے کہا کہ ہمیں بر (شوہر) کے انتخاب کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ امریکہ و فرانس وغیرہ کی "ترقی یافتہ" ماں بیٹیوں نے مطالبہ کیا کہ ہمیں انتخابات اور ملک کے نظام وغیرہ کے معاملات میں حصہ ملنا چاہئے۔ ان بیکار باتوں سے کیا فائدہ گھروں کی حالت دیکھئے تو ایک منٹ کو چین نہیں ہے۔ قوم کی حالت دیکھئے تو پراگندہ۔ نظام غیر منتظم شیرازہ پریشاں۔ ذہنیت کمزور۔

دماغ معطل۔ اور حوصلے پست ترقی کی کیا امید ہو سکتی ہے؟

چاہیے تو یہ تھا کہ عورتوں کو اپنی اپنی جگہ پر اندرونی معاملات کے سدھارنے اور سنبھالنے میں انہماک ہوتا تاکہ مردوں کو بیرونی حوادث کے مقابلہ کی فرصت ہوتی۔ اور وہ بچوں کی پرورش و نگہداشت۔ گھر کے انتظام و انصرام کی فکر سے آزاد ہو کر صرف قوم و ملک کی فلاح و بہبود کی دھن میں مبتلا ہوتے ایک شعبہ حیات میں عورتیں ترقی کرتیں تو دوسرے میں مرد اور قوم کا مستقبل شاندار تر ہو جاتا۔

جواہر ریزے

۱۔ زندگی ایک آئینہ ہے جس میں تبسم کرنے کی کوشش کرو۔

۲۔ خوشی کی تلاش میں دنیا کا نصف حصہ غلط راستہ پر چل رہا ہے۔

۳۔ خوف صرف امراض پیدا ہی نہیں کرتا بلکہ یہ خود بھی ایک مرض ہے۔

۴۔ اشتیاق کی محرک دوری ہے۔

۵۔ دوبارہ دھوکہ کھانے پر تم دھوکہ دینے والے کو دھوکہ باز نہیں کہہ سکتے۔

۶۔ عمر کا بیشتر حصہ آرزوؤں اور تمناؤں میں صرف ہوتا ہے۔

۷۔ ہر روز جو واقعہ پیش آتا ہے وہ کسی نہ کسی کے علم میں ضرور ہوتا ہے۔

۸۔ خوشی ایک خوشبو ہے جسے تم دوسروں میں اس وقت تک نہیں محسوس کر سکتے کہ تمہیں نہ میسر آئے۔

۹۔ سکون و مسرت حسن میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

۱۰۔ کسی کام کے کرنے میں مسرت نہیں ہے بلکہ اس کے اپسند کرنے میں ہے۔

آفتاب

(از عبدالغفور صاحب فاضل)

مُرغ زرّیں جب ہوا تو آسماں پر جلوہ گر نور کی چادر بچھاتی آ گئی ہے ہر سو سحر
روشنی سے تیری۔ روشن ہو گئے ہیں بام و در کوہ و صحرا ہیں منور ضو سے تیری سر بسر
اک جھلک سے اپنی تو نے سب کو روشن کر دیا
دہر کی تاریکیوں کو نور افگن کر دیا !!!

جب ہوا اوج فلک پر تیرے جوبن کا نکھار ظلمتِ شب سے ہویدا ہو گئی صبح بہار
اپنی کرنوں سے بڑھایا تو نے حسن لالہ زار گھاس کے ویران میداں کو بنایا مرغزار
ہے نباتات اور حیوانات پر احساں ترا
فیض کا ممنون ہے یہ عالم امکاں ترا

تو ہے وہ نور حقیقت جس سے دل معمور ہے اے سرور جاں! سینہ تجھ سے رشک طور ہے
عقل باریکی سمجھنے سے تری مجبور ہے فہم انساں تیری مخفی قوتوں سے دور ہے
تو نہ ہوتا تاریک ہو یہ خوابگاہ زندگی !
تو ہی سکھلاتا ہے ہم کو رسم و راہ زندگی

یعنی سینہ صاف رکھ کینہ سے مثل آفتاب اور حوادث کو زمانہ کے سمجھ موج سراب
دوریٔ منزل سے مت گھبرا۔ دکھا جوش شباب عزم راسخ کا بڑھا دے زندگی میں ایک باب
صبح جو آیا تھا یاں وہ شام کو غائب ہوا
حیف ہے! اعمال بد سے پر نہ تو تائب ہوا

نسائیات

انگوٹھی

(مترجمہ ریحانہ خاتون عباسی)

انگوٹھی کی ایجاد کا زمانہ تاریخ کی عمر سے زیادہ ہے۔ اس لئے یہ ٹھیک طور پر معلوم کرنا کہ یہ پہلے پہل کہاں اور کیوں کر ایجاد ہوئی قطعی غیر ممکن ہے تاہم اس بات کا سراغ برابر لگایا جا سکتا ہے کہ انگوٹھی کا استعمال ہر ملک اور ہر زمانہ میں رہا ہے۔

انگوٹھی کی ایجاد کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ یہ زیور یا آرائش کے طور پر استعمال کئے جانے کے لئے نہیں بنائی گئی تھی۔ بلکہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ ہر گھر کا مالک اپنے امتیازی نشان کے ساتھ انگوٹھیاں تیار کراتا تھا۔ اور ایک ایک ہر غلام کو پہنا دیتا تھا۔ ان غلاموں میں اس کی بیوی بھی شامل ہوتی تھی۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بیویاں بھی بحیثیت خادمہ یا لونڈی کے ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ بیوی کو انگوٹھی پہنانے کی رسم اب تک کسی نہ کسی صورت میں قائم ہے۔

تاریخ کے مختلف دور میں انگوٹھیوں کی وضع اور تراش خراش بدلتی رہی۔ زمانۂ قدیم میں انگوٹھیوں کی ساخت بالکل سادہ اور معمولی تھی۔ جو اس وقت کی صنعتی پستی کا ثبوت ہے۔

قدیم ترین انگوٹھی جو اس وقت تک محفوظ رہ سکی ہے۔ ایک سبز رنگ کی مٹی کی قسم کی چیز کی بنی ہوئی ہے جس پر کچھ علامات کندہ ہیں۔ یہ ایران سے حاصل کی گئی ہے۔ اور اس کا زمانہ تمدن مصر سے قدیم بتلایا جاتا ہے۔ مصر کے لوگ سونے کی انگوٹھیاں پہنتے تھے جن پر ان کی زبان میں کچھ لکھا ہوا ہوتا تھا۔

اسی قسم کی ایک انگوٹھی اہرام مصری میں فرعون کی قبر سے برآمد ہوئی تھی۔ ایسی ہی ایک اور انگوٹھی بھی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت یوسفؑ کو عزیز مصر ہونے کے اعزاز میں پہنائی گئی تھی۔

روم میں جبکہ وہاں کا تمدن اوج پر تھا تانبے اور سونے دونوں دھاتوں کی انگوٹھیاں استعمال کی جاتی تھیں یہاں کی دو انگوٹھیاں اسوقت بھی عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔ جن میں سے ایک پر کسی شخص کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اور دوسری اپنی وضع میں قفل کی کنجی سے مشابہ ہے۔

بعض وحشی ممالک کے باشندے انگوٹھی میں زہر رکھتے تھے جس سے وہ شکار میں مدد لیتے تھے۔ دنیا کے اکثر نامی گرامی شعرا بھی انگوٹھی پہنتے تھے۔ چنانچہ انگریزی کے مشہور شاعر ولیم شکسپیئر کی انگوٹھی اسوقت بھی موجود ہے جس پر اس کے نام کے دو حروف یعنی W.S. کندہ ہیں۔

انگوٹھیاں انعام واکرام دینے کے کام میں بھی لائی جاتی تھیں۔ چنانچہ تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ شاہان پیشین میں سے بہتیروں نے اپنے مصاحبوں اور درباریوں کو خوش ہوکر انعام میں انگوٹھیاں دی ہیں۔

بعض انگوٹھیوں کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ ملکۂ فوسطینہ نے ایک انگوٹھی کی قیمت چالیس ہزار پونڈ ادا کی اور ملکہ دوسیطیہ نے ایک انگوٹھی ساٹھ ہزار پونڈ کو خریدی۔

غزل

(از جناب عبدالرزاق صاحب عبدؔ)

مقابل اک دفعہ گر وہ بت عیار ہو جاتا
یقیں ہے راستبازی پر فلک تیار ہو جاتا

اٹھائیں سختیاں راہ طلب میں کسقدر ہم نے
کہ ذرہ راہ میں آتا تو اک دیوار ہو جاتا

دوائے درد پنہاں کیطرف گر ملتفت ہوتا
عجب کیا ابن مریم بھی ترا بیمار ہو جاتا

نتیجہ کشمکشہائے محبت کا یہی ہوتا
کوئی جیتا تو کوئی جان سے بیزار ہو جاتا

بڑھاتے عبدؔ اپنے داغہائے دل کی تابانی
جمال یار کا نظارہ گر یکبار ہو جاتا

انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے

(از جناب خواجہ غلام الحسنین صاحب مترجم فلسفہ تعلیم ہربرٹ سپنسر)

آدمی را آدمیت لازم است + ورنہ جاں در کالبد دارد حمار

۱ — اگر انسان اور حیوان کی حالت پر ایک نظر ڈالیں تو ان میں سے بہت سی باتیں یکساں نظر آتی ہیں۔ انسان آنکھوں سے دیکھتے ہیں کانوں سے سنتے ہیں۔ زبان سے چکھتے ہیں ناک سے سونگھتے ہیں بھوک لگتی ہے تو کھاتے ہیں پیاس لگتی ہے تو پانی پیتے ہیں۔ نیند آتی ہے تو سو رہتے ہیں۔ گائے بھینس بکری بھیڑ کتا۔ بلی وغیرہ حیوانات بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور ان کے ساتھ بھی اس قسم کی ضرورتیں لگی ہوئی ہیں مگر باوجود ان تمام باتوں کے پھر بھی دونوں میں بڑا فرق ہے جس کو ہم مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

۲ — ہم جانتے ہیں کہ انسان اور حیوان میں عقل کا فرق ہے۔ یعنی انسان عقل رکھتا ہے اور حیوانات عقل نہیں رکھتے تاہم ان میں ایک قسم کی سمجھ بوجھ ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے تمام کام انجام دیتے ہیں۔ اس کو عقل حیوانی کہتے ہیں۔ عقل انسانی اور عقل حیوانی میں کیا فرق ہے؟ اس مطلب کو بخوبی ذہن نشین کرنے کے لئے ہم ادنے درجے کے انسانوں کو لیتے ہیں جو جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں اگر ان وحشی انسانوں اور حیوانوں کی حالت کا مقابلہ کیا جائے تو ان کی عقلوں میں کئی قسم کا فرق صاف نظر آتا ہے۔

۳ — پہلا فرق تو یہ ہے کہ انسان اپنی عقل خداداد کی بدولت اوزار بنا کر ان سے کام لیتا ہے مگر حیوانوں کو یہ عقل نہیں دی گئی کہ اوزار بنا سکیں یا ان سے کام لے سکیں وحشی آدمی اپنی بود و باش اپنے آرام و آسائش اور اپنی خوراک کی حفاظت کے لئے مکان بناتے ہیں حیوان بھی ایسا کرتے ہیں بعض چوپائے زمین کے نیچے بھٹ بناتے ہیں۔ پرندے درختوں پر گھونسلے بناتے ہیں چیونٹیاں ننھے ننھے بل کھودتی ہیں شہد کی مکھیاں چھتہ بناتی ہیں انسان اوزار کے بغیر ایک جھونپڑی بھی نہیں بنا سکتا جھونپڑی کے لئے لکڑی کی ضرورت ہے اور لکڑی بھی کلہاڑی بغیر نہیں کاٹ سکتے مگر جانور اپنا بھٹ یا بل یا گھونسلا یا چھتہ بنانے کے لئے اوزار کے محتاج

نہیں ہیں ۔ قدرت نے جو اعضا ان کو دئے ہیں ان ہی کی مدد سے اپنی سب ضرورتیں پوری کر لیتے ہیں۔ انسان کی خوراک اور لباس کی ضرورتیں زراعت کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں اس کے لئے بھی بہت سے اوزاروں کی ضرورت ہے ۔ زمین کو کھودنے اور اس کی مٹی کو پلٹنے کے لئے ہل یا بیلچہ ضرور ہونا چاہئے اور جب فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے تو اس کو کاٹنے کے لئے درانتی درکار ہوتی ہے ، مگر حیوان کو اپنی اور اپنے بچوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کسی اوزار کی ضرورت نہیں ہوتی ۔

۴ ۔ انسان عموماً اپنے کاموں میں غلطیاں کرتا ہے ۔ حیوانات کوئی غلطی نہیں کرتے کبھی تم نے دیکھا یا سنا ہے کہ شہد کی مکھیوں نے بے ڈھنگا چھتہ یا بیڈول خانے بنائے ہوں یا چھتہ بنانے میں ان کے باہم اختلاف رائے ہوا ہو اس کے سوا حیوانات بہت اچھے طبیب بھی ہیں ۔ بعض جانور جب بیمار پڑتے ہیں تو خود اپنا علاج کر لیتے ہیں اور اسی جڑی بوٹی کو جو ان کے مرض کی خاص دوا ہے اور جس کو وہ خوراک کے طور پر استعمال نہیں کرتے تلاش کر لیتے ہیں اور اس کو کھا کر تندرست ہو جاتے ہیں مگر انسان کی حالت یہ ہے کہ ایک طبی کالج کے تمام ڈاکٹروں کو کسی جڑی بوٹی کے خواص پر بحث کرتے کرتے سو برس گذر جائیں اور پھر بھی ممکن ہے کہ وہ ایک نتیجہ پر نہ پہونچ سکیں انسان کو ہر کام میں کچھ نہ کچھ پریشانی اور دقت اٹھانی پڑتی ہے بہت سے تجربے کرنے پڑتے ہیں تب کہیں اس کا کام کسی حد تک مکمل ہوتا ہے دور کیوں جائیں ہمارے گھر کے معمولی کام بھی اچھی طرح پورے نہیں ہو سکتے جبتک کہ تھوڑا بہت تجربہ نہ ہو حقیقت یہ ہے کہ اپنی غلطیوں کی اصلاح یا اپنے کاموں کی تکمیل کرتے کرتے انسان کی تقریباً نصف عمر صرف ہو جاتی ہے تب کہیں اس کو اپنے تجربوں سے فائدہ اٹھانے یا دوسروں کو فائدہ پہونچانے کا موقع حاصل ہوتا ہے ۔

۵ ۔ حیوانات کوئی ترقی نہیں کرتے شہد کی مکھیاں جب سے دنیا میں پیدا ہوئیں ایک خاص قسم کا چھتہ بناتی چلی آتی ہیں بیا شروع ہی سے جیسا گھونسلا بناتا تھا اب بھی ویسا ہی بناتا ہے مگر انسان کا علم و ہنر آئے دن ترقی پر رہتا ہے اور اس کی کامیابی روز بروز ترقی پر ہے ۔

یہ دورہ ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا ✢ جو آج اک کام ہے اعلیٰ تو کل ہے اس سے اعلیٰ تر

حیوان اپنے تمام کاموں کو اپنی فطرت یا عقل حیوانی سے پورا کرتے ہیں اور ان کے کام جہاں تک ان کی ضرورت

ہوتی ہے مکمل اور باقاعدہ ہوتے ہیں مگر انسان کو خدا نے اپنے کاموں کو سوچنے اور ان پر بحث کرنے کا مادہ عطا کیا ہے جس سے اپنی غلطی کی اصلاح کر سکتا ہے اور اپنے کام میں برابر ترقی کرتا رہتا ہے ۔

۶ ۔ انسان سے پہلے کرۂ زمین پر حیوان ہی حیوان ہو رہتے تھے حیوانات میں بندر ہی ایک جانور ہے جو انسان سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے مگر یہ مشابہت فقط ظاہری صورت میں ہے عقل کے لحاظ سے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بندر کسی سخت چھل یا دام یا اخروٹ وغیرہ کو توڑ کر اس کا مغز یا گری نکال کر کھاتے ہیں ۔ (۲) درختوں پر چڑھ سکتے ہیں (۳) درختوں پر جھولتے ہیں (۴) جھولتے جھولتے ایک شاخ سے دوسری اور دوسری سے تیسری کو پکڑ لیتے ہیں اور اس طرح درخت کی چوٹی تک پہونچ جاتے ہیں (۵) گرمی سردی سے بچنے کے لئے پناہ ڈھونڈتے ہیں (۶) اپنے بچوں کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتے ہیں وغیرہ یہ وہ کام ہیں جن کو یہ جانور ہمیشہ سے کرتے چلے آئے ہیں ۔ اور جنمیں کسی قسم کی ترقی نہیں پائی جاتی ۔

۷ ۔ یہ تو حیوانات کی حالت ہے اب اگر انسان کے کاموں پر ایک نظر ڈالیں تو کیا کچھ ترقی نظر آتی ہے یہی انگریز جو آج بڑے مہذب اور تعلیم یافتہ سمجھے جاتے ہیں تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے آباو اجداد وحشی تھے دو ہزار برس پہلے یہ لوگ جانوروں کی کھال پہنتے تھے غاروں میں یا جہاں کہیں ٹھکانا مل جاتا تھا پڑ رہتے تھے خوبصورتی کے خیال سے اپنے بدن کو رنگ لیتے تھے مگر اب دیکھو کیا عمدہ لباس پہنتے ہیں اچھے اچھے مکانات میں رہتے ہیں ۔ جنمیں ہر قسم کا آرام ملتا ہے اب وہ لکھ پڑھ سکتے ہیں تحصیل علم کے لئے ان کو ہر قسم کی سہولتیں ہیں ۔ سفر کے لئے موٹر ریل گاڑی ۔ دخانی جہاز ہوائی جہاز تک موجود ہیں غرض ہر کام میں ترقی نظر آتی ہے ۔

۸ ۔ جنگل میں ایک قسم کا بندر ہوتا ہے جس کو بن مانس کہتے ہیں یہ دوسرے بندروں کی نسبت صورت شکل میں آدمی سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے ۔ جب کوئی مسافر سردی کے موسم میں جنگل میں آگ جلا کر چھوڑ دیتا ہے تو وہ سردی سے بچنے کے لئے آگ کے پاس چلا آتا ہے اور اس کی گرمی محسوس کر کے بہت خوش ہوتا ہے اور جب آگ بالکل بجھ جاتی ہے تو اٹھ کر چلا جاتا ہے مگر اس میں اتنی عقل نہیں کہ آگ پر ایندھن ڈال کر اس کو روشن کر دے اگرچہ اس نے مسافروں کو صدہا مرتبہ ایسا کرتے دیکھا ہوگا ۔ الغرض کسی ہوشیار سے ہوشیار جانور کو کھانا پکانا کپڑا سینا یا انسان کے خاص کاموں کو انجام دینا تو درکنار آگ سلگانی بھی نہیں آتی ۔ اگر تمام

دنیا کے انسان کوشش کریں تو بھی کسی حیوان کو لکھنا پڑھنا نہیں سکھا سکتے ۔ طوطا مینا آدمی کے باتوں کی کچھ کچھ نقل کر سکتے ہیں مگر کسی لفظ کا مطلب نہیں سمجھتے ۔ سچ کہا ہے " لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا "

۹ ۔ اب تک جو فرق انسان اور حیوان میں بتایا گیا ہے اس سے کہیں بڑھکر ایک اور فرق ہے وہ یہ کہ ہم میں ایک روح ہے یعنی روح اخلاقی جو حیوانوں میں نہیں پائی جاتی یا اسی روح کا فیض ہے کہ ہم نیکی بدی میں تمیز کرتے ہیں مثلاً اس بات کو سمجھتے ہیں کہ راست گوئی دیانت داری پرہیزگاری وغیرہ نیک خصلتیں اور جو لوگ اس تمیز کو کھو بیٹھے ہیں اور نیکی کی طرف سے غافل ۔ بدی کی جانب مائل ہو جاتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں صرف کھانے پینے اور عیش اُڑانے کے آئے ہیں ایسے لوگ انسانیت کے درجے سے گر جاتے ہیں وہ صورت میں انسان مگر سیرت میں حیوان بلکہ حیوان سے بھی گئے گزرے ہمارا فرض ہے کہ اس انسانی جوہر کی حفاظت کریں اور اس کو جلا دیکر اور زیادہ چمکائیں نہ یہ کہ اس کو ضائع کرکے حیوان نہ بنجائیں ۔

۱۰ ۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے

(۱) بہت سی باتیں انسان اور حیوان میں مشترک ہیں جیسے کھانا پینا وغیرہ ۔

(۲) انسان اور حیوان میں عقل کا فرق ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اوزار بنا کر ان سے کام لیتا ہے (ب) حیوان ایسا نہیں کرتے ۔

(ج) حیوان اپنے کاموں میں کوئی غلطی نہیں کرتے انسان غلطی بھی کرتا ہے ۔

حیوانات کی ترقی محدود ہے مگر انسانی ترقی کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی ۔

(۳) بندر اور انسان میں صرف ظاہری مشابہت ہے عقل کے لحاظ سے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے

(۴) انسان میں عقل اخلاقی ہے جس کی وجہ سے نیک و بد کو سمجھتا ہے حیوان میں یہ عقل نہیں ۔

شیخ فاضل کی نمک حرامی

(مترجمہ محمد سلیم الحق حقی دہلوی بی اے۔ علیگ)

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۴)

ایک ہفتہ بعد شیخ سامیح ترکی کے پایۂ تخت میں جا پہنچا۔ اس نے حجاز کے نائب سلطنت سے بہت دیر تک باتیں کیں، اور کئی دن تک گفتگو کا نتیجہ برآمد ہونے کا منتظر رہا۔ اہم کاغذات مکہ شریف بھیجے گئے تھے، اور شیخ فاضل کو جو ایک بااثر قریشی سردار تھا قسطنطنیہ آنا پڑا۔ حضور سلطان المعظم نے اسے شرف باریابی عطا فرمایا۔ اور یہ بھی ارادہ ظاہر فرمایا کہ عنقریب اسے وہ عہدہ اور مرتبہ عنایات فرمائیں گے جسکا وہ بچپن سے ہی شائق اور آرزو مند تھا۔ اور یہ کہ اسی غرض سے بہت جلد ایک شاندار دربار منعقد کیا جائیگا۔ عثمانیہ دارالسلطنت کے ہر گلی کوچہ میں مشرق و مغرب کے لاتعداد تماشائیوں کا اژدحام ہوا۔ پیرا کی وسیع و کشادہ سڑک اور شیفتش بازار میں ہلالی پرچم صبح کی ہلکی اور ٹھنڈی ہوایں لہرانے لگے۔ ان راستوں اور نواح کے تمام قہوہ خانوں اور تفریح گاہوں میں صدہا آوازوں کے سبب کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یہ تمام مجمع ایک عجیب اور مخلوط مجمع تھا۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ اس لیونٹینی شہر میں جو یورپ اور ایشیا کی ملکہ کے نام سے مشہور اور عربستان کے ریتیلے جنگل سے میلوں بلکہ کوسوں دور ہے، نہ صرف فلسطین و شام بلکہ یمن اور حجاز جیسے دور دراز ملکوں کے عرب باشندے بھی اس کیف آگین تماشہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آج کا جمعہ وہ مبارک دن تھا جب دن ایک ہی جسم کے دونوں بازو، ایک ہی سلطنت کے دو مقتدر قبائل یعنی ترک و عرب ایکدوسرے سے مصافحت و مفاہمت کرنے والے تھے۔ آج ہی شیخ فاضل کے آقائے ولی نعمت حضور سلطان المعظم نے اپنے دست مبارک سے شیخ کو خلعت فاخرہ اور لقب امیری عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا تھا۔ بلاشبہ شیخ موصوف ان تمام مفتخر رسومات کا جائز طور پر مستحق تھا جو حضور خلیفہ

ابین نے آج ادا ہونی منظور فرمائی تھیں۔ باوجود صحت اچھی نہ ہونے اور اپنی کبرسنی کے شیخ فاضل نے
دور دراز سے صعوبت سفر گوارا کی تھی تاکہ خاص سلطان المعظم کے مبارک ہاتھوں سے اپنے معزز
عہدہ کا خلعت حاصل کرے اور ان ہی کے بہہائے مبارک سے خیر و برکت کے تبرک کلمے سنے
ان دنوں سے قسطنطنیہ میں مقیم تھا اور متعدد سرکاری عہدہ داروں اور مشہور رہنمایان قوم سے کئی
پر ریزتمہ اس تکلیف دہ ادق مسئلہ عرب کے حل وعقد کی بابت گفتگو کر چکا تھا۔ تاکہ اس
مسئلہ کی عقدہ کشائی کے ساتھ ساتھ وہ غیر ملکی ریشہ دوانیوں اور فتنہ انگیزیوں کا بہترین انسداد
بھی دریافت کر سکے۔ کیونکہ درحقیقت غیر ملکی مفسدہ پردازہی یہ ادق مسئلہ پیش کرنے کے بانی
تھے۔ وہ نہایت واضح اور صاف الفاظ میں اپنے اصلی خیالات ظاہر کر چکا تھا۔ اور اس کے
سلطان المعظم کی وفاداری عزت و ناموس اسلام کی برقراری اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا
کرنے کے حتمی حلفیہ وعدوں نے اسے ہر شخص کی نگاہوں میں اور بھی زیادہ عزیز کر دیا تھا۔ طرفہ
یہ ہوا کہ اپنے آقائے ولی نعمت کے ساتھ اپنا حسن عقیدت و وفاداری دکھانے کی غرض سے
شیخ فاضل نے اپنے دو بیٹوں کو بھی سلطانیہ دار العلوم میں داخل کر دیا۔

ایک مخصوص کشتی بان اسے جائے قیام سے محل سلطانی لانے کے لئے بھیجا گیا
سلطان ملک سے نہایت شاندار جلوس اس دن کی رسومات میں شرکت کرنے کی غرض سے نکلا۔
دار الخلافہ کی عرب پلٹن دو رویہ استادہ کی گئی۔ اور حمیدیہ لانسرز کی ایک رجمنٹ سلطان المعظم اور
امیر فاضل کے جلو میں ہمرکاب ہوئی۔ جمعہ سے فراغت پا کر سلطان المعظم نے امیر موصوف کے اعزاز میں
دربار منعقد فرمایا۔ اور اشک آلود نگاہوں اور بھرائی ہوئی آواز میں امیر فاضل نے اپنے آقائے
نامدار کجکلاہ ترکی کے دست مبارک کو بوسہ دیا اور خدائے وحدہٗ لاشریک کو شاہد بنا کر اقرار معتبر
کیا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ شہنشاہ مکرم کا وفادار خادم بنا رہیگا۔ رسومات متعلقہ ختم ہو جانے پر وہ پھر ساحل
سمندر پر لایا گیا جہاں بینڈ باجوں، ہجوم عام اور فوجی سلامی کے شور و غل میں یہ معزز و معتمد امیر خلعت
فاخرات سے لدا پھندا پھر کشتی میں سوار ہوا۔ اور حیدر پاشا کی طرف جو قسطنطنیہ میں عرب لوے

کا آخری اسٹیشن تھا' راہی ہوا۔

امیر مذکور کا سفر درحقیقت شاہی سفر کے مشابہ تھا۔ سارے راستہ جگہ جگہ اس کی عزت کی گئی اور اعزازی دعوتیں ہوئیں۔ اور خود اس نے بھی نہایت کوشش کی کہ اپنے ذاتی اعزاز و وقار میں معتدبہ اضافہ کر لے۔ جناب دمشق اور یروشلم کے "معاونین اعراب" حضرات نے نہایت جوش و خروش سے اس کا خیر مقدم کیا اور امیر مذکور کی خواہش خودستائی و خود نمائی کو نہایت خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ یہ سب امیر مذکور کی اس کمزوری سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ جو چیز ان کے مقاصد کے استحکام و استواری کا باعث ہو اس سے بسرعت ممکنہ فائدہ اٹھائیں سابق، ضعیف العمر امیر اور گورنر جنرل حجاز رطب پاشا نامی ہر چند کو تخت حکومت سے معزول کر دیا گیا تھا اور چونکہ شیخ فاضل خاص سلطان المعظم کا نامبردہ اور آوردہ تھا۔ اس لئے ان "معاونین" نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے میں بہت عجلت سے کام لیا۔

شیخ صالح جو "پان عرب" کانفرنس میں قریشیوں کا نمائندہ بنکر گیا تھا ترکی وزراء کی نگاہوں میں ایک معزز و ممتاز ہستی رکھتا تھا۔ اور پیرس کے جلسہ کی تفصیلی روئداد سنا دینے کے بعد تو وہ ترکی وزارت کا معتمد علیہ بھی ہو گیا تھا۔ یہ شیخ صالح ہی کی صلاح تھی کہ فاضل کو ترکی کے پایۂ تخت میں بلایا جائے۔ چنانچہ فاضل کو خلعت فاخرہ اور امیری کا لقب دیا جانا سب شیخ صالح کے مشورہ سے پایۂ اتمام کو پہنچا تھا۔ شیخ موصوف اور امیر فاضل نے بیحد عیاری اور ہوشیاری سے اپنا کام انجام دیا۔ اور اس طرح حکام بالا کی رضامندی و خوشنودی حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گئے کیونکہ ان کی تجاویز کی مکمل کامیابی کے لئے یہ خوشنودی حاصل کرنا ہی از بس ضروری تھا۔

حریص و طامع امیر فاضل نے اب بدو سرداروں کی عقیدتمندی اور وفاداری حاصل کرنے کی فکر کی۔ اس نے مقامی حکام کی ان کوششوں کی کہ حکومت کو ایک ہی مرکز پر قائم کر لیا جائے بہت تحقیر و تذلیل کی اور سلطان المعظم سے اپنی دوامی 'غیر متزلزل' وفاداری کا ببانگ دہل اعلان کر کے اپنے آپ کو ہر ایک نکتہ چینی اور عیب جوئی سے محفوظ کر لیا۔ نئے دور حکومت نے اپنے

پروگرام میں حجاز ریلوے کو مکہ مدینہ تک بڑھانے کے سوال کو خاص اہمیت دی تھی۔ مگر اب امیر مذکور اپنے اصلی رنگ و روپ میں نظر آنے لگا تھا۔ اور جوں جوں وہ حکومت اور اس کے علمبردار یعنی "انجمن اتحاد و ترقی" کی مخالفت زیادہ شدومد سے کرتا جاتا تھا اسیقدر زیادہ وہ سلطان المعظم کی ذات ستودہ صفات کے ساتھ اپنے حسن عقیدت اور اظہار وفاداری میں جدت اور کاوش سے کام لیتا جاتا تھا۔

تقریب کی حکومتیں جو عربستان کے مستقبل سے دلچسپی رکھتی تھیں "مسئلہ عرب" میں عملی دلچسپی بھی لینے لگیں اور امیر فاضل کو خفیہ طور پر ہمت دلانے لگیں کہ وہ اپنی مسند پر استقلال سے قائم رہے امیر از خود اس جال میں پھنسنے کا شائق تھا۔ اور اس نے آزادانہ طور پر ان سیاسی مفتشوں (بھیدیوں) سے گفت و شنید کی۔ جنگ عظیم سے ایک سال قبل "روسی مسلمانوں" کی ایک مختصر جماعت حج کی غرض سے مکہ شریف حاضر ہوئی۔ یہ لوگ زیادہ تر یکجا ہی رہتے تھے اور اپنی غلط سلط ترکی میں بہت کم کسی اجنبی سے بات چیت کرتے تھے۔ یہ "زائرین بیت اللہ" امیر موصوف کے مہمان تھے۔ اور وہی ان کے تمام اخراجات کا کفیل تھا۔ اپنے قلیل یکہفتہ قیام مکہ معظمہ کے دوران میں انھوں نے امیر مذکور اور قبیلہ قریش کے تمام معزز افراد سے پوشیدہ طور پر کچھ گفتگو کی جیمس فرانسیسی نومسلم محمد عبداللہ جو مگادر سٹر کی "تعاون اعراب" کانفرنس کا معتمد و برگزیدہ حامی تھا۔ ان زائرین کا عرض بیگی بنا۔ یہ شخص تاجروں کا سا لباس پہنے اور خاص معقول شریفانہ ڈاڑھی رکھے ہوئے تھا۔ محکمہ خارجہ کمیشن کے تین ممبر بھی اس کے ساتھ تھے اور یہ سب ایک خفیہ کانفرنس کی شکل میں حسب قرارداد سابقہ امیر فاضل کے دولتکدہ پر جمع ہوئے اس موقعہ پر خاص طور سے امیر مذکور کے دونوں بیٹے بھی مدعو کئے گئے تھے اور سب کے جمع ہو جانے پر عبداللہ نے اسطرح گفتگو کا آغاز کیا :۔

"جمہوریت فرانس اس بات پر آمادہ ہے کہ جناب امیر کو اپنی تمام خواہشات پورا کرنے میں ہر طرح کی مدد بہم پہنچائے بشرطیکہ آنجناب بھی سلطنت ترکی کی از سر نو ترمیم و تنسیخ کے موقعہ پر جمہوریت کے ساتھ بھلائی کرنے پر تیار ہوں۔ جمہوریت ان قدیم تاریخی حقوق و اختیارات سے بے خبر نہیں ہے۔ جو امیر صاحب کے

خاندان کو ایک مدت سے حاصل ہیں۔ اور اس لئے جمہوریت اس بارہ میں معقول و مناسب تجاویز پر غور کرنے کو تیار ہے؟

عبداللہ نے خاموشی اختیار کی اور سردار مذکور کے بڑے بیٹے کی طرف نظر اٹھائی۔ شیخ حسن ایک نوعمر تعلیمیافتہ شخص تھا۔ اور حال ہی میں شاہی فوج میں معزز عہدہ پر سرفراز ہو کر دارالخلافہ میں بہت سے ذاتی تجربات و مشاہدات سے بہرہ مند ہو چکا تھا اسے معلوم تھا کہ اس کے والد (امیر فاضل) کی پالیسی (مصلحت ملکی) کے سبب سلطنت ترکی کے سیاسی حلقوں میں بتدریج بے چینی پھیل رہی ہے اور چونکہ یہ لڑکا خاصا ذہین و طبّاع تھا۔ وہ انجمن کی تجاویز کا پہلے ہی سے تدارک کر لینا چاہتا تھا۔ وہ غیر ملکی دول سے فوراً بلا تامل مصالحت کر لینے کا حامی تھا۔ کہنے لگا کہ:۔

" امیر ایک خود مختار رئیس ہے اور بطور خود دیگر ممالک سے اپنے علاقہ کی بہبودی و مفاد کی خاطر بلاشبہ رشتۂ اتحاد و مصالحت قائم کرنے کا مجاز ہے۔ گورنر جنرل حجاز ایک تنخواہ دار افسر و ملازم ہے۔ لیکن میرے والد (امیر صاحب) ایک موروثی حکومت کے مالک و مختار ہیں۔ اور بلاشبہ وہ حق رکھتے ہیں کہ بطور خود تجاویز پیش اور قبول کر لیں" حسن خاموش ہو گیا۔ اور اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہنے لگا " فی الوقت ہمیں زیادہ شدید ضرورت روپیہ کی ہے اور ایک دفعہ اگر ملک میں نظم و نسق قائم ہو گیا تو ہم مالی حالت کا درست کر لینا کوئی بڑی بات نہیں"

عبداللہ مارے خوشی کے جامہ میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ اس نے فرط مسرت سے شیخ حسن کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور بہ اصرار کہنے لگا کہ جمہوریت نہ صرف روپیہ فراہم کرنے پر ہی آمادہ ہے بلکہ حسب ضرورت آلات حرب بھی مہیا کر دے گی۔ اس نے بتایا کہ صلحنامہ مرتب ہو چکا ہے اور صرف دستخط کرنے کی دیر ہے۔ ورنہ ہر طرح مکمل ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک زرد چرمی تھیلی میں سے ایک رعب آفریں کاغذ نکال کر دکھایا۔ کمرہ کے دروازے کھول دئے گئے اور حاضرین نے اس مصالحت کے تحریری شواہد و نظائر کا تبادلہ کیا۔ اس مناظرہ (مکالمہ) کے خاتمہ پر امیر فاضل نے پان عرب کانفرنس کے ان دونوں نمائندوں کو جن کے نام شیخ صالح

نے تجویز کئے تھے عبداللہ کے توسل سے کہ سفلہ آنے کی دعوت دی کہ انھوں نے کانفرنس میں مسلمان کے
مطلے ہونے کی صورت میں مشہور عرب قبائل کے مقتدر افراد کے حقوق و اختیارات پر خاص زور دیا تھا۔
امیر مذکور نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ ہموطن عرب پرستوں اور دوست باغی حکومتوں کے نمائندوں سے
دوستانہ تعلقات قائم رکھیگا۔ امیر فاضل کا لڑکا شیخ حسن اب اپنے باپ کا مؤقر ایجنٹ بنگیا
تاکہ معاہدین اعراب کی تمام تجاویز کو فروغ دے۔ اس نے عربوں کے جائز حقوق کی معاونت میں
تمام ملک میں دورہ کرکے بدو عربوں کے جذبات کو برانگیختہ کیا اور اسی غرض سے وہ قاہرہ تک پہنچا۔
جہاں وہ بعض نہایت موقر و مفتخر افراد سے ملاقی ہوا اور ان سے دیر دیر تک عربوں کے حقوق کے
تصفیہ کے بارہ میں طول طویل مباحثے کرتا رہا۔

یہ تمام کارروائیاں گو خفیہ طور پر انجام پا رہی تھیں تاہم مرکزی حکومت کے معزز افسر
ان سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ شیخ حسن کو پایۂ تخت طلب کیا گیا اور شاہی گارڈ میں اسے متعلقہ
کمیشن دیدی گئی۔ اس کے کئی مہینے بعد جنگ چھڑ گئی۔ اور حسب عام تجاویز کے مطابق "وفادار" امیر
فاضل نے ایلچی بھیجنے اور بلانے شروع کئے۔ اور گو اس کے آقائے ولی نعمت خلیفۃ المسلمین نے ابھی تک کسی
کی طرفداری کا ارادہ ظاہر نہ کیا تھا تاہم اس "وفادار خادم اسلام" نے بطور خود جانبداری برتنی شروع
کر دی تھی۔

(۳)

جب ترکوں نے مستقلاً دول وسطی کا ساتھ دینے کا تصفیہ کر لیا تو امیر فاضل کے بڑے
بیٹے شیخ حسن کو حکم ملا کہ وہ شامی فوج کے ساتھ لام پر جائے حسن میں فوجی احکامات کی حکم عدولی کی تاب
نہ تھی لہذا چار و ناچار بادلِ ناخواستہ اسے قائد اعظم جنرل جمیل پاشا کے ماتحت جنوبی محاذ پر جانا پڑا
اس فوج کا مستقر شہر دمشق قرار پایا جہاں ساعت بساعت صورت حالات بدلتی رہتی تھی اور لمحہ لمحہ
عجیب و متضاد خبروں کا تانا بندھا رہتا تھا۔ اگر ایک دن مکہ معظمہ میں بغاوت ہو جانے کی خبر ملتی
تو دوسرے دن ایک اثر ذی اقتدار شیخ اپنی ساری فوج ہمراہ لیکر ترکوں کے ساتھ آکر شریک جنگ

ہو جاتا۔ بالآخر جب کئی ہفتے گذر گئے۔ اور مدینہ طیبہ والی قلعہ بند فوج کا کوئی ارادہ معلوم ہوا تو مجبوراً جمیل پاشا نے شیخ حسن کو حضوری میں طلب کیا اور کہا:۔

" شامی مہم کو مقرر پر یورش کرنی ضروری ہے اور جس امدادی عرب فوج کا تم نے اور تمہارے والد ماجد جناب امیر نے وعدہ کیا ہے فوراً یہاں پہنچ جانی چاہئے۔ تاکہ جارحانہ کارروائی فوراً شروع کیجائے۔ فوجی محکمہ جاسوسی کو وہ اطلاعات مل چکی ہیں کہ جن سے حجازیوں کے اصلی عزم و ارادہ کی بابت کوئی شک وشبہہ باقی نہیں رہتا۔ تم جنرل اسٹاف (عملہ) کے اعلیٰ رکن اور اس فوج کے خاص سیاسی افسر ہو۔ اس لئے تمہارا فرض ہے کہ کارپردازانِ مہم کو صعوبت انتظار سے جلد نجات دلوادو"۔

میجر حسن ۔۔ خدا کی قسم! جنرل صاحب! نہ میرے والد اور نہ میرے خاندان کا کوئی اور معزز شیخ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ سلطان المعظم کی حکومت کے خلاف کسی قسم کی بدعہدی یا دغابازی سے کام لے میں نے عرب بدوؤں کے جذبات برانگیختہ کرنے میں حاشا وکلا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ (کوئی بات اٹھا نہیں رکھی) لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے حکومت سے اپنی ذاتی کاوش اور اختلافات کا تصفیہ بڑے غلط موقعہ پر کرنا چاہا ہے۔ آپ بعض قبائل کی غداری کا اشارہ فرماتے ہیں۔ اس کے متعلق میں صرف اسقدر عرض کرونگا کہ مجھے ایک دستہ فوج عنایت فرمادی جائے تو میں ان کے سر پر چڑھ جانے اور ان سے ان کے ارادات وعزائم کی تشریح طلب کرکے لانے کے لئے بسر وچشم حاضر ہوں"۔

جنرل مذکور نے یہ معقول جواب سنکر چند لمحے غور کیا اور اگلے دن اسبات کا قطعی جواب دینے کا اقرار کرکے میجر حسن کو رخصت کیا۔

شیخ حسن اپنی تجویز کے اسقدر سہولت سے کامیاب ہو جانے پر دل ہی دل میں خوش ہوتا شام کے قریب اپنے خیمہ میں واپس پہنچا۔ اسی وقت ایک ایلچی فلسطین سے اس سے ملنے آیا۔ فوجی جاسوسوں کو اس بات کی پہلے ہی سے خبر مل گئی تھی اور وہ جنرل جمیل پاشا کو بھی اس کی اطلاع کر چکے تھے۔ حکام نے

میجر حسن کے رخصت سے واپس ہونے کے بعد برابر اسپر نگرانی شروع کر دی تھی اور کیمپ میں اس کی تمام حرکات و سکنات سختی سے نگاہ میں رکھی جاتی تھیں۔ شیخ حسن بھی اس بات سے واقف تھا۔ چنانچہ پیشتر اس کے کہ حکام ہی اس سے استفسار کریں وہ خود نوزار وایلچی کو ہمراہ لیکر جنرل مذکور کے خیمہ پر پہنچا۔ اور اپنے آنے کی اطلاع کرائی۔ اس کا آنا غیر متوقع نہ تھا۔ اس لئے اسے فوراً اندر بلا لیا گیا۔ اور یہ گفتگو شروع ہوئی:-

حسن۔ حضور یہ بدو وادی السوس سے آیا ہے اور بتاتا ہے کہ وہاں نخلستان کے کنارے عربوں کی ایک بہت بڑی تعداد جمع ہو رہی ہے۔ میرے والد نے خاص طور سے اسے یہاں بھیجا ہے تاکہ ان غدار عربوں کی تمام حرکات و سکنات پر نگاہ رکھے اور فوراً مجھ سے آکر رپورٹ کرے تاکہ میں حضور کو اس کی خبر پہنچا دیا کروں۔" یہ تمام جملے شیخ حسن نے بے انتہا تعلق خاطر اور گویا بیحد دلچسپی کے عالم میں کہے تھے۔

جنرل نے تھوڑی دیر غور کیا اور پھر دو اور اعلیٰ افسروں کو اپنے خیمہ پر بلا کر ان سے اس بدو پر جرح کرائی۔ لیکن اس اطلاع کے علاوہ جو یہ پہلے ہی دے چکا تھا یہ بدو کوئی نئی بات نہ بتا سکا۔ اس لئے اسے رخصت کر دیا گیا۔ اور جنرل جمیل پاشا نے پہلے ان اعلیٰ افسروں اور پھر شیخ حسن کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور نہایت متانت سے کہا:-

"میجر حسن فوجی جاسوسوں کو ہر روز خبریں ملتی رہتی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ تمہارے والد شیخ فاضل اپنے عہد وفا کے خلاف جانا چاہتے ہیں۔ اگر واقعی انہوں نے مستقلاً ہم سے قطع تعلق کا ارادہ کر لیا ہے تو میرا یہ فرض ہوگا کہ تم کو اور ان تمام شیوخ کو جو اسوقت کیمپ میں ہمارے ساتھ ہیں بطور فدیہ نظر بند کر لوں۔ میں نے تمہاری کل کی تجویز پر کافی غور کر لیا ہے اور میرا خیال ہے کہ جب تک تمہارے والد اپنی اصلاح از خود نہ کر لیں اور جب تک ہمیں پہلے سے زیادہ اطمینان بخش خبریں نہ مل جائیں میں ان غدار عربوں کی سرکوبی کے لئے تمہیں ایک دستہ فوج لیکر جانے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔"

دونوں افسر تو خاموش بیٹھے ہی تھے مگر میجر حسن یہ تقریر سنکر بالکل سکتہ میں رہ گیا۔

آخر کار کشمکش و پیچ کے عالم میں رُک رُک کر کہنا شروع کیا:۔

"حضور والا! میں ہر بدعہدی اور دغابازی کے ارادہ سے ایسا ہی بے قصور ہوں جیسا کہ یہ دونوں معزز افسر اور اپنے والد کی طرف سے بھی میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی بالکل معصوم و بیقصور ہیں یہ خبریں درحقیقت ان دشمنوں کی بیہودہ سرائیاں ہیں جو میرے خاندان کی روز افزوں عزت و حشمت پر ہم سے شاک کرنے لگے ہیں۔" میجر حسن نے دیکھا کہ جنرل کے چہرہ پر ایک قسم کی نرمی چھا گئی ہے اور رحم و انصاف کی لہر اس کے سینہ میں دوڑ رہی ہے۔ چنانچہ اپنے دلی جذبات پر قابو نہ پا کر وہ زار زار رونے لگا۔ اور بولا کہ "حضور کیا آپ کے خیال میں ہم اسی ہانڈی میں چھید کر سکتے ہیں جس میں ہم کھاتے ہیں۔ حالانکہ ہماری آج شان و شوکت اور ہمارا سارا عز و وقار محض سلطان المعظم کی نظر کرم کی بدولت ہے۔ ورنہ ہم خود بھلا کس قابل ہیں۔ للہ آپ یہ غیر منصفانہ خیالات اپنے دل سے یکلخت دور کر دیجئے" حسن یکایک خاموش ہوگیا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور بولا "اس تجویز کو پیش کرنے سے میرا مطلب صرف یہ تھا کہ میں کسی طرح اپنے قول قرار کی سچائی اور خلوص کا اظہار آپ پر کر دوں"۔ جنرل نے پھر ان دونوں افسروں کی طرف دیکھا۔ جن میں سے ایک نے میجر حسن کے ان احتجاجی کلمات پر "مرحبا مرحبا" کے نعرے لگائے۔ آخر کار بہت دیر کے بعد جنرل نے کہا:۔

"میجر حسن! مجھے افسوس ہے کہ میری تقریر اس تکلیف دہ اشکباری کا باعث ہوئی۔ تم بلا شبہ وادی السوس جا کر حالات دریافت کر سکتے ہو۔ لیکن مہربانی سے یلغاری دستہ کو صحرا میں زیادہ دور نہ لیجانا۔ خیال رہے۔ جاؤ! یہ فریق سمتی پاشاہ تمہیں ضروری فوج دیدیں گے اور کلدار توپیں بھی تمہیں دلوا دیں گے"

میجر حسن وہاں سے اپنے خیمہ واپس آیا جہاں وہی نو وارد ایلچی اس کی آمد آمد کا منتظر تھا۔ حسن نے اپنے خیمہ کے تسمہ باندھ کر خیمہ بند کر لیا۔ اور فوراً ہی اس بدو سے مفصل و مشرح گفتگو میں مصروف ہوگیا۔ جو زیادہ تر اشاروں ہی میں ہوتی رہی۔ (باقی آئندہ)

پردے پر ایک نظر

(از مولانا محمد یوسف انصاری (فاضل) اعظم گڈھی)

زمانہ کی نیرنگیاں عجیب ہیں جو اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی ہیں۔ انقلاب دہر سے کائنات کے ہر ہر ذرہ میں انقلاب و تغیر پیدا ہوہی جاتا ہے۔ اشیائے عالم گویا اسی انتظار میں سرو قد کھڑی دامن پھیلائے رہتی ہیں کہ گردش فلکی رونما ہو۔ اور ہم اپنا روپ بدل لیں۔ چرخ چنبریں صفحۂ ارض پر کوئی نیا نقش بنائے۔ اور اس سے ہم اپنے کو آراستہ کرلیں۔ ہر آن ایک نئے روپ ہر لحظہ ایک نئی صورت میں منصۂ وجود پر نظر آتی ہیں۔ بادنسیم کے جھونکوں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے کلیاں کھلتی ہیں۔ پھولوں میں شادابی۔ تروتازگی پیدا ہوتی ہے۔ تو باد سموم کے تھپیڑوں سے پژمردہ ہوجاتی ہیں۔ سرسبز و شاداب ٹہنیاں لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے پودے کبھی تو دھانی لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ اور کبھی زرد لباس میں اپنے حدوث و تغیر کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ سورج دنیا کے آسمان پر طلوع ہوکر اپنی نورانی شعاعوں ضیا بار کرنوں سے عالم کو جگمگا دیتا ہے۔ ہر طرف چہل پہل پیدا ہوجاتی ہے۔ اور پھر اپنی متعینہ مسافت طے کرکے چھپ جاتا ہے۔ اور ایک نیا سماں پیدا ہوجاتا ہے۔ موسم بہار کی دلچسپی، دل آویزی، اور دلکش مناظر فصل خزاں میں ایک بھی باقی نہیں رہتے۔ فلک ستم شعار ہمیشہ ورق دہر پہ نئے گل و بوٹے بناتا ہے۔ حاصل یہ کہ دنیا کی تمام چیزیں انقلاب دہر سے منقلب ہوجاتی ہیں۔ یہاں تک کہ قوم کی زبانیں بھی اس زد سے نہیں بچتی ہیں۔ اور نشانۂ حدوث بن جاتی ہیں۔ لیکن جس طرح اقوام کی زبانوں میں باہمی میل جول اور اختلاط سے ہمیشہ ایک انقلاب پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک قوم میں دوسری قوم کے اختلاط سے اس کے رسوم، رواج، وضع و لباس، عقائد و خیالات نشست و برخاست، اخلاق و عادات، میں تغیر عظیم پیدا ہوجاتا ہے۔ اور جس طرح وہ زبانیں جو

جو دوسری زبانوں کی کشمکش مزاحمت اور اختلاط کی متحمل نہیں ہوتی ہیں۔ دنیا سے مٹ جاتی ہیں یا اپنا اصل لباس، قدیم ہیئت بدل کر نئے لباس، نئی صورت میں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔

اسی طرح وہ تمام چیزیں، اور تمام اقوام جو اختلاط اور انقلاب کو برداشت نہیں کرتی ہیں۔ فنا ہو جاتی ہیں۔ یا اپنی ہیئت اور قومیت کھو بیٹھتی ہیں۔ اور جس طرح زندہ زبان وہ ہے۔ جو ہمیشہ ان انقلابات و تغیرات کا مقابلہ کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح زندہ اور بہادر قوم وہ ہے جو ہمیشہ ان انقلابات اور تاثرات کا مقابلہ کرتی ہے۔

اور دراصل یہی تو حیات و ممات کا ایک تاریخی فلسفہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ نئی روشنی کے متوالے اس حقیقت سے بے خبر اور نابلد ہیں۔ اور ہر ایک نئی بات کو دوسری قوموں کی خواہ اسے عقل سلیم تسلیم نہ کرے۔ خلیف منکر ہو۔ بری ہو۔ مذہب پر حرف آتا ہو۔ دین و ملت کے سراسر مخالف ہو۔ خیر مقدم کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اور اس کی ترویج و اشاعت قوم کے لئے واجب اور ضروری ہی نہیں۔ بلکہ قوم کی فلاح و بہبود کا پڑا اور باعث ترقی اور نجات کا جزو اعظم قرار دیا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ اس کی ترویج ترقی کا ایک زینہ ہے۔ اور اس سے قوم ترقی کے میدان میں اعلیٰ معراج پر گامزن ہو جائے گی۔ (اگرچہ ایسا نہیں) لیکن وہ ترقی کس کام کی جس سے مذہب و ملت کو خیر باد کہنا پڑے۔ لفظ "ترقی" نہایت خوش کن اور پیارا لفظ ہے۔ لیکن اس کے لئے جائز وسائل اختیار کرنے چاہئیں حقیقی اور اصلی ترقی وہی ہے۔ جو دائرہ مذہب میں رہ کر حاصل ہو۔ اور یہی قرین عقل ہے

امم گذشتہ کے حالات پڑھو، تواریخ کا مطالعہ کرو۔ اور بتاؤ کیا کوئی قوم مذہب کی مخالفت کر کے پھلی پھولی ہے۔؟ شجر قومی میں برگ و ثمر آئے ہیں۔؟ تاریخ بزبان حال ہمیں پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ترقی کی یہ راہ نہیں ہے۔ صحابہ کرام کے مبارک عہد کے کارناموں پر نظر ڈالو۔ تو معلوم ہو جائیگا کہ انھوں نے کس طرح اور کیسی نمایاں ترقی کی۔ کہ آج اقوام عالم انگشت بدنداں ہیں۔ اور ان کے ترقی کا راز کیا تھا۔ غور کرو۔ اور بتاؤ۔ یاد رکھو ترقی کی یہ راہ

بالکل خطرناک اور تباہ کن ہے۔ اس سے ترقی کی امید خواب پریشان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ناظرین یہ نہ سمجھ لیں کہ میں ہر ان باتوں کو جو دوسری اقوام میں پائی جاتی ہیں نفرت آمیز نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میرا منشاء ہرگز یہ نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے سامنے سینکڑوں نظیریں اس قسم کی موجود ہیں۔ لیکن میں اس بات کو جو نصوص قرآنیہ، احکام الٰہیہ کے مخالف ہو ضرور برا سمجھتا ہوں۔ اور میں ہی نہیں۔ بلکہ دنیائے اسلام کا ہر فرد اسے ایسا ہی خیال کرے گا۔

اس مختصر تمہید کے بعد، آج جس موضوع پر میں ناظرین کرام کی سمع خراشی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ "پردۂ نسوان" ہے۔ پردہ کیا چیز ہے؟ اگر اس کے متعلق کہا جائے کہ دنیائے اسلام کا (باستثنائے بعض) متفق علیہ مسئلہ ہے۔ تو درست ہے۔ ہم جتنا بھی مذہب اسلام کی اس تعلیم پر فخر کریں کم ہے لیکن افسوس ہے۔ کہ نئی روشنی کے دلدادہ، نیو فیشن کے متوالے بجائے اس کے کہ بے پردگی کی ناپاک رسم اور اس کے نتائج بد سے نصیحت پکڑتے۔ اس کے شرمناک واقعات افسوسناک حادثات کے مشاہدہ سے عبرت حاصل کرتے۔ ان فی ذالک لعبرۃ لمن یخشیٰ۔ ومن یذکر فتنفعہ الذکریٰ (اور بیشک اس میں (خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے عبرت ہے۔ اور جو نصیحت قبول کرے نصیحت اس کو نفع دیتی ہے۔) قوم کو اسی رسم قبیح کی دعوت دے رہے ہیں۔ کوئی ترمیم کا مدعی ہے، تو کوئی بے پردگی کا حامی، شیدا، ورنہ اسی کے لئے جد و جہد کی جا رہی ہے۔ اثبات دعویٰ میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جاتا ہے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جبکہ میں نے لاہور کے ایک اخبار میں ایک آزاد گرل اسکول کا دردناک واقعہ پڑھا۔ اور جس کا ذکر یہاں مناسب نہیں سمجھتا ہاں مخالفین پردہ کے لئے عبرتناک ہے۔ وہ لوگ پڑھیں اور عبرت حاصل کریں۔ ہمیں ہر شخص کو اتنی ہی آزادی اور حق دینا چاہئے۔ جہاں تک شریعت ہم کو اجازت دے۔

کوئی پوچھے ان سے کہ اے نئی روشنی کے متوالو! کیا ایسے ہی بے حیائی بے شرمی مسلمانوں

کے اندر پیدا کرنا چاہتے ہو؟ کیا مذہب ہمیں یہی سکھاتا ہے۔ اور اسی شرمناک امر کی دعوت دیتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ تحریک کیسی؟

فرمان ایزدی ہے "فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ ورسولہ" اگر تم میں باہم کسی چیز کے اندر اختلاف پیدا ہو۔ تو خدا اور رسول کے حوالے کر دو۔ اس لیے اگر تم میں اختلاف ہے۔ تو آؤ اس مسئلہ کو مذہب کی کسوٹی پر پرکھیں کھرے کھوٹے کو پہچانیں۔ ہمارے لئے مذہب ہی معیار صداقت و لطافت ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں مذہبی دلائل شرعی پر اپنے پیش کروں۔ آؤ ہم تاریخ و سیر پر بھی روشنی ڈالیں۔ عہد قدیم کے آسمانی صحیفوں میں بھی ڈھونڈھیں، اور کھوج لگائیں۔ کہ پردہ کا حکم ہمارے مذہب کی خصوصیات میں سے ہے یا دیگر ادیان میں بھی اس کا حکم ہے۔

تو تاریخ کے مطالعہ سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ کہ عہد قدیم کے مذاہب میں عیسیٰ و موسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام، چین اور فارس کی ہستیوں میں بھی پردہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وحشی عرب بھی اپنے زمانہ جاہلیت میں جو ایک تاریک دور کہا جاتا ہے۔ پردہ کی پابندی ضروری سمجھتے تھے۔ اگر زمانہ جاہلیت کے اشعار کا تتبع کیا جائے۔ تو ہزاروں اشعار اس قسم کے لیں گے۔ اور اس سے ان کے خیالات کا صحیح صحیح اندازہ کر سکیں گے۔

ام عمران جو اس دور کی ایک زبردست شاعرہ ہے جب اپنی قوم کو اپنے خاندان کے ایک مقتول کے خونبہا لینے کے لئے برانگیختہ کرتی ہے۔ تو کیا کہتی ہے۔ ؎

ام عمران اپنی قوم کی مذمت کرتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ کہ وہ جماعت بُری ہے۔ جس کا کوئی (قتل) کر دیا گیا ہو۔ (اٹھو اور بدلہ لو) اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اب تم سرمہ (لگاؤ) اور زعفران استعمال کرو۔ اور عورتوں کا نقاب پہن لو۔ اور پردہ میں بیٹھ رہو۔

شعر مذکور و نیز دیگر اشعار جو بخوف طوالت ہم نے ترک کر دیا ہے۔ بتا رہے ہیں۔ کہ جس طرح سرمہ، زعفران زینت کی چیز ہے۔ اور عورتوں کے لئے موزوں ہے۔ اسی طرح پردہ بھی عورتوں کے خصوصیات سے ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں شرفا عورتوں کی جانب نظر اٹھانے کو بھی برا سمجھتے تھے۔ اس تاریک دور کا ایک فصیح و بلیغ شاعر "عنترہ عبسی" فخریہ لہجہ میں کہتا ہے ؎

واغض طرفی ان بدت لی جارتی
حتی یواری جارتی ماورہا

اگر میری کوئی پڑوسن میرے سامنے (ظاہر ہو) آجائے۔ تو میں اپنی آنکھیں جھکائے رہتا ہوں۔ تاوقتیکہ وہ اپنے مکان میں چھپ نہ جائے۔ اپنے وطن کے مصلح قوم علامہ اکبر مرحوم کی نغمہ سنجی ملاحظہ ہو۔ ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

عہد قدیم کی آسمانی کتاب "توراۃ" کا اگر مطالعہ کیجئے۔ تو اس سے بھی پتہ چلے گا۔ کہ پردہ کی مبارک رسم اس میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر مذکور ہے۔

"ورفعت ربقۃ عینیھا فرأت اسحاق فنزلت عن الجمل وقالت للعبد من ہذا الرجل فقال ہو سیدی فاخذت البرقعۃ وتغطت"

اس عورت نے اپنی دونوں آنکھوں سے برقعہ اٹھایا۔ تو اسحاقؑ کو دیکھا۔ وہ اونٹ سے اتر پڑیں۔ اور غلام سے پوچھا یہ کون ہیں؟ خادم نے جواب دیا۔ کہ یہ ہمارے آقا ہیں۔ انھوں نے برقعہ اٹھایا۔ اور منہ چھپا لیا۔

انجیل سے بھی اس رواج کا پتہ چلتا ہے۔ اور ان کے یہاں ہر حالت میں پردہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گرجا کی رہنے والی تارکۃ الدنیا (نن) عورتیں اس قدر آزادی میں بھی

نقاب پوشش نظر آتی ہیں۔ اور اس مذہبی حکم کا پتہ دے رہی ہیں۔ اور در اصل یہ اسی کا ایک فرسودہ نشان باقی ہے۔ پیروان دین مسیح کا عمل کرنا نہ کرنا امر آخر ہے۔

چینوں کے یہاں تو پردہ کی بڑی سخت تاکید ہے۔ ان کی مذہبی کتاب "ام الدنیا" صفحہ ۴۹ میں مذکور ہے۔

"ولا یجوز للمرأۃ ان تامر وتنھی فانما عملھا قاصر علی الاشغال المنزلیۃ ولابد من احتجابھا بالبیت حتیٰ لا تتعد خیرھا او شرھا عتبۃ الباب"

"عورت کو جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو حکم کرے۔ یا ممانعت کرے۔ (اس لئے) کہ اس کا کام گھر کے کاروبار تک محدود ہے۔ گھر کے اندر اس کو پردہ کے ساتھ رہنا چاہئے۔ تاکہ کسی قسم کی برائی دروازہ سے متجاوز نہ ہو"

اسی وجہ سے وہ بچیوں کے پیر میں بچپن ہی میں لوہا پہنا دیتے ہیں۔ تاکہ وہ گھر سے نہ نکل سکیں۔ اور ان کو دشواری ہو۔ لیکن موجودہ زمانہ میں تو یہ طریقہ ان کے یہاں ایک رسم بن گیا ہے اس قسم کی آسمانی صحیفوں اور دیگر ادیان میں سیکڑوں نظیریں مل سکتی ہیں۔ لیکن ہم نے بخوف طوالت چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے۔ اور ان مثالوں سے صرف یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ دنیا کے تمام آسمانی صحیفے اور ادیان میں اس کا رواج تھا۔ اور سیکڑوں صدیاں گذرنے کے باوجود اب بھی بعض بعض جگہ اس کا فرسودہ نشان باقی ہے۔ جو بزبان حال اس کا ہم کو پتہ دیتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

نوائے زندگی

(از منیر الہ آبادی)

تو سماپ ہے کسقدر تو! جلوہ زار زندگی
کتنا دلکش تیرا منظر ہے بہارِ زندگی

تجھپہ صدقے۔ تجھپہ قرباں مہر و ماہ و مہ و سما
جان و دل و دین و ایمان سب نثارِ زندگی

دور منزل پُرخطر شب نعد جاں آ تیرے پاس
لٹ نہ جانا راہ میں۔ او راہ دارِ زندگی

تیز رو ہے مرکب عمرِ رواں۔ تو گر نہ جائے
بیٹھنا اس پر سنبھل کر۔ شہسوارِ زندگی

آہ! وہ دلکش سماں۔ وہ منظر عہد شباب
اف! وہ دورِ عیش وہ لیل و نہارِ زندگی

حسرت آگیں دل میں وہ مدہوشیٔ صہبائے زیست
منتظر آنکھوں میں وہ خواب و خمارِ زندگی

یاد آتی ہیں وہ اگلی صحبتیں احباب کی
دل سے مٹ سکتے نہیں نقش و نگارِ زندگی

دے فنائے زندگی کو۔ زندگیٔ خضر دے
اے خدائے لم یزل۔ اے سازگارِ زندگی

اپنی ہستی! بحرِ ناپیدا کنارِ زندگی
ہر نفس ہے گوہرِ تابندہ دارِ زندگی

زندگی ہم پر گراں ہے۔ ہم ہیں بارِ زندگی
کیجئے کیا پھر۔ نہ کیجے گر شمارِ زندگی

مرنے والے گوش برآوازِ محشر ہیں منیر
خاک میں مل کر بھی ہیں امیدوارِ زندگی

Adabistan.—



Dr. RABINDRANATH TAGORE

[illegible]

رام گنیش گڈکری

(از منشی عبداللہ خان صاحب)

[ذیل کا مضمون جس طرز میں لکھا گیا ہے وہ مرہٹی سوانح نگاری کا خاص رنگ ہے اور اردو میں قطعی نئی چیز ہے۔ اس لئے نہایت دلچسپ ہے۔ م-ا]

شہرت کی بلندی پر چڑھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ نانا جی مالوسرے کا سینگڑ ھ کے دشوار گذار راستہ سے اوپر جانا۔ شہرت جیسی فضائی بلندی مغربی ممالک میں بھی ناپید ہے اور اس کے سویمبر کے قیود کو دیکھتے ہوئے اس بات کو ماننا پڑتا ہے کہ گنگا شنکر کے سویمبر کا تذکرہ اس کے سامنے بازیچۂ اطفال ہے۔ شہرت گویا ایک حور ہے اس لئے اس کا ہمیشہ دوشیزہ ہونا ہی یقینی ہے۔ مگر اس کا طریقۂ انتخاب انوکھا ہے۔ پرانی وضع اور ... فیشن کے دونوں اس معاملہ میں مایوس نظر آئیں گے۔ کبھی وہ بالکل نوجوان کے گلے میں مالا ڈالتی ہے تو کبھی رابندرا ناتھ ٹیگور جیسے بڈھے کو اپنا رفیق حیات بناتی ہے۔

گڈکری جو ایک خوشنما سدابہار پھول کی طرح خشک نہیں ہوا۔ اور قطب کی طرح زوال سے بری ہو کر چمک رہا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۱۹ء میں انتقال کر گیا۔ اس کرہ زمین پر جو اس سے پہلے وارد ہوئے اور ۱۹۱۹ء گذر جانے کے بعد بھی جنہوں نے اپنے سر کو سلامت رکھا۔ ایسے بہادر بہت ملیں گے یا ۱۸۸۵ء میں پیدا ہو کر جنہوں نے ابھی تک حضرت عزرائیل سے تعارف حاصل نہیں کیا۔ ایسے بہت سے خود دار حضرات پائے جائیں گے۔ یا ۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۹ء تک کا زمانہ کا دائرہ جنہوں نے پورا کیا۔ ایسے حساب دان بھی دستیاب ہوں گے۔ مگر ان کا ذکر خیر کرنے والا کوئی اس صفحۂ ہستی پر نہیں پایا جاتا ہر سال

مرنے والے گریجوٹوں کے متعلق کہیں ایک سطر بھی نہیں لکھی جاتی۔ اور نقطہ پر لیس پاس شدہ گڈکری کی تعریف سے کالم کے کالم بھرے ہوئے دیکھ کر بی۔ اے کی سند حاصل کرنا بے سود ہے اس خیال کے گریجویٹ فیصلہ کر لیں گے کہ اب اس دنیا میں رہنے سے سوائے بے لطفی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ رئیس زادے اس معمہ کو کبھی بھی حل نہ کر سکیں گے کہ گڈکری کی شہرت کیوں کر ہوئی۔ کیونکہ گڈکری کسی رئیس خاندان سے نہ تھے۔ گڈکری نے سب کو ہنسایا اس لئے سب ان کے لئے ماتم کرتے ہیں۔ اگر وہ سب کو رلانے والے مارواڑی ہوتے تو بات اور تھی۔ مرہٹی زبان کو اکی عظمت بڑھانے والا سپوت ملا اسی لئے ان کی شہرت ہوئی۔ (باقی دارد)

غزل

(عزّت حیدرآبادی)

دل کسی پر جو مبتلا ہوگا
رنج و غم کا مرے بھلا ہوگا

کیوں برا کہئے کچھ سمجھ کر ہی
دینے والے نے غم دیا ہوگا

کیا خبر تھی کہ میرا تامہ بھی
میری تقدیر کا لکھا ہوگا

بس بھی اے دل! کسے ڈراتا ہے
جان جائے گی اور کیا ہوگا

بن چکا خاک پائے پیر مغاں
اور کیا رتبہ رسا ہوگا

میرے دل کو ملا نہ خاک میں یوں
اس میں تیرا بھی مدعا ہوگا

اس کی ہر بات پر دم تقریر
کہا میں نے کہ جی۔ بجا۔ ہوگا

آج ہی کی خبر نہیں عزّت
کل کی کیوں کر کہیں کہ کیا ہوگا

اردو رسائل کا کیا نصب العین ہونا چاہئے؟

ہندوستان کی علمی دنیا میں جو اقتدار اسوقت اردو زبان کو حاصل ہے اور جس رفتار
یہ ملک کے کروڑوں فرزندوں کے دلوں پر اپنی حکومت اور تسلط کا سکہ بٹھارہی ہے وہ کسی تشریح کی محتاج
ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نسلی اور فرقہ دارانہ تعصب کی بدولت گذشتہ ربع صدی کے اندر برادران
نے اردو کے مقابلہ میں ہندی کو ایک ادبی اور علمی درجہ تک پہنچانے کے لئے غیر معمولی سرگرمی اور
خدی کا اظہار کیا ہے لیکن پھر بھی اردو کے چاہنے والے ملک کے ہر گوشہ میں پائے جاتے
۔ اور اس کی عالمگیری کے سامنے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر اردو کی نسبت
دعوےٰ کیا جائے کہ یہ ہندوستان کی لنگوا فرینکا ہے تو بالکل بجا اور صحیح ہوگا۔ متحدہ قومیت
نقطۂ خیال سے جس کے بغیر کوئی قوم زندہ قرار نہیں دی جاسکتی کسی ملک میں ایک سے زیادہ
بانوں کا مروج ہونا اور اس کے باشندوں کا اپنی اپنی زبان کی ترقی کے لئے جدوجہد کرنا اس
کے مستقبل کے لئے کوئی اچھی فال نہیں۔ تاریخ کی ورق گردانی سے بہت جلد ہم پر یہ حقیقت
منکشف ہو جاتی ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب میں زبان ایک زبردست عنصر ہے
ئی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ اردو ہندوستانیوں یعنی ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان سمجھی
تی تھی۔ لیکن جب سے ہندوستان کی ان دو بڑی قوموں کے درمیان اختلافات نے باہمی
کشیدگی اور عناد کی ایک پائیدار صورت اختیار کرلی ہندوؤں کے تعلیمیافتہ طبقہ نے اردو سے
سرد مہری اور بے تعلقی کا برتاؤ شروع کردیا۔ اب قومی اعتبار سے یہ صرف مسلمانوں کی
زبان سمجھی جاتی ہے۔ مسلمانوں نے جب اس افسوسناک تغیر کو محسوس کیا تو ان کے لئے
سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اردو کی ترقی کے لئے ہر امکانی کوشش سے

سے کام لیں اور دنیا کو دکھا دیں کہ اردو ایک زندہ اور ہمہ گیر زبان ہے جس پر آٹھ کروڑ مسلمانوں کی قومی علمی اور ادبی ترقی کا انحصار ہے۔

دور حاضرہ میں اعلیحضرت حضور نظام کی گورنمنٹ نے جامعہ عثمانیہ کے اجراء سے جہاں تمام علوم و فنون کا ذریعہ تعلیم اردو زبان ہے ایک ایسی مہتم بالشان علمی خدمت انجام دی ہے جس کا عام لوگ شاید صحیح طور پر اندازہ نہ کر سکیں۔ اس امر کا ہر کہ و مہ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ جامعہ عثمانیہ کے ذمہ دار اصحاب کی مساعی جمیلہ کے صدقہ میں اردو زبان حقیقی معنوں میں علمی زبان کا امتیازی درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اس لئے کہ اس نے علمی مصطلحات کی دشوار گذار منزل کا ایک بڑا حصہ طے کر لیا اگر مسلمان اپنی اس محنت و کامیابی پر مسرت اور فخر کا اظہار کریں تو وہ حق بجانب ہیں۔ جنوبی ہند میں جامعہ عثمانیہ ایک ایسا عمیق اور شفاف علمی چشمہ ہے جہاں سے ایک عظیم الشان پیمانہ پر علوم و فنون کی آبیاری ہوتی ہے اور وہ دن دور نہیں جبکہ مسلم پبلک اس آبیاری کے خوشگوار اور بصیرت افروز نتائج کی دل و جان سے قدر کریگی۔ اگر اردو زبان ان اوصاف سے معرا ہوتی جو ہر قوم کی علمی ترقی اور کامیابی کے لئے لازمی ہیں تو جامعہ عثمانیہ کی تحریک ابتدا ہی سے حرف غلط کی طرح مٹجاتی

اردو کی ترقی اور اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ اس کے جرائد اور رسائل ہیں جنکی اہمیت اور طاقت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ جرائد اور رسائل کیا ہیں اسٹیم رولر ہیں جو آئندہ نسلوں کے لئے ایک صاف و ہموار اور سیدھی سڑک تیار کر رہے ہیں۔ اگر گذشتہ نصف صدی کے نظم و نثر کا زمانہ حال کی نظم و نثر سے مقابلہ کیا جائے تو ہمیں ایک حیرت انگیز انقلاب نظر آئیگا۔ ہنگامہ ۵۷ء کے زمانہ میں اردو کا جو رنگ تھا وہ اب صرف تصور کے پردہ پر نظر آ سکتا ہے۔ مسلمانوں کو جو ایک عرصہ دراز تک خواب غفلت میں پڑے رہے آخر زمانہ کی رفتار کے مطابق اپنی ناگفتہ بہ حالت میں تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ زمانہ کے انقلاب آفریں حوادث سے جو ان کے لئے بمنزلہ تازیانہ تھے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ ناممکن تھا کہ اس تغیر اور انقلاب کا اثر اردو پر نہ پڑتا۔ اردو کی موجودہ صورت اور حیثیت اسی

انقلاب کا نتیجہ ہے ۔ اگرچہ قدما کا کلام ادبی حلقوں میں وقعت اور عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور سیاسی احتیاجات کو ملحوظ رکھتے ہوئے قدما کا کلام اب ایک قصہ پارینہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ پرانے سانچے جن میں عروج کا قالب ڈھالا گیا تھا قدیم یادگار کے لحاظ سے خواہ کیسے ہی قیمتی اور قابل قدر خیال کئے جائیں ۔ مگر مسلمانوں کی موجودہ عملی زندگی کے لئے وہ بالکل بے کار اور نکمے ہیں ۔

اس سے زیادہ کسی زبان کی پستی اور کم مائگی کیا ہو سکتی ہے کہ اُسے صرف تکلم یا اظہار خیالات کا وسیلہ سمجھا جائے ۔ اگر زبان کے فلسفہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ زبان خواہ وہ تقریر ہو یا تحریر ایک ایسی زبردست طاقت ہے جو انسان کو بسا اوقات زندگی کے مشکل عقدوں کے حل کرنے میں مدد دیتی ہے ۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جس شخص کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے ۔ وہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کی گردنوں کو اپنے اشارے پر جھکا سکتا ہے ۔ وہ ساحر ہے جس کی سحر کلامی سامعین کے قلوب پر ایک وجدانی کیفیت طاری کرتی ہے ۔ یورپ کی علمی اور سیاسی برتری اور تفوق میں بھی ہمیں ادب کی پوشیدہ طاقت کے کرشمے نظر آتے ہیں ۔ یورپ اور امریکہ کے مصور رسالوں اور میگزینوں کو اٹھا کر دیکھئے ۔ جو صوری و معنوی حسن کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ انہیں دل اور دماغ میں پوری جگہ دی جائے ۔ اور ان کے مضامین سے جو علوم و فنون کے مختلف شعبوں کے متعلق معلومات کا مخزن ہیں فائدہ اٹھایا جائے ۔

یورپ کی ان علمی کوششوں کے مقابلہ میں جب ہم اپنے اردو رسائل کی موجودہ حیثیت پر نظر ڈالتے ہیں تو دلی رنج کے ساتھ اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے رسائل اور اخبارات دراصل ایک آئینہ ہیں جس سے کسی قوم کی تمدنی، معاشرتی اور علمی زندگی

کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ مسلمانان ہند کے ماہوار رسائل اور روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات کی موجودہ حیثیت ان کی عام علمی قابلیت پر پوری روشنی ڈالتی ہے۔ اگر ہمارا یہ مقصد اور مدعا ہے کہ اردو زبان ایک اعلیٰ علمی درجہ حاصل کرے۔ تو ہم اپنے ان بھائیوں سے جنھیں اردو علم ادب سے ایک خاص دلچسپی ہے۔ اور جو رسائل کے اجراء سے اردو کی ترقی اور اشاعت میں حصہ لینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ مودبانہ درخواست کریں گے۔ کہ انہیں اس معاملہ میں اپنا زاویۂ نگاہ بدلنا پڑیگا۔

انگریزی رسائل کے مطالعہ سے صاف نظر آتا ہے۔ کہ ان کے اجرا کا مقصد اپنی قوم میں اولوالعزمی اور بلند پروازی کے جذبات کا پیدا کرنا ہے۔ ان میں ایشیا، افریقہ، اور دنیا کے دیگر حصوں کے متعلق ایسے ولولہ انگیز مضامین لکھے جاتے ہیں۔ کہ پڑھنے والے ان سے متاثر ہو کر اپنے وطن سے نکل جاتے ہیں۔ اور چند سال کی محنت اور جفاکشی کے بعد شہرت دولت اور عزت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رائڈر ہیگرڈ کے ناولوں کا یہی مقصد تھا۔ اس کے ایک ناول "پیل آف دی ہسٹ" نے افریقہ کے تحیر خیز حالات دریافت کرنے کے لئے انگریز سیاحوں کے شوق پر تیل کا کام دیا۔ کیا اردو رسائل کے ایڈیٹروں نے کبھی اس پہلو پر غور کرنیکی زحمت گوارا کی؟

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت ہندوستان اور بالخصوص پنجاب کے اردو رسائل کے مضامین میں حسن و عشق کا رنگ زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ اگر رسالہ کے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے کوئی تصویر شائع کی جاتی ہے۔ تو وہ بھی حسن و عشق کی۔ گویا ادب اور حسن عشق لازم و ملزوم ہیں۔ میرے وہ مضمون نگار بھائی جو اپنے مضامین میں حسن و عشق کے رنگ غلبہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔ مجھے اس صاف گوئی کے لئے معاف فرمائیں گے۔ کہ جس بدقسمت قوم کے افراد بحیثیت مجموعی جہالت اور نیم فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ جن کی قومیت کے اجزا پراگندہ، جن کی اسلامی اخوت کا شیرازہ منتشر ہو۔ اور جن کا مستقبل ان کی باہمی خانہ جنگی سے تاریک دکھائی دیتا ہو، ان کے درد کا علاج ہرگز عشقیہ مضامین یا حسین عورتوں کی تصویر

نہیں ہو سکتیں۔ یہ وقت مسلمانوں کو قلم سے ان کی زندگی وہ اصلی فلم دکھانے کا ہے جس سے وہ اپنی تباہی پستی اور ذلت کی تصویر اپنی آنکھوں دیکھیں۔ یہ وقت ان کو ان خطرات سے آگاہ کرنے کا ہے۔ جن سے وہ چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں۔ یہ وقت ان کو سیدھا راستہ بتلانے کا ہے جس پر ہر شخص گامزن ہو کر خوشحالی اور منزل مقصود تک پہنچے۔ یہ وقت ان کو اس حقیقت سے باخبر کرنے کا ہے۔ کہ وہ اس جلیل القدر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت ہیں جس کی تعلیم کے صدقہ میں اس کے غلام تاجدار ہو گئے۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ انسان حسن و عشق کے سرور انگیز فلسفہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ کیا فاقہ کشی کی حالت میں ایسے فلسفہ کی تعلیم کسی صورت میں بھی جائز ہے؟ کیا حسن و عشق کی داستان سے ان نوجوانوں کے دماغی اور جسمانی قوت کے سلب ہو جانے کا اندیشہ نہیں ہے۔ جن کی سادہ اور مجاہدانہ زندگی پر ان کے خاندان۔ ان کی قوم اور ان کے ملک کے مستقبل کا انحصار ہے؟ کیا بدبخت مسلمانوں کی پریشانیاں اور کمزوریاں ایسی داستانوں سے رفع ہو سکتی ہیں؟۔

انگلستان میں ایک طبقہ ایسی عورتوں کا وجود ہے۔ جو تجارتی، صنعتی اور حرفتی شعبوں میں مردوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ انجینئرنگ انجمن نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ اس انجمن میں کوئی عورت اس وقت تک شامل نہیں ہو سکتی جب تک وہ انجینئرنگ کے امتحان کی سند حاصل نہ کر لی ہو۔ یا کسی انجینئرنگ کی کسی بڑی فرم میں کام نہ کر چکی ہو۔ اس انجمن کے ممبروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ انگلستان میں تو عورتیں مردوں کے وہ پیشے اختیار کریں۔ جن میں دماغی قابلیت اور جسمانی طاقت کی ضرورت ہے مگر ہندوستان کے اردو رسائل میں مردوں کو حسن و عشق کی داستانیں سنا کر ناکارہ اور اپاہج بنایا جاتا ہے۔ میرے نزدیک ایسے رسالے جن میں ناظرین کے جذبات کو عشقیہ مضامین سے ابھارا جاتا ہے۔ اخلاقی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کیوں ان جذبات کو دیدہ و دانستہ

اور علامہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جن کا ادبا امین حکمت ہے جب بہار آتی ہے تو پھولوں میں خود بخود دھنک پیدا ہو جاتی ہے۔ عشق کے جذبات کو بلا وجہ برانگیختہ کر، ایک سوئے ہوئے فتنے کو جگانا ہے۔

ہمارا قلم صرف ایسے مضامین کی اشاعت کے لیے وقف رہنا چاہئیے۔ جن کے مطالعہ سے فرزندان توحید کے دل میں دینی اور دنیاوی ترقی کے جذبات موجزن ہوں۔ مسلمان دنیا کی مہذب اقوام میں اس وقت تک اپنے لئے معزز نشست حاصل نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ یورپ اور امریکا کی متمدن اقوام ان کی دماغی قابلیت کا لوہا نہ مانیں۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئیے کہ وہ انہیں نامور اسلاف کے اخلاف ہیں۔ جنہوں نے اس زمانہ میں جبکہ یورپ پر جہالت اور لاعلمی کی ایک گھٹا چھائی ہوئی تھی، علم کی روشنی پھیلائی۔ یورپ اب تک اپنے مسلم استادوں اور رہنماؤں کا نام ادب اور احترام سے لیتے ہیں۔ ابوالفدا، البکری، البطانی، البیرونی، ابوالقاسم خلاف، الحسن الادریسی، الخوارزمی، السعدی، ابو مروان ابن زہر، ابن رشد جعفر، ابن بطوطا، ابن یونس، ابن خلدون، ابن خلکان، مسعودی، عمر خیام، آسمان علم کے وہ درخشاں ستارے ہیں۔ جنہوں نے علم اور سائنس کے مختلف شعبوں میں جو مسائل اور اصول دریافت کئے۔ وہ مسلم طور پر یورپ کی موجودہ حیرت انگیز علمی ترقی کا سنگ بنیاد خیال کئے جاتے ہیں۔

کیا ہماری حمیت و غیرت کا یہ تقاضا نہ ہونا چاہئیے۔ کہ ہم اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ کریں۔ علم و فضل کے اعتبار سے غیر مسلم اقوام کو خندہ زنی کا موقعہ نہ دیں۔ اس مقصد کے حصول میں ہماری کامیابی یقینی ہے بشرطیکہ ہمارے رسائل، یعنی ان علمی ضروریات کو پورا کرنا اپنا فرض منصبی سمجھیں۔ جن کے بغیر کوئی قوم سیاسی، اقتصادی، تجارتی، اور صنعتی پہلو سے بام رفعت پر نہیں پہونچ سکتی۔

(غلام حیدر خان)

جزر و مدِ دریا

(مترجمہ مولانا عبدالستار صاحب فاروقی)

آغاز سال رواں میں جزر و مد دریا سے متعلق ایک عجیب و مفید ترین انکشاف ہوا ہے اور جو ساحلی مقامات کے باشندوں کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ انکشاف یہ ہے کہ حرکت ارض اور وقوع زلزلہ کے وقت دریا میں ایک طوفانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے پانی بلیوں اچھلنے لگتا ہے گویا دریا اپنے اس مد و جزر سے لوگوں کو اطلاع دیدیتا ہے کہ اب زمین متزلزل ہوگی تم سنبھل جاؤ اور اپنی جائے پناہ کو ڈھونڈھ لو۔ اس نظریہ کی تصدیق جاپان کی مجلس علوم طبعیات نے کردی ہے اور بعد تدقیق و تحقیق یہ طے کیا ہے کہ یقیناً دریا کا جزر و مد تزلزل زمین کا پیش خیمہ ہے اور جسقدر شدید یا خفیف دریا کی طوفانی حالت ہوگی اسی قدر شدید یا خفیف زلزلہ واقع ہوگا۔ چنانچہ آج سے دو سال پہلے جو عظیم اور مہیب زلزلہ جاپان میں آیا تھا اور جس سے اس ملک کے ہزاروں بلاد اور قصبات تودہ خاک ہوکر رہ گئے تھے۔ اس دردناک وقوع زلزلہ کے تین ماہ پہلے جاپان کے دریا میں شدید طوفان آیا تھا جس سے ساحلی مقامات کو بہت کچھ نقصان پہنچا تھا۔ اگر اس وقت اس انکشاف کا علم ہوتا تو یہ بہت ممکن تھا کہ اہل جاپان اپنی جائے پناہ ڈھونڈھ لیتے استحکامات اور انتظامات کرلیتے اور ان تمام آفتوں اور بلاؤں سے نجات پاتے۔ جو وقوع زلزلہ سے ان پر ٹوٹ پڑی تھیں۔

اس مسئلہ کے متعلق علمائے جرمنی نے بھی اپنی تحقیقات کے نتائج ظاہر کئے ہیں جن سے اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

گذشتہ سال سان فرانسیسکو امریکہ میں جو زلزلہ آیا تھا اس کی خبر پہلے ہی سے سرکاری طور پر گشت کرادی گئی تھی۔

غزل

(از حضرت نوح ناروی)

ہماری فغاں سے اثر مل رہا ہے
زمیں کانپتی ہے فلک ہل رہا ہے

وہ عرض تمنا پہ شرما رہے ہیں
مزا آ رہا ہے مزا مل رہا ہے

شب غم سے اللہ محفوظ رکھے
ابھی تک کلیجہ مرا ہل رہا ہے

ملا دیں گے وہ خاک میں ہر کسی کو
کوئی مل چکا ہے کوئی مل رہا ہے

ٹھہرتا نہیں ہاتھ بھی اب کسیکا
کچھ ایسا کلیجہ مرا ہل رہا ہے

جو پہلو میں دل ہو تو ہم کچھ بتائیں
وہ کہتے ہیں کس دل سے تو مل رہا ہے

ذرا ہاتھ رکھ کر تم انکو سنبھالو
کہ دل کانپتا ہے جگر ہل رہا ہے

ستم کر رہی ہیں وہ نیچی نگاہیں
مرا مدّعا خاک میں مل رہا ہے

ترے سامنے میں زباں کیا ہلاؤں
کہ پہلو میں دل خوف سے ہل رہا ہے

وہ کیوں مجھکو اے نوح دم دے رہے ہیں
یہ کیا میرے دل کا عوض مل رہا ہے

سوئزرلینڈ کو جو دنیا کے خوبصورت مقامات میں سے ہے کیپٹن کوک نامی شخص نے دریافت کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی شخص نے سب سے پہلے سیاحت بھی کی ہے۔

انگلستان میں ایک شخص کے تین لڑکیاں صورت شکل اور وزن میں اس درجہ مشابہ پیدا ہوئی ہیں کہ ان کا تمیز کرنا ماں باپ کے لئے بھی ناممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو علامت کے ٹکٹ پہنا دئے۔

لندن کے عجائب خانہ میں تین ہزار جانور ہیں۔ سو برس پیشتر اس میں صرف دو جانور تھے۔

معلوم کیا گیا ہے کہ ہر ۹۰ پیدائشوں کے بعد ایک جوڑواں اولاد پیدا ہوتی ہے۔

ہر دو سو پچاس برس کے بعد دنیا کی آبادی دوگنی ہو جاتی ہے۔

اگر تمام دنیا کی ریلوے لائن ایک ساتھ جوڑ دی جائیں تو وہ چاند تک پہونچکر چار لاکھ ستہتر ہزار چھ سو چھتیس میل آگے نکل جائیگی۔

صابون پہلے پہل ایک شخص گاؤلس نامی نے بنایا تھا جسے دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گذرا۔ اس نے راکھ اور بکری کی چربی سے صابن طیار کیا تھا۔

ایک معمولی آدمی کے پھیپھڑے میں ہوا کے لئے سات کروڑ ساٹھ لاکھ سوراخ ہوتے ہیں۔

نظم حسنات
انجمن معین الادب

اردو علم و ادب کا ماہوار مجموعہ

مقام اشاعت
عروس البلاد بمبئی

بنام جہاندار جان آفریں
حکیم سخن در زبان آفریں

جلد ۱ ...... نمبر ۵

معاون
منیر الہ آبادی

مرتب
رشید صدیقی

معاون
خلیل احمد سیکروی

فہرست مضامین

ماہ جنوری ۱۹۲۷ء

۱۹۴۶ء

بزمِ ادب

گذشتہ ہفتہ مسٹر فاضل ابراہیم رحمۃ اللہ چیرمین مجلس تعلیمات بمبئی و ممبر اسمبلی نے دوران ملاقات مین اردو کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ بمبئی اور گرد و نواح کے مقامات مین تو بفضلہٖ اردو مستعمل ہے لیکن سنٹرل ڈویژن مین شولا پور وغیرہ کچھ ایسے مقامات بین جہان بمشکل اُردو بولنے اور سمجھنے والے ملسکتے ہین اسکی وجہ صرف ایک ہے یعنی ان مقامات مین افراد سے لیکر انواع تک مرہٹی ہی ایک زبان ہے جو عام ہے پھر اردو کے لئے وہان گنجایش کیونکر نکل سکتی ہے۔ توجہ اس لئے نہین کی جاتی کہ اردو عدالت کی زبان ہی نہین کہ لوگ خواہ مخواہ اسے حاصل کرنے کے لئے مجبور ہون۔

ہم اس امر کی کوشش مین شریک ہونے کے لئے ہر وقت طیار ہین کہ ان اضلاع مین اردو کا پروپگنڈا کیا جائے۔ اور اگر ممکن ہو تو اردو کو نصاب تعلیم مین ہی داخل کرنے کی سعی کیجائے۔ کیا کوئی صاحب ذوق فرد یا جماعت اس باب مین کچھ کرنے کے لئے تیار ہین۔ ؟

اندنون تصنع اور تقلید کچھ ایسی عام ہو رہی ہے کہ گویا ملک کا خمیر یہی ہے۔ صبح سے شام تک کی چھوٹی چھوٹی معمولی حرکات سے لیکر بڑے سے بڑے حادثات زندگی تک مین تصنع کا دخل ہے۔ رفتہ رفتہ ہم ان باتون کے کچھ ایسے عادی ہی ہو گئے ہین کہ یا تو اب ان کی تمیز کا احساس ہی کھو بیٹھے ہین یا اس جانب توجہ نہین کرتے لیکن بعض حالتون مین یہ امور زیادہ خطرناک ہوتے جارہے ہین جن کی جانب توجہ کرنی ضروری ہے۔ گذشتہ چند سالون سے مسلمان خواتین مین طوفانی سمندر کی جنون انگیز موج کی طرح آزادیٔ نسوان کی جو تحریک اُٹھی ہے اس کی برکات کم و بیش ہمارے سامنے ہین عام طور پر لڑکیون مین تقلید مغرب کا جو شوق پیدا ہو گیا ہے اور دن بدن ترقی پذیر ہے وہ کم مہلک نہین ممکن ہے کہ ان محفوظ مقامات مین اس مہلک شوق کے اثرات نہون یا بالکل کم ہون جہان مغربی طرز کی آزاد

سوسائٹیاں نایاب ہیں۔لیکن بڑے شہروں اور خصوصاً بمبئی میں اس تحریک کا جو عالم ہے اس کا صحیح اندازہ دشوار ہے۔ اس مسئلہ پر اس سے زیادہ کچھ لکھنے سے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ علیا بیگم صاحبہ بھوپال کی اس تقریر کا خلاصہ پیش کر دیا جائے جو انہوں نے علی گڈھ کی مسلم خواتین کے ایڈریس کے جواب میں فرمائی تھی۔ اس تقریر میں علیا بیگم صاحبہ نے نہایت شاندار طریقہ پر خواتین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی ہے۔اور اپنی تقریر کو زیادہ موثر بنانے کے لئے ایک خاص طرز بیان اختیار کیا ہے۔ فرماتی ہیں:۔

"میری عمر ستر سال سے زیادہ ہے۔ ممکن ہے میری لیاقت محدود ہو لیکن میرے تجربات وسیع ہیں۔ میں نے اسلامی اور مغربی ممالک کی سیاحت بھی کی ہے۔اور ہمیشہ عورتوں کے عروج و زوال پر غور کرتی رہی ہوں۔میں نے بچپن ہی میں مذہبی تعلیم حاصل کر لی تھی۔اس لئے مجھے حق ہے کہ میں اپنی ہم جنسوں اور خصوصاً مسلمان خواتین کے متعلق کچھ کہوں۔

اے مسلم خواتین! ہر وہ عورت جو اپنے کو مسلم کہتی ہے احکام اسلام کے ماننے اور قرآن پاک کے قوانین کے مطابق چلنے پر مجبور ہے۔انسان بیشک آزاد ہے لیکن وہ حکومت یا مذہب کے قوانین سے قطعاً لاپرواہ نہیں ہو سکتا۔اسے ان میں سے ایک کی تعمیل کرنی ضروری ہے۔ہم مسلمانوں کو مذہب سے ہرگز ہرگز بغاوت نہ کرنی چاہئے۔"

"جو شخص کسی قوم سے مشابہ ہے وہ اسی کا ایک فرد ہے" اس لئے میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ قوانین اسلام کے عین مطابق ہوگا۔ ہماری تعلیم یافتہ لڑکیوں میں دوسری اقوام کی مجلسی زندگی کے طور طریقے اور فیشن کی تقلید کا جو جذبہ روز بروز ترقی پذیر ہے اور جسے دوسرے الفاظ میں ترقی کہا جاتا ہے۔یقیناً خطرناک ہے اور ایک تاریک مستقبل کی علامت ہے۔یہ جذبہ تصنع و تقلید مردوں و عورتوں کے سوشل تعلقات اور اس سے بڑھ کر ان کی مذہبی لاعلمی کی بنا پر ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان میں تصنع اور نمائش دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ دوسرے ممالک کی عورتوں کی بے ہنگام آزادی ایسے اصولوں اور مقاصد کی بنا پر نہیں ہے کہ ہم انکی نقل اتارنے کی کوشش کریں یہ ایک بالکل غلط خیال ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کے ہر رسم و رواج کی تقلید تہذیب میں داخل ہے یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے اور مضحکہ خیز باتیں کسی قوم کو مہذب نہیں بنا سکتیں۔"

ہمین افسوس ہے کہ جناب اسلامی کی علالت کی وجہ سے اس دفعہ مرہٹی کے ڈرامہ "پن پہا" کا ترجمہ شریک اشاعت نہین کیا جا سکا۔ امید ہے کہ آیندہ اشاعت مین اس کمی کی تلافی کر دی جائیگی

: جناب مرتب کی غیر متوقع علالت کی وجہ سے اس اہم ذمہ داری کا بوجھ مجھ ناچیز کے سر آگیا ہے۔ اور مین نے حتی الوسع اسکی انجام دہی کی کوشش کی ہے۔ ایسی حالت مین اہل نظر حضرات مجھے معذور سمجھین اور میری خامیون کو نظر انداز فرمائین۔

نیر آکہ آبادی

حکیم میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

(دلی کی بولی لکھنؤ میں)

(از مولوی عبد السلام ندوی)

دنیا میں مال و دولت، جاہ و ثروت، اور سلطنت و حکومت نے اگرچہ ہزاروں احسانات کئے ہیں۔ لیکن ان کے احسانات کی فہرست جس قدر روشن ہے۔ اسی قدر اُن کے مظالم کا نامۂ اعمال سیاہ بھی ہے۔ اور اس میں قساوت و سنگدلی کے صرف وہی واقعات مندرج نہیں ہیں جو مادیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ غریب روحانیت بھی ان کی تیغ ستم سے مجروح نظر آتی ہے۔

علمی دنیا میں سینکڑوں آدمی فطرت کی عطا کردہ قوتوں سے مسلح ہو کر آئے۔ اور تنازع للبقا کی دائمی کشمکش میں ان روحانی ہتھیاروں سے کام لیکر اپنے حریفوں کو پیچھے ہٹانا چاہا۔ لیکن چونکہ مادی قوت نے اعانت نہیں کی۔ اس لئے خود پیچھے ہٹ آئے۔ اور اگر ان قوائے فطریہ کی غیر معمولی روحانی قوت نے انکو زندہ نہ رکھا ہوتا۔ تو آج میدان شہرت تو الگ وہ اپنے گوشۂ گمنامی میں بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔

علوم و فنون کی ہر شاخ اس قسم کی دردناک مثالیں پیش کر سکتی۔ لیکن اسوقت صرف شاعری سے بحث ہے۔ اور ہمکو اس سلسلہ کی ایک نہایت قریب ترین مثال پیش کر کے سلطنت اور حکومت کے اس جابرانہ اقتدار کے مظالم کی پردہ دری کرنی ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ میں مصحفی اور انشار کو اس دردانگیز مثال کے لئے عام طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مصحفی نے اردو زبان اور اردو شاعری کو جس سنجیدگی و متانت کے ساتھ ترقی دی۔ اور اس خاندان کا جو سلسلہ آج تک اس ادبی خدمت میں مصروف ہے۔ اس کے لحاظ سے اُن کے سامنے انشار کی حقیقت ایک بھانڈ سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں حکومت کی امداد و اعانت سے انشار

ہی کا بول بالا ہوا۔ اور آج بھی اس علم کا اسعد اثر قایم ہے کہ وہ مصحفی کے حریف خیال کئے جاتے ہین اور اُن کے ساتھ ساتھ ان کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن ہمکو بہت زیادہ دور جانے کی ضرورت نہین خود ہمارے زمانہ مین داغ، امیر اور جلال کی شخصیتون کو اس کی بہترین مثال مین پیش کیا جاسکتا ہے جن مین داغ و امیر صرف اس لئے زیادہ نمایان طور پر نظر آتے ہین کہ ایک حضور نظام میر محبوب علی خان بہادر والی حیدر آباد کا اور دوسرا نواب کلب علی خان بہادر والی ریاست رامپور کا استاد تھا لیکن ان دونون کے مقابل مین غریب جلال کے سر پر کوئی دنیاوی اقتدار سایہ فگن نہ تھا بلکہ اس نے میر و مصحفی کی طرح گوشہ نشینی اختیار کر کے اپنی غربت و مسکینیت سے عاشقانہ شاعری کے قالب بیجان مین درد و غم۔ سوز و گداز، اور رقت و لطافت کی سیال روح پھونکی۔ اور ناسخ و تلامذۂ ناسخ نے لکھنؤ مین شاعری کے چشمہ کو جس قدر کثیف اور گدلا کر دیا تھا جلال نے اس مین روانی اور لطافت پیدا کر کے مادی اور روحانی دونون حیثیتون سے میر و مصحفی کے ساتھ مشابہت پیدا کر لی تھی بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ تناسخ کے اصول کے مطابق اس اخیر دور مین میر و مصحفی دونون نے گوشہ نشین جلال ہی کے قالب مین نیا جنم لیا تھا۔

اردو شاعری کی تاریخ مین یہ واقعہ نہایت افسوسناک خیال کیا جاتا ہے کہ مصحفی کی شاعری کے زمانۂ عروج مین لکھنؤ نے ان کی کافی قدر دانی نہین کی بلکہ انشا کے مقابل مین انکو سخت ذلت و توہین برداشت کرنی پڑی۔ کیونکہ انکو مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے صرف پچیس روپے ماہوار ملتے تھے۔ لیکن جب انشاء اللہ خان کو دربار مین رسوخ حاصل ہوا اور وہ شاہزادہ کی غزلین بنانے لگے تو اس پچیس روپے مین بھی تخفیف ہوگئی۔ اور مشہور ہے کہ اس حالت مین انکو غربت و افلاس نے غزل فروشی پر مجبور کیا۔ اور اگر مولوی محمد حسین آزاد کی روایت صحیح ہے تو اس تجارت نے اسقدر وسعت اختیار کر لی کہ ان کے پاس دو۔ تین تختیان دھری رہتی تھین جب مشاعرہ قریب ہوتا تھا تو ان پر اور مختلف کاغذون پر طرح مشاعرہ مین شعر لکھنے شروع کر دیتے تھے۔ اور برابر لکھے جاتے تھے۔ عین مشاعرے کے دن لوگ آتے ۸؍ سے ۱۲؍ تک اور جہان تک کسی کا شوق مدد کرتا وہ دیتا۔ یہ اس مین

سے ۱۹-۱۱-۲۱ شعر کی غزل نکال کر حوالہ کر دیتے۔ پھر سب کو دے لیکر جو کچھ بچتا وہ خود لیتے۔ اور انکو مشاعرہ مین پڑھ دیتے۔ چنانچہ ایک مشاعرہ مین جب شعرون پر بالکل تعریف نہ ہوئی تو انہون نے تنگ ہوکر غزل زمین پر دے ماری اور کہا کہ روئے فلاکت سیاہ جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہونچی ہے کہ اب کوئی سنتا بھی نہین۔ جلال کی غربت و فلاکت کی داستان اگرچہ اس قدر پر درد نہین ہے۔ تاہم رامپور سے نکلنے کے بعد ان کو بھی معاش کی طرف سے کبھی اطمینان و سکون نصیب نہین ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بغیر مالی منفعت کے کسی کے کلام پر اصلاح نہین دیتے تھے۔ اور جب تک ٹکٹ روانہ کیا جائے۔ کسی کے خط کا جواب نہین لکھتے تھے۔ اس متفرق آمدنی کے علاوہ منگرول کے نواب حسین میان ان کو پچیس روپے ماہوار بھیجتے تھے اور ہر قصیدہ پر سو روپے الگ دیتے تھے۔ مین نے بھوپال مین ان کا ایک خط دیکھا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ فکر معاش سے تنگ آکر حیدرآباد کی ریاست سے توسل پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یا کم از کم صلہ و انعام کی خواہش رکھتے تھے۔ اس غرض سے انہون نے نواب وقار الملک کی خدمت مین ایک قصیدہ بھیجا تھا لیکن انہون نے اسکی جو داد دی وہ غریب جلال کیلئے سخت مایوس کن تھی۔ لیکن اس فقر و فاقہ کے باوجود ان مین مصحفی کی مسکینیت نہین پائی جاتی تھی بلکہ شکستہ حال میر کی طرح نہایت خوددار اور مغرور تھے۔ اور اپنے سامنے کسی استاد کو نگاہ مین نہین لاتے تھے۔ چنانچہ مین نے سنا ہے کہ انہون نے لکھنؤ کی ایک مسجد کے سامنے کھڑے ہوکر کہا کہ اس مسجد کی در و دیوار اور منبر و محراب کی قسم کہ آج لکھنؤ مین جلال کا جواب نہین اور اسوقت ہم ان کی شاعری پر تنقید کرکے یہ دکھانا چاہتے ہین کہ ان کا یہ مغرورانہ دعویٰ واقعی بالکل بجا تھا۔

حکیم صاحب نے شاعرانہ حیثیت سے لکھنؤ کے اس خاندان مین تربیت پائی ہے جس نے ہمارے نزدیک شاعری کو بھانڈون کی نقل بنا دیا تھا اسوقت تاریخ کے رنگ کلام سے بحث نہین ہے لیکن اس قدر تو خود اہل لکھنؤ تسلیم کرتے ہین کہ ان کے تلامذہ مین میر علی اوسط رشک نے شاعری کو بالکل نمکدان ظرافت بنا دیا تھا۔ مثلاً یہ اشعار۔

چاول الماس، گوشت لخت جگر　　فرقتِ یار مین پلاؤ نہین

میرے کھانے سے کیون فلک ہے کباب   پاؤ روٹی ہے نان پاؤ نہین

اونھی کی نازک خیالی کے نمونے ہین۔ اور صرف اسی پر بس نہین۔ ان کا پورا دیوان اسی قسم کے لطیف اشعار سے لبریز ہے۔ حکیم جلال پہلے انہی کے ایک شاگرد امیر علی خان ہلال کے جن کے کلام کا رنگ بھی اسی کے مشابہ ہے ؎

یہ نا نہا پائی بھی کہین دیکھی سنی نہیں   لاتون کے ساتھ آپ کی چلتی ہین کہنیان

شاگرد تھے۔ لیکن بعد کو خود ہلال ان کی قابلیت کو اپنے قابو سے باہر پا کر اپنے اُستاد میر علی اوسط رشک کے پاس لیگئے۔ اور یہ کچھ عرصہ تک اُن سے مشقِ سخن کرتے رہے۔ لیکن جب وہ کربلائے معلی چلے گئے تو مرزا محمد رضا برق سے اصلاح لینے لگے۔ انہون نے خم کدرون کے نچوڑ سے جو کثیف شراب تیار ہوئی تھی اوسکی نسبت خود حکیم صاحب کے ایک ممتاز شاگرد سید انور حسین آرزو نے ہم سے کہا کہ وہ ضایع کردی گئی۔ یعنی بعد کو حکیم صاحب نے اس رنگ کے اشعار کا دفتر خود ہی چاک کر دیا ؎

کین دفتر بے معنی غرقِ مے ناب اولی

باینہمہ ان کے دیوان مین بعض اشعار اب تک اس رنگ کے موجود ہین۔ مثلاً

سرعت وہی ہے گردشِ چشمِ کحیل کی   طے کی ہے گو مسافت ابھی ایک میل کی
دیکھے جو آئینہ بھی شباب اس جمیل کا   دل مین چھپے اُبھار رہا مون کے کیل کا
توڑینگے یون کہ پھر نہ ملے غیر سے وہ شوخ   جس روز کوئی جوڑ ہمارا بھی چل گیا
آنکھ جھپک کر نہ اُٹھی جھانکی ہین بغلین کیا کیا   دل ہمارا جو کہین ان کی بغل سے نکلا
ششدر رہا ہے کچھ یار بھی کچھ ہم ہی ہین ششدر   بیٹھے ہین شبِ وصل عجب بارہ دری مین
بنے اس سیمتن سے یا بگڑے   ہر طرح عاشقون کی چاندی ہے
سرمے نوشی اے زاہد اگر ہے ریش کو منڈوا   نکل آئیگی پھر داڑھی کہ یہ تو گھر کی کھیتی ہے

لیکن باینہمہ طبیعت مین اخذ و قبول کی قابلیت خداداد تھی۔ اس لئے انہون نے یہ روش چھوڑ دی۔ اور دوسرے راستہ پر چلنے لگے۔ خواجہ آتش کی آتش نفسیون کے نمونے سامنے تھے

ان کے تلامذہ کا صاف ستہرا عاشقانہ کلام لکھنؤ کی گلی کوچون مین عموماً پڑہا جاتا تہا۔ میر کے پر درد اشعار ذہر شاعر کے لئے وحی والہام کا درجہ رکھتے تھے۔ لکھنؤ سے باہر انہون نے ایک مدت تک ریاست رامپور مین زندگی بسر کی۔ جو شعرائے دلی اور شعرائے لکھنؤ کا ایک مشترک مرکز تہا۔ اور ان تمام اسکولون سے متاثر ہوکر انہون نے ایک مخلوط رنگ پیدا کیا۔ جس مین آتش، تلامذۂ آتش، اور مرزا داغ کی سلاست و روانی، شیفتہ و غالب کی متانت، اور میر کا سوز و گداز سب کچھ موجود ہے۔ اور اس لحاظ سے ان کا کلام "انچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے اس اصلاح شدہ کلام کو شاعری کے کس اسکول مین داخل کیا جا سکتا ہے۔ خود حکیم صاحب اپنے آپ کو میر صاحب کا متعلد بتاتے ہین۔

کہنے کو جلال آپ بہی کہتے ہین وہی طرز لیکن سخنِ میر تقی میر کی کیا بات

اور اُن کے کلام مین جو سادگی، تاثیر، اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط نہین ہے مثلاً

اُٹھا کے آنکھ کو دیکھا جو دہیان سے اوپر تو پایا انکو بہت لامکان سے اوپر
کہڑے تھے وہ سر بالین مگر نہ دیکھ سکا نگہ نہ کی گئی مجھ ناتوان سے اوپر
پڑے ہین سوز جگر کے بیان سے چھالے زبان کے نیچے، زبانین زبان سے اوپر
اثر کو عالم بالا مین جا کے ڈہونڈئے آہ جہان اک اور بہی ہے اس جہان سے اوپر
یہ قیس و وامق و فرہاد کے سب افسانے گذر چکے ہین مری داستان سے اوپر
زمین سے خاک نشینون کا تیرے اُٹھکے غبار پہونچ گیا ہے کہین آسمان سے اوپر
جلال عشق حقیقی کا رہنما ہے مجاز
چڑہے ہین عاشق اِسی نردبان سے اوپر

یہ انکی ایک پوری غزل ہے۔ اور اس مین لکھنؤ کی شاعری کی نمایان خصوصیات انگیا، کرتی، کنگھی، چوٹی اور ضلع جگت، وغیرہ کا کہین پتہ نہین۔ بلکہ اس کے بجائے درد و غم اور سوز و گداز کی کافی چاشنی

موجود ہے۔ یہی ان کے کلام کا عام رنگ ہے اور اس رنگ مین انہون نے بہ کثرت پر درد اشعار لکھے ہین۔ مثلاً

تری کوئی حسرت نہ نکلیگی اے دل — یہ کہتے ہین چند اشک حسرت نکلکر
خبر بھی کسے عشق مین دل ہمارا — یہ کچھ ناز اُٹھائے گا نازون مین پلکر
سر شمع پر وانے گر کر پکارے — لگی دل کی عاشق بجھاتے ہین جلکر
چلو حسرتو کوئے جانان مین ہے دل — منالائین آج اپنے روٹھے کو چلکر

نہ بلانیکا ہے شکوہ انہین ہم سے دم نزع — یہ عنایت بھی ہے چند کے مہمانون پر
اشکبار آج بھی رکھا ہمین اس نے اے چرخ — پڑ گئی اوس شب وصل کے ارمانون پر

زیادہ اس سے نہ اُٹھوائے گا اپنے ستم — دیا ہے آپ کو نازون مین ہم نے پال کے دل
جلال دیکھو نہ تم ہائے کہہ کے گر پڑنا — کسی کے ناز اُٹھانا ذرا سنبھال کے دل
چلے جو دل کو وہ ٹھکرا کے یہ صدا آئی — نثار تیری ان اٹھکھیلیون کی چال کے دل

بیخودون سے ترے رہتی ہے خودی کوسون دور — ہوش دیوانہ نہین آنے جو دیوانون مین

زہے قسمت جو تم اپنی گلی مین — جگہ مرنے کی دو زندگی مین
نہ پوچھوگے نہ درد دل کہون گا — یونہی رہ جائیگی بس جی کی جی مین
خیال دوست تونے کی شب ہجر — عجب بیکس نوازی بے کسی مین
فلک کیا ہمکو سمجھا ہے کوئی زخم — رولاتا ہے جو تو اکثر ہنسی مین
عدو کیسے احبا بھی ہمارے — بنے دشمن تمہاری دوستی مین

جگر، دل، سینہ، پہلو، درد تیرا انہی میں سے ہے پوشیدہ کسی میں

یہ سچ ہے کہ لکھنؤ کی شاعرانہ خصوصیات میں وہ رعایت لفظی کو حتی الامکان ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن باینہمہ اُس میں شیخ ناسخ کے اسکول کی کثافت نہیں پائی جاتی۔ بلکہ اس میں وہ ایک ایسی لطافت پیدا کر دیتے ہیں کہ یہ عیب ہنر بنجاتا ہے مثلاً

تقدیر ہنسی ہماری کیا کیا بولے جو وہ ہم سے مسکرا کر

خبر تک بھی ہوئی اک شب نہ اس خانہ نشین بت کو در و دیوار کیا کیا میرے نالون نے ہلائے ہین

دیکھین تو کھنچے رہتے ہین ہم سے وہ کہان تک اے جذب ترا ہم بھی اثر دیکھ رہے ہین

کیا حضرت دل رات کو دیکھا تھا کوئی خواب کچھ صبح سے آج آپ پریشان بہت ہین

تپاک اے دل جو ہے سوز نہان مین یہ دل سوزی کہان ہر مہربان مین
مری چپ کا سبب عشق بتان ہین نپوچھو آ نہین سکتا بیان مین
ہوئی نذر اسکی تیر نیم کش کی جو کچھ باقی تھی جان اس نیم جان مین
جلالی اس مست سے چلتا ہو ساغر کہان وہ رات دور آسمان مین

وہ ہم ہین سوختہ قسمت کہ شعلہ رویون مین لگی بجھانے جب آتے ہین جل کے جاتے ہین
مجھ سے کہتی ہے یہ اک وعدہ فراموش کی یاد دیکھ یون دل سے دو عالم کو بھلا دیتے ہین
جذب دل کھینچ نہ لے جائے اس اندیشے سے ہم اُن کی تصویر کو پہلو سے ہٹا دیتے ہین

بعض اور قرائن سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہون نے خصوصیت کے ساتھ میر کے کلام کو پیش نظر رکھا ہے

اور اُن کے مضامین ان کے دل و دماغ مین بہ شدت سرایت کر گئے ہین مثلاً میر کی ایک غزل کے دو شعر ہین

باؤلے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار — عقل کی باتین کیان کیا ہم سے نادانی ہوئی
چاہ کر اس بیوفا کو آخر اپنی جان دی — دوستی اوس کی ہماری دشمن جانی ہوئی

اور حکیم جلال نے خفیف سے تغیر کے ساتھ میر کے دونون آخری مصرعون کو لے لیا ہے اور اپنے حسن بندش سے اوسکو ترقی دی ہے ۔

بعد ترک عشق کے کیسی پشیمانی ہوئی — عقل کا کہنا کیا کیا ہم سے نادانی ہوئی
لے جل شوق وصال یار نے مارا جلال — دوستی آخر کبھی کی دشمن جانی ہوئی

ایک اور قرینہ یہ ہے کہ میر نے تمام صنائع و بدائع مین صنعت اضداد کا اکثر استعمال کیا ہے مثلاً

بدتر ہی ہو پوچھو ہون تجھی سے طبیب — ہے ہوا کوئی بھی اس درد کا بیمار ہنوز

لائی تری گلی تک آوارگی ہماری — ذلت کی اپنی اب ہم عزت کیا کرین گے

ایک سب آگ ایک سب پانی — دیدہ و دل عذاب ہین دونون

نقصان ہوگا اس مین نہ ظاہر کہان تلک — ہوئین گے جس زمانے کے صاحب کمال ہم

اور حکیم جلال نے بھی اس صنعت کو اس کثرت سے برتا ہے کہ ان کی کوئی غزل بمشکل اس سے خالی ہے مثلاً

مجھے دیکے ذلت وہ محفل مین اپنی — معزز کرین گے گرامی کرین گے
محبت مین دیکھ تجھے جان شیرین — بہت یاد اے تلخکامی کرین گے
کہ ہر خاص چشم عنایت ہے اُنکی — بھلا کیا تمیز اس کی عامی کرین گے
خریدار اُن کے بہت گو ہین کم سن — وہ بکتے ہین یوسف کے مولون ابھی

خواہشِ روزِ وصال آتی ہمارے آگے ‏ ‏ پڑ گئی پیچھے بلائے شبِ فرقت کیسی
عشق میں یوں بھی رہا ہے کوئی ناکام کبھی ‏ ‏ بچ تک وہ ہمیں دیتے نہیں حسرت کیسی
اللہ اللہ مرے کینے کا اظہار ایسا ‏ ‏ اور دشمن کی چھپاتے ہو محبت کیسی
شرارت یہ اس بت میں کچھ آگئی ‏ ‏ کہ شوخی بھی واللہ شرما گئی
جو ہو رگِ جان سے بھی قریب اُس سے یہ دوری ‏ ‏ حیرت میں ہے دل تم سے جدا دیکھ کے مجھکو

بہرحال وہ اس رنگ کو اختیار کرکے لکھنؤ کے اسکول سے الگ ہو کر دلی کے اسکول میں داخل ہو گئے چنانچہ تذکرہ بزم سخن میں ہے۔

"پیشتر سخن بروشِ لکھنوی گفت الحال بہ طرزِ دلی فکر می نماید"

اور ان معنوی خصوصیتوں کے ساتھ دلی کی تمام ادائیں اُن میں آگئیں۔ مثلاً ناسخ و آتش کے زمانہ سے لکھنؤ میں مسلسل گوئی کا جو رواج ہوا۔ اوس کو متاخرین کے دور میں امیر اور منیر وغیرہ نے قایم رکھا۔ اور دوغزلہ، سہ غزلہ، بلکہ چوغزلے تک لکھنے پر بھی قناعت نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل قصیدہ بن گئی۔ اور ہر قسم کے رطب و یابس مضامین ان میں بار پا گئے۔ لیکن قدما کی تقلید میں اساتذۂ دلی ہر طرح میں صرف ایک غزل لکھتے تھے۔ اور اوس کے اشعار کی تعداد بھی محدود ہوتی تھی۔ جلال مرحوم بھی اس معاملہ میں قدما ہی کے متبع ہیں اور اُن کی غزلیں بھی شعرائے دلی کے طرز پر اکثر مختصر ہوتی ہیں۔ اور اشعار کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور اگر کبھی طویل غزلیں لکھتے بھی ہیں تو دوغزلہ سے آگے نہیں بڑھتے۔ اور اس کے اشعار کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں ہوتی۔

یہاں تک جو بحث تھی وہ اصولی حیثیت سے تھی۔ یعنی یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اگرچہ حکیم جلال لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ ہی میں رہے۔ لکھنؤ ہی میں شاعرانہ تربیت پائی۔ اور لکھنؤ ہی کی خاک کو ان کے مدفن بننے کا بھی شرف حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے محض اپنے ذوق سلیم سے لکھنؤ کے مبتذل شاعرانہ رنگ کو چھوڑ کر قدما اور قدما میں بھی میر کی یا کم از کم شعرائے دلی کی روش اختیار کی لیکن اب ہم ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) قدما نے عموماً اور میر صاحب نے خصوصاً تغزل کا رنگ اختیار کیا تھا۔ لیکن اس دور کے بعد انشا و جرأت نے معاملہ بندی کی ابتدا کی اور اسی کے بعد لکھنؤ کی اصلی شاعری کا دور شروع ہوا۔ اس لئے قدرتی طور پر ان لوگوں نے معاملہ بندی اور وقوعہ گوئی کو اپنا شعار بنا لیا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے نہایت سخت بازاری روش اختیار کر لی۔ حکیم جلال نے بھی انہی شعرا کی آغوش میں تربیت پائی تھی لیکن تاہم انہوں نے اس روش سے الگ ہو کر تغزل کا رنگ اختیار کیا۔ اور اس میں نہایت متین، با وقار اور سنجیدہ اشعار لکھے۔ مثلاً

اب تک ہیں شوقِ یار میں آنکھیں کھلی ہوئیں
مر کر بھی ہیں مزار میں آنکھیں کھلی ہوئیں

حسرت یہ ہے کہ اڑ کے پڑے اس گلی کی خاک
رکھتا ہوں کوئے یار میں آنکھیں کھلی ہوئیں

بے دیکھے اس کے دم کا نکلنا محال ہے
کہتی ہیں احتضار میں آنکھیں کھلی ہوئیں

اس مہ کے انتظار میں ہم ہیں شب فراق
اور مژگان تار میں آنکھیں کھلی ہوئیں

تو لاکھ چاہے ہونگی نہ تا حشر اے اجل
بند اس کے انتظار میں آنکھیں کھلی ہوئیں

(۲) لیکن انہوں نے اس رنگ کو معاملہ بندی اور ادا بندی کے ساتھ بھی مخلوط کر لیا ہے۔ اس لئے دلی کے ساتھ لکھنؤ کی شان بھی قایم رکھی البتہ فرق یہ ہے کہ معاملہ کے اشعار میں بھی انہوں نے بازاری روش سے احتراز کیا ہے مثلاً

کیا یاد آ رہی ہیں کسی شوخ مست کی
کچھ بند کچھ خمار میں آنکھیں کھلی ہوئیں

فتنے شبِ وصال جگا یا کیں رات بھر
کیا خوابِ نازِ یار میں آنکھیں کھلی ہوئیں

کیفیتیں دکھا گئیں انکی شبِ وصال
وہ نیند کے خمار میں آنکھیں کھلی ہوئیں

پھر کفن تم اپنا دو پٹہ تو دے چلے
چادر ہی دو کہ قبر کا وہ شامیانہ ہو

گلے کو ملاتی ہیں دلکش صدائیں
سنا ہے تم نہایت خوش گلو ہو

نہ بچا بی ہی رہے وصل میں کہتا ہے یہ کون؟
جب محل شرم کا آ جائے تو شرماؤ بھی

لیکن اُن کے کلام مین اس قسم کے اشعار خال خال پائے جاتے ہین۔ ورنہ ان کا عام رنگ ا
اور شعرائے دلی کا متغزلانہ رنگ ہے۔

(۳) اس رنگ کے لئے انہون نے زبان بھی نہایت لوچدار پائی ہے۔ اگرچہ مرزا داغ کی
مین بھی روانی و برجستگی بہت پائی جاتی ہے۔ لیکن جو نرمی، لطافت، شیرینی، اور لوچ، حکیم مہ
کی زبان مین پایا جاتا ہے وہ ان کے معاصرین مین کسی کی زبان مین نہین پایا جاتا۔ مثلاً

عرض مطلب مین شان جاتی ہے   بات ملے مہربان جاتی ہے
عشق مین آن بان جاتی ہے   آن جاتی ہے شان جاتی ہے
ہمروقت ہے پوری مرگِ فراق   چھوڑ کر نیم جان جاتی ہے
بات تو کرنے دے ہمین اے ضبط   کام ہی سے زبان جاتی ہے
شب وصل اسکی دیکھین اپنے بعد   کس کے گہر مہان جاتی ہے
روحِ عاشق ہی اسکے کوچہ کی   خاک آکے چہان جاتی ہے
مجھکو ذلت نہ دیجئے سرِ بزم   سوچئے کس کی شان جاتی ہے
لاکھ وہ چشم شوخ ہے خودرائی   دل جو کہتا ہے مان جاتی ہے
شکوہ جور و ستم کا اُسکے جلال   دیکھئے آن بان جاتی ہے

(۴) حسن بندش اور حسن بندش کے ساتھ اس حیثیت سے ان کے کلام مین اس قدر ہمواری پا
ہے کہ تمام اشعار ایک ہی سانچے مین ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہین۔ مثلاً

یاد آکے ترے ہجر مین سمجھائیگی کس کو   دل ہی نہین سینے مین تو بہلائیگی کس کو
دم کہنچتا ہے کیون آج یہ رگ رگ سے ہمارا   کیا جانئے ادہر دل کی کشش لائیگی کس کو
جب مار ہی ڈالا ہمین بیتابی دل نے   کروٹ شب فرقت مین بدلوائیگی کس کو
مرجائینگے بے موت غم ہجر کے مارے   آئیگی تو اب زندہ اجل پائیگی کس کو
مدفن نہ اگر ہوگا سر راہ ہمارا   اٹھلیکی چال آپ کی ٹھکرائیگی کس کو

اچھا رہے تصویر کسی کی مرے دل پر — کمبخت نہ ٹھیرے گا تو ٹھہرائیگی کسکو
کچھ بیٹھ گیا دل ہی یہاں بیٹھ کے ہنا — غیرت تری محفل سے اب اٹھوائیگی کسکو
اس وعدہ خلافی نے اگر جان ہی لے لی — پھر جھوٹی تسلی تری تڑپائیگی کسکو

کیون لینگے جلال آکے مرے دل مین وہ چٹکی
جھپکیگی پلک کا ہیکو نیند آئیگی کس کو

(۵) غزل کا اصلی عنصر اگرچہ صرف عشق و محبت کے جذبات ہین لیکن رفتہ رفتہ اس مین رندی۔ سرمستی۔ تصوف و اخلاق وغیرہ کے مضامین بھی شامل ہوگئے۔ اور اب وہ غزل کا لازمی جزو خیال کئے جاتے ہین لیکن حکیم صاحب کا کلام چونکہ اول سے آخر تک صرف عاشقانہ ہے اس لئے اس مین شراب کباب اور تصوف و اخلاق کے مضامین بہت کم پائے جاتے ہین۔ اور اس لحاظ سے اساتذۂ متاخرین مین حکیم صاحب سے زیادہ کسی کا کلام مہذب، شائستہ۔ اور بے ہیل نہین ہے۔ لیکن باینہمہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زمانے نے حکیم صاحب کی قدردانی کماحقہ نہین کی۔ کچھ توان کے غیر معتدل فخر و غرور نے ان کو عام نگاہون سے گرادیا۔ اور کچھ بے سروسامانی نے ان کو داغ و امیر کی طرح چمکنے کا موقع نہین دیا۔ اور انہون نے زبان حال سے یہ شعر پڑھتے ہوئے ؎

ہوئی نہ قدر کبھی یہ ملال لے کے چلے
لحد مین ساتھ ہم اپنا کمال لے کے چلے

ہمکو عاشقانہ شاعری کا بہترین سرمایہ عطا فرما کر غایت غربت و مسکینت کے عالم مین وفات پائی۔ لیکن باینہمہ لکھنو اب تک اونکی ذات پر ناز کرتا ہے۔

غزل

مری ہستی تھی برق و باد کی صورت زمانے مین | نہ آنے ہی تھا آنے مین نہ جانا ہی تھا جانے مین
غم فردا و فکر دوش کی آفت سے درگذرا | جو ممکن ہو تو خود ہی محو ہو جاؤن زمانے مین
تواضع برق و باران کی الٰہی کس طرح ہوگی | کہ اب تو ایک تنکا ہی نہین ہے آشیانے مین
مجھے آتا ہے رونا اشکِ غم کی نارسائی پر | ہزارون آفتین ہین آنکھ سے دامن تک آنے مین
یہ کلیان دامنِ عبرت مین ہنستی ہین کہ روتی ہین | مجھے شعلے نظر آتے ہین ان کے مسکرانے مین
جو دل کا خون بنکر چشم گریان سے ٹپکتے ہین | نہین معلوم کتنی حسرتین ہونگی زمانے مین
وہی صورت وہی جلوے وہی انداز دیکھینگے | وہ کھو جائین نہ خود آکر کہین آئینہ خانے مین
فقط اک آرزو اور وہ بھی صرف رنج حرمان ہو | الٰہی کیا یہی انصاف باقی ہے زمانے مین
دلِ درد آشنا کی ہستی ہی کیا تھی مگر دیکھو | یہ کاوش عشق کی اک قطرۂ خون کے مٹانے مین

اگر سچا ہے دعویٰ انقلابِ دہر کا ھادی
مری محرومیٔ قسمت بھی شامل ہے زمانے مین

(ہادی مچھلی شہری)

آہنگ مستقبل

(منظر سیمابی صدیقی۔ اکبرآبادی)

موت آئیگی ٹھہرنا کہانی ہوکر | مٹ جائینگے سب نقوش فانی ہوکر
خورشید قیامت کا جو نکلا منظر | بہہ جائینگے آسمان پانی ہوکر
انسان یکین بزمِ فانی ہوکر | مغرور ہے صرف خوش بیانی ہوکر
دنیا مین رہے گا نہ کوئی اے منظر | دنیا رہ جائیگی کہانی ہوکر

زندگی کیونکر کامیاب بنائی جاسکتی ہے

(از محمد اسمٰعیل صاحب ہاتف - بھوپالی)

اکثر نوجوان باوجود قابلیت وکوشش اکثر کامون مین ناکام رہتے ہین۔ اس کے وجوہ نفس پر قابو نہ رکھنا۔ غیر ضروری شر پھیلانا۔ مردم گریزی۔ اور حد سے زیادہ خود داری یعنی غرور ہین جس شخص مین یہ کمزوریان ہوتی ہین۔ وہ اس سبب سے کہ ان وآن کا نشانہ بنے کسی الجھنا نہین چاہتا۔ اور بجائے حرکت یعنی زندگی کے سکوت یعنی موت کو اپنی حالت پر طاری کرلیتا ہے۔

مسٹر (و۔ ل۔ جارج) جو انگریزی زبان کے زبردست ادیب اور ماہر مالیات ہین ابتدا مین انہین نقائص کا شکار تھے۔ اور بعد مین طرح طرح کے تجربون اور مشاہدون کی بنا پر نقائص دور کرنے مین کامیاب ہوئے۔ حال مین انہون نے ایک مضمون مین ان برائیون سے بچنے اور رہائی پانے کی تدابیر بتائی ہین۔ ہم یہان بعض اہم مقامات کا ترجمہ درج کرتے ہین۔

”مین ۲۲ برس کی عمر مین بڑا خود بین اور زبون احساس تھا۔ چاہتا تھا کہ میری ہر بات اور ہر رائے سامعین بلا عذر وحجت مان لین۔ ہر جنرل کو لڑائی کے متعلق مشورہ دینا۔ ہر دولت مند کو ملیون روپے جمع کرنے کا سبق پڑھانا اور ہر پاکدامن خانم کو اس کی کمزوریون پر متنبہ کرنا گویا میرا فرض مین تہا۔

۱۹۰۲ء مین میری ایک فلاسفر سے ملاقات ہوئی حسب عادت اس کے سامنے بھی مین نے ہمہ دانی کا اظہار کیا۔ اس نے کسی قدر ناک بھون چڑھا کر کہا۔ بس بس جناب معلوم ہو گیا بیشک آپ معراج کمال پہ پہونچے ہوئے اور ہر فن مولا ہین۔ مجھپر اس مضحکہ خیز فقرہ کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ مین نے جلوت کی زندگی سے قطعی کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اور شر پھیلانے اور مردم گریزی مین یہان تک بڑھ گئے کہ مین ”استانی رقص“ مین جہان عورتین مردون کے ساتھ مصروف

رقص ہوتی ہیں ہیں اپنے ہاتھ۔ پیر ڈھیلے چھوڑ کر نظریں نیچی کئے مارے شرم کے الگ بیٹھ رہنا۔ اور اپنی رفیقۂ رقص کے پیہم بلانے پر بھی اس کے پاس نہ جاتا۔ اور میں حیران رہ جاتا تھا کہ اب کیا کروں آخرت خلوت نشینی سے فائدہ اٹھا کر میں نے دماغ سوزی اور جگر کاوی کے ساتھ ایک کتاب لکھی اور ایک طابع کے پاس نقد معاوضہ لے کر کتاب چھپوانے کو پہونچا۔ لیکن شرمیلے پن کی بے تکی عادت نے اساس موضوع ہی بھلا دیا۔ اور کتاب کی خوبی، عمدگی، اور ضرورت و اہمیت کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ اور پبلشر کے ساتھ کھل کر بات چیت نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے میری لایعنی اور بے معنی باتوں سے اُکتا کر ٹکا سا جواب دے دیا کہ "ہم یہ مسودہ نہیں چھاپ سکتے" یہ خلاف مرضی و توقع جواب پانے پر اپنا سا منہ لیکر میں اس کے پاس سے لوٹا راستہ بھر دل ہی دل میں اپنی فروگذاشتوں کو سوچتا جاتا تھا کہ میں نے اچھی طرح باتیں نہیں کیں۔ اور اپنے مفہوم و مطلب کو ذہن نشین کُن پیرایہ میں ادا نہیں کیا۔ اور طابع کی دقتِ نظر کو طلب نہ کر سکا۔ آخر بہت دن تک اپنے نقائص اظہار پر غور کرنے کے بعد میں پھر ایک دن اسی طابع کے پاس پہونچا۔ اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسی کتاب کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور اس کے موضوع کی اہمیت پہلے سے مفصل طور پر اس کے ذہن نشین کی۔ یہ سنکر طابع نے چھوٹتے ہی کہا: بھئی واہ آپ بھی خوب ہیں یہ باتیں آپ نے اُسی دن کیوں نہ کہیں؟ افسوس اب تک تو آپ کی کتاب کبھی کی چھپ گئی ہوتی" غرض میں ہمیشہ اسی طرح غیر ضروری جلد بازی سے اپنے کام الجھن میں پھنسا لیتا تھا۔

مجھ میں ایک عیب یہ بھی تھا کہ دوستوں اور ملاقاتیوں کی ہر مجلس میں میں کبھی دوسروں کی باتیں سننا نہیں چاہتا تھا۔ میری خواہش ہوتی تھی کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک سب میری باتیں کان لگا کر سنتے رہیں میرا ہر خیال چاہے وہ کتنا ہی بودا، پھسپھسا، لچر اور لغو ہو شرفِ قبولیت حاصل کرے اور ہر رائے اچھی سمجھکر مان ہی لی جائے۔ میرے اس تکلیف دہ طرز عمل سے تنگ آکر آخر ایک بے تکلف دوست نے کہہ مارا کہ "مسٹر جارج آپ تو یہی چاہتے ہیں کہ تمام باتیں آپ ہی کرتے رہیں۔ اور دوسرے قوت ناطقہ سے مستغنی ہو کر آپ کی اُوٹ پٹانگ باتیں

سنتے رہین ۔ مجھ پر اس زہر خند کا بڑا اثر ہوا میری آنکھین کھلین اور مین نے اپنے نفس کو بڑی ملامت کی۔ اور مین سمجھ گیا کہ ابھی نتیجۂ مطلوب حاصل نہین ہوا ہے ۔ اس لئے قوی عزم کیساتھ ان ناگوار حالات کے دور کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ چنانچہ سب سے پہلے شرمیلا پن دور کرنے کی کوشش کی۔ اور مجھے تحقیق و تدقیق سے معلوم ہوا کہ مردم گریز اور شرمیلے لوگون کی تین قسمین ہوتی ہین۔ پہلی قسم مین وہ لوگ شامل ہین جو مچھلی کی طرح خاموش اور بے زبان ہوتے ہین۔

دوسری قسم مین وہ تمام بکی لوگ داخل ہوتے ہین جنکی بکواس اور چرچر مسلسل اور متصل ہوتی ہے ۔ سننے والا ہمہ تن منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی کبھی گفتگو مین ذرا سا فصل پیدا ہو تو مین باتین شروع کرون ۔ مگر غریب کو ایسا موقع میسر ہی نہین آتا ۔ تیسری قسم دونون قسمون سے بھی بدتر ہے ۔ اس کی تعریف مین وہ لوگ ہوتے ہین جو اپنی مجوبیت چھپانے کو کبر، غرور، نخوت و دنائت ۔ ڈانٹ ڈپٹ ۔ تخفیف و توہین سخت کلامی اور درشت زبانی سے کام لیتے ہین اور چاہتے ہین کہ ہمارا اختیار و اقتدار مانین کر تمام لوگ اپنی بے عیبی، بے عزتی، مجبوری اور بے علمی کا زبان حال سے اعلان کر دین۔ مجھ مین ہر سہ اقسام کے اشخاص کی برائیان مجتمع تھین جو میری جبلت (کیرکٹر) کے سفید دامن پر کالا دھبہ نظر آتی تھین ۔ آخر تنہائی مین بہت دنون سوچ بچار کے بعد چند تدابیر کا علم ہوا ۔ جن پر عمل کر کے مین اس ذلیل عادت سے مخلصی پا سکا ۔

یہ تو آپ کا بھی تجربہ ہوگا کہ جب کبھی آپ کسی بڑی تجارت گاہ مین جاتے ہین تو وہان ملازمہ خادمہ اور بیچنے کی خدمت پر متعین خوبصورت حسین و جمیل اور نوجوان عورتین نظر آتی ہین جو نہایت قیمتی ریشمی اور نازک لباس پہنے رنگا رنگ کی زینت و تجمل کے ساتھ خریدارون کو مجذوب و مسلوب کرنے کا کام کرتی اور ایسی محبت بھری تیز نظرین ڈالتی ہین کہ انسان مبہوت مجوب اور ہکا بکا رہجاتا ہے ۔ اور اس کے خون مین ہیجان پیدا ہو جاتا ہے ۔ انہی باتون کو سوچ کر مین کبھی کسی تجارتی کوٹھی مین نہین جاتا تھا اور کیسی ہی ضرورت ہو یا احباب کتنا ہی مجبور کرین مین ہمیشہ ہچکچاتا اور گھبراتا تھا ۔ لیکن مین نے ان حالات پر غالب آنے کے لئے بے ضرورت بھی ایسے مواقع پر جانے کی ٹھانی ۔

ایک بڑا تجارت خانہ میرے مکان کے قریب ہی تھا۔ مین نے سویرے سے جبکہ ایک بھی خریدار نہ آنے پائے کسی معمولی چیز مثلاً کھلونا خریدنے کے بہانے سے وہان جانا شروع کیا اور دختران ستخدمہ کے سامنے سے گذر کر جو سب کی سب دلربا، متحرک بجلیان، شیک، لطیف، خوشرو، خوش مو۔ خوش گواور ہنس مکھ تھین انتہائی بے اعتنائی اور بے پروائی کے ساتھ وہ چیز خرید کر لوٹتا۔

اس کارگر تدبیر سے میرا غیر ضروری شرمیلاپن مجروح اور منہزم ہونے لگا۔ میرا یہ اقدام تین شقون سے مرکب تھا۔ اول یہ کہ گوناگون بجلی کی طرح تیز نظرون کے سامنے بے پروا چلنا دوسرے نوجوان ہونے کے باوجود بچون کا کھلونا خریدنے کھلونا بیچنے والون کے پاس جانا۔ تیسرے دو چار سوٹ خریدنے کو نہین بلکہ نہایت حقیر اور معمولی چیز مول لینے کو اتنے بڑے مغازہ (مسگزین) مین جانا۔ جس کی قیمت آٹھ آنہ بارہ آنے سے زیادہ نہین ہوتی تھی۔

مگر پہلے دن جب مین تجارتی کوٹھی مین داخل ہوا تو ماحول سے اتنا متاثر اور افتادہ ہوگیا تھا کہ گویا میرے حواس معطل، اعصاب شل، اور دماغ مختل ہوگیا ہے۔ اور مجھے انتہا درجہ کی تکان، بوجھ اور گرانی محسوس ہوتی تھی۔ مگر آزادانہ روزانہ جانے کی مشق سے رفتہ رفتہ موانعات اور رکاوٹون مین کمی معلوم ہونے لگی۔ اور خدا خدا کر کے اپنے عمل سے اس قابل ہوگیا کہ خوبصورت اور نوجوان لڑکیون کے مسکراتے ہوئے نازک ہونٹون اور محبت آمیز نگاہون کی ذرہ برابر پرواہ نہین کرتا تھا۔ بلکہ ان کے جواب مین برابر اُن کی آنکھون سے آنکھین لڑاتا اور نیم خندہ ہوتا تھا جس سے گویا انکی تسکین ہوتی تھی

اوپر مین مجلس رقص مین اپنے شرمیلے پن کا واقعہ ذکر کر چکا ہون واقعی مین اس موقع پر چند منٹ تک ایک کونے مین اس طرح بے حس و حرکت کھڑا رہتا تھا کہ رفیقۂ رقص کو بھی نہین بلا سکتا تھا۔ اور نہ اُس کے بلانے پر اُس کے پاس جاتا تھا۔ مگر بعد مین رفتہ رفتہ یہ حالت دور ہوئی اور یہان تک نوبت پہونچی کہ ناچ گھر کے بڑے کمرے مین آزادانہ راہ چلتا۔ اور انتہائی بے پروائی سے اپنے جوتے کے بند عین ناچ گاہ ہی مین باندھتا تھا۔

میرا لباس گو قیافۃً بھی منظم و مرتب حالت مین نہ تھا۔ اور جہانی (پارٹی) کی بعض مجالس

مین ڈرتا اور گھبراتا تھا۔ ایک دن ایک مہمان نے خدمت گار سمجھ کر مجھے حکم دیا کہ "میرے لئے ایک فنجان چار لاؤ" مین نے اس مرض کا اس طرح علاج کیا کہ روزانہ بڑے مہمانخانہ [illegible] ا با اور کسی مہمان خانہ مین جا بیٹھتا اور ایک فنجان قہوہ بے قیمت ملنے تک بیٹھا رہتا کبھی آس پاس کے لوگ میرے متعلق آپس مین بات چیت کرتے کہ "یہ بیچارہ بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔ روپیہ نہ ہونے سے شمیین کا پیک نہین پی سکتا۔ اس لئے غریب قہوہ ہی پی لیتا ہے" اس گفتگو سے متاثر ہو کر مین نے کئی بار انہین تیکھی اور کڑی نظرون سے گھورا کہ وہ لوگ جھینپ اور سہم گئے۔ اور پھر جسارت نہ کر سکے۔

غرض اسی قسم کی لگاتار کوششون سے بتدریج مین اپنے نفس پر فرمانروا ہو گیا مجھ سے غیر ضروری شرم دور ہو گئی۔ اور اس قابل ہو گیا کہ ہزارون آدمیون کے مجمع مین تقریر کر سکون اور لیکچر دے سکون۔

اس نوبت پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ہر چند مجھ سے تمام برائیان دور ہو گئی ہین لیکن ابھی ایک زبردست بات حاصل نہین ہوئی۔ جو ہر قسم کی کامیابی حاصل کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز ہے اور وہ یہ کہ اعتدال وادراک کے ساتھ ہمہ وقت اپنی آپ کی نگہداری کرنا۔ یعنی جس ضرورت کے لئے کسی سے باتین کرین پہلے اس کے موضوع کو ایک نوع پر دماغ مین جمع کرین ...... اور پھر اس امر پر غور کرین کہ یہ موضوع مخاطب پر کیا تاثیر کرے گا۔ اور ہمین کس اسلوب اور انداز اور پیرایہ مین بولنا چاہئے۔ تاکہ مطلب حاصل ہو۔ اس عمل پر قادر نہ ہونے سے میرے بہت سے سودمند کام غیر ضروری عجز وانکسار، بلاوجہ کی شتاب کاری، بیجا مدح وثنا اور ناجایز خوشامد وچاپلوسی کی بنا پر برباد وخراب ہو گئے۔ اور فرصت فوت ہو گئی۔

بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہین جو کسی سے کچھ مانگنے اور مطلب کہنے کے دوران مین اپنی حالت ایسی ذلیل وحقیر بنا لیتے ہین۔ جیسی اس کتے کی ہو جاتی ہے جس پر لاٹھی پڑنے والی ہو اور وہ مار دہشت کے سہم کر زمین گیر ہوا جاتا ہو۔

اکثر لوگ ایسے بھی ہوتے ہین جو کسی محکمہ مین نوکری یا کسی کارخانہ مین مزدوری کرنے جاتے

ہین تو بغیر سوچے سمجھے یا جان بوجھ کر ہر کام کرنے کی ذمہ داری لیتے اور اقرار کرتے ہین چاہے وہ کام ان سے نہ بنے یہ طریقہ شرمندہ کرنیوالا ہے۔ جو کام جس حد تک جانین اسی حد تک اظہار کرنا چاہئے۔
مین دوسری قسم کے آدمیون مین تھا۔ اسی اثنا مین ایک دن مین دوسرا مسودہ لے کر ایک اور طابع کے پاس پہونچا کہ کچھ معاوضہ لیکر چھپنے کو دیدون۔ اور اس لئے کہ طابع یہ سودا کرلے مین پانچ منٹ تک اپنے فکر و ذکاوت اور علم و مکتسبات کے متعلق باتین کرتا رہا۔ مطبع والا ڈھلے ہوئے لوہے کے بت کی طرح بدون حرکت بیٹھا ہوا میری باتین سنتا رہا۔ اور گفتگو ختم ہونے پر نہایت نرم لہجہ اور باریک آواز مین جواب دیا کہ "مسٹر جارج مین آپ کا بہت ممنون ہون لیکن اب مہربانی فرماکر تشریف لیجائیے کیونکہ آپ کی ایک بات بھی میری سمجھ مین نہین آئی۔ آخر آپکا مقصود کیا ہے!" یہ گفتگو میرے لئے تازیانۂ عبرت و بصیرت ثابت ہوئی اور بہت دیر سوچنے کے بعد آخر مین اس نتیجہ پر پہونچا کہ "انسان جب کوئی غرض و مطلب لے کر کسی کے پاس جائے تو اُسے اسطرح بیدار، ہوشیار، چوکنا، اور خبردار رہنا چاہئے۔ جیسے ایک لایق و تجربہ کار وکیل جو کسی خونی کے بچانے اور چھڑانے کو بھری عدالت مین بہر صورت پوری طاقت کے ساتھ مستعد اور آمادہ رہتا ہے۔ اور موکل کی مدافعت مین کوئی کسر اور کوئی دقیقہ اُٹھا نہین رکھتا۔ جو بات کہی نپی تلی، جچی، سلجھی ہوئی۔ حسیات شخصی اور خود بینی مطلق دور کردے۔ اور صرف اصلی اور ضروری مطالب مجمل اور موثر طور پر ازروئے عقل و حکمت مخاطب کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرے۔

عام پابندئے اوقات اور وقت کا بیجا صرف بھی انسان کو اپنے نفس پر حاکم نہین ہونے دیتا اور تجربہ نے یہ بات بھی سکھادی ہے کہ جو انسان اپنے کامون کے لئے اوقات معین نہین کرتا تو بغیر جانے اور سمجھے ہوئے وقت کا خون کرتا رہتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا مگر یہ عادت ایک لڑکی نے چھڑائی۔ قیام نیویارک کے دوران مین ایک حسین و جمیل لڑکی بدھ کے دن میرے ناخن کاٹنے آتی تھی۔ مین سال بھر تک ٹھہرا رہا۔ مگر ایک مرتبہ سے زیادہ یہ واقعہ پیش نہیں آیا کہ یہ لڑکی جس وقت اور منٹ پر آتی تھی اُس سے ذرا پچھلی ہو۔ مجھے اُس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا

کہ وہ روزانہ سینکڑون لوگون کے مکان پر اسی ترتیب اور قاعدہ سے جاتی ہے۔ اور اس مین کبھی فرق نہین پڑتا۔ مین یہ حقیقت معلوم کر کے حیران رہ گیا۔ اور مین نے بھی اپنے تمام کامون کے لئے اوقات مقرر کر کے پابندی کی کوشش کی۔

رنگ مجاز

(مشاعرۂ بمبئی کی ایک غزل)

(از منیر الہ آبادی)

مصرع طرح:- آج سناٹا پڑا ہے خانۂ زنجیر مین

دل سے جب فریاد کی یاد بت بے پیر مین ۔۔۔ جو صدا نکلی وہ نکلی ڈوب کر تاثیر مین
چل بسا وحشی تراشا ید سوئے ملک عدم ۔۔۔ آج سناٹا پڑا ہے خانۂ زنجیر مین
راز یہ اب تک نہ کوئی فلسفی حل کر سکا ۔۔۔ جلوہ فرما کون ہے اس خاک کی تصویر مین
درد کہتے ہین جسے دونون مین وہ جوہر نہین ۔۔۔ اُنکے سنگین دل مین میری آہ بے تاثیر مین
تجھ پہ ہوتے ہم فدا کیون شمع و پروانہ وار ۔۔۔ گر کشش ہوتی نہ تیرے حسن عالمگیر مین
دفن کر کے مجھکو فرمایا کہ سو جا! چین سے ۔۔۔ آج سب کچھ ہو چکا لکھا تھا جو تقدیر مین
مرنیوالا حسرت دیدار لیکر چل بسا ۔۔۔ موت کی تعجیل مین اور آپ کی تاخیر مین

ہو سکا تم سے نہ کار آخرت کچھ ہی منیر
عمر بھر الجھے رہے دنیا کی دار و گیر مین

نازنین جاسوس

(از مولانا فطرت۔ انصاری)

باب ۲ دوم

(گذشتہ سے پیوستہ)

قریب کی سڑک پر ایک ٹیکسی جارہی تھی۔ خاتون نے نہایت احتیاط سے اس موٹر ڈرائیور کو ٹھہر جانے کا اشارہ کیا ـــــ موٹر ٹہر گئی اور خاتون اُس مین بیٹھ گئی ـــ بیٹھتے ہی خاتون نے موٹر ڈرائیور کے کان مین کچھ کہا۔ اور موٹر شمالی جانب کو ہوا ہو گئی۔ .... چارلس کے اوسان خطا ہو گئے۔ چارلس نے دیکھا کہ اب یہ خاتون ہاتھہ سے نکل گئی۔ .... چارلس ہکا بکا سا ہو کر ٹہر گیا۔ ابھی اسکو ٹہیرے ہوئے ایک منٹ بھی نہین گذرا ہوگا کہ پاس سے ایک اور خالی موٹر گذری ...... چارلس نے فوراً اُسے ٹہیرایا اور اس مین سوار ہو کر ڈرائور کو سامنے کی موٹر کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔ .... خاتون کی موٹر پہلے تو ریجنٹ روڈ کی طرف گئی لیکن فوراً ہی واپس پلٹی ...... مگر واپسی کا راستہ وہ نہین تہا جس پر گئی تھی۔ ...... چارلس نے ڈرائور سے رفتار تیز کر دینے کو کہا اور اب چارلس کی موٹر خاتون کی موٹر کے بالکل قریب پہونچ گئی۔ ...... جاتے جاتے خاتون کی موٹر ایک مکان کے پاس رک گئی چارلس نے اپنی موٹر کی رفتار دہیمی کروادی۔ ...... وہ خاتون موٹر سے اتری اور ادہر ادہر دیکھ کر سڑک کے موڑ کی طرف دوڑی۔ چارلس نے یہان پہلی مرتبہ اس عورت کے قدوقامت کو اچھی طرح دیکھا ...... سڑک کو طے کر کے خاتون موصوفہ ایک چار منزلہ مکان مین داخل ہو گئی۔ چارلس بھی ڈرائور کو چار جزدے دوا کر پیچھے ہو لیا۔ خاتون تو اس مکان کا زینہ طے کرنے مین مصروف ہو گئی اور چارلس اس مکان کے دروازے مین داخل ہوتے ہی اس کے زینے کے نیچے ہی دبک گیا۔ اور خاتون کے قدمون کی آواز سے اس امر کا اندازہ کرتا رہا کہ یہ جاتی کونسی منزل پر ہے ...... اس نے محسوس کیا کہ وہ

بالائی منزل پر گئی ہے...... اور ساتھ ہی اسکو تالے میں کنجی کے ڈالنے اور قفل کے کھولنے کی آواز بھی سنائی دی...... دروازہ کے کھلنے اور پھر بند ہو جانے کا بھی اندازہ اس نے لگایا...... اور اب معلوم ہوا پورے مکان میں سکون سا ہو گیا ہے۔

باب ۳ سوئم

دروازہ بند!

چارلس اب اپنی کمین گاہ سے نکلا اور پولے پولے قدم رکھتا ہوا نہایت احتیاط سے چوتھے مالے پر پہونچ گیا۔ رات کا وقت! ۲ بجے کا عمل!! اجنبی آدمی!!! اسپر چاروں طرف سے اندھیرا چارلس پہلے تو حیران ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد دروازے کی دراڑ سے روشنی کی جھلک معلوم ہوئی اس روشنی کی مدد سے وہ چپکے چپکے دروازہ کے پاس گیا اور چٹخنی کو پکڑ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا...... دروازہ کھولنے کی کوشش بیکار رہی.. .. اسے معلوم ہو گیا کہ دروازہ اندر سے مقفل ہے.... چارلس کو اسی اثناء میں کمرہ کے اندر سے خاتون کی نقل و حرکت کی آواز آتی رہی...... لیکن دروازہ کھلنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آخر اسکی نظر ایک کھڑکی پر پڑی جو دروازہ کے اوپر تھی۔ چارلس اس پر چڑھنے کے لئے اُچکا اور اچھل کر رہ گیا۔ کیونکہ کھڑکی میں لوہے کی مضبوط اور تیز سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ آخر چارلس اس مرتبہ بھی یہ کہکر خاموش ہو رہا کہ "افسوس اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی......" لیکن چارلس اس سے بد دل نہوا اور اپنی کوشش برابر جاری رکھی۔ کھڑکی لوہے کی سلاخوں سے بند تھی۔ چارلس نے ایک سلاخ پکڑ کر ہلائی تو اتفاق کہئے یا اوسکی رستی کی بدولت وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ اس سے اسکی ہمت اور بڑھ گئی۔ اور سلاخ کے دوسرے سرے کو بھی نہایت زور سے ہلانا شروع کیا۔ غرضکہ چارلس کو محنت اور وقت تو کافی صرف

کرنا پڑا لیکن ایک سلاخ کے نکال لینے مین کامیاب ہوگیا۔ چارلس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ اس تنہائی اور بےکسی کے عالم مین اب وہ لوہے کی ایک سلاخ سے بھی مسلح ہوگیا......'

سلاخ نکالکر چارلس دروازہ کی طرف بڑھا اور دروازہ کے دو کواڑون کے درمیانی سوراغ مین اسے ٹھونس دیا۔ اور دو تین مرتبہ خوب زور سے اِدھر اُدھر جھنجھوڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قفل کی میخین نکلنی اور تالے کے جوڑ تڑ تڑ ٹوٹنے لگے۔ تالے کا ٹوٹنا تھا کہ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ اور چارلس کا دل دھڑکنے لگا۔ اب وہ خوف کے مارے اس کھلے ہوئے دروازہ کے سامنے چپ کھڑا ہوگیا۔ اور سوچنے لگا کہ کہین اندر والون نے تو اسکی آواز نہین سنی۔ چارلس نے دل مین اپنے کام کی خطرناکی کو محسوس کیا اور کہنے لگا کہ "رات کے وقت اور پھر تنہا ایک اجنبی جگہ مین قفل توڑنا یقیناً مصائب و مشکلات کا ایک نیا باب کھول دے گا۔ مجھ جیسے شریف الطبع انسان کے یہ کام نہین ہوا کرتے۔ یہ تو چورون اور ڈاکوؤن کا کام ہے۔ افسوس مین نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو اس جا مین پھنسایا.........'

اگرچہ اِن خیالات نے چارلس کو سراسیمہ بنادیا تھا تاہم وہ کمرے مین داخل ہونے کے مصمم ارادے سے باز نہ آیا۔ اور پھر بھی اندر گھسنے کی ٹھان لی۔ ابھی وہ دروازہ پر کھڑا ہی تھا کہ اس نے اندر سے کسی کھڑکی کے کھلنے کی آواز سنی۔ اور کسی کے چلنے کی آواز بھی اُسے محسوس ہوئی۔ چارلس فوراً سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی نازنین خاتون ہے جس کے تعاقب نے اس کے سامنے لوہے کو موم بنادیا ہے۔ بہرحال چارلس نے اب دروازہ پر زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اسی سلاخ کو زمین پر ٹیک کر کھڑکی تک پہونچا۔ اور کمرہ کے اندر آنکھین پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ اس مین کیا کیا چیزین رکھی ہین۔ (باقی باقی)

رباعیات

(از بدر الدین صاحب بدر۔ بمبئی)

فاعتبروا یا اولی الابصار

رکھ یاد کہ اک روز تجھے مرنا ہے
اسباب یہاں کا یہیں سب دھرنا ہے
کر کوچ کا سامان اے مسافر کہ تجھے
اس منزلِ فانی سے سفر کرنا ہے

مجرم ہے کوئی اور کوئی فریادی ہے
بربادی کہیں اور کہیں آبادی ہے
اے بدرؔ یہ دنیا کی دورنگی دیکھو
ماتم ہے کہیں اور کہیں شادی ہے

ایک دن جانا سب کے لئے زیرِ تربت
چھوڑ کر اپنے عزیز اور یہ مال و دولت
اس لئے ایک نظر جانبِ گورستان کر
یہ وہ جا ہے جسے کہتے ہیں مقامِ عبرت

قطع برنگ میر

(از مسٹر عکس)

دکھا کے نامۂ اعمال پوچھتا ہے مجھے
وہ کارساز کہ تیرے یہ کام ہیں کہ نہیں
بچھائے آنکھیں خموشی زبان کہے ہر مری
ترے کریم۔ و رحیم۔ حی۔ نام ہیں کہ نہیں

احساس گناہ

(مترجمہ مولانا محمد حنیف صاحب ۔ ندوی)

مجھے ایک دوست سے محبت تھی۔ وہ ایک قابل ادیب تھا اور شاید اس لئے میرے تعلقات اس سے گہرے تھے، ورنہ اُسکی اخلاقی حالت زیادہ بلند نہ تھی۔ اُسے دیکھ کر دل انبساط و سرور کے جذبات سے بھر جاتا تھا۔ یہی ایک چیز تھی جو میرے لئے بیحد جاذب اور دلکش ثابت ہوئی، اور یوں بھی میں اس کے سوا اور چاہتا ہی کیا تھا؟

ایک زمانہ تک ہم اکھٹے رہے، زندگی کے یہ دن بڑے مزے سے کٹے، لیکن ہماری یہ رنگ رلیاں زیادہ دیر نہ رہ سکیں۔ میں لکھنؤ سے دلّی چلا گیا۔ چند دن اُن سے خط و کتابت بھی رہی، پھر نہ معلوم کیوں یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مجھے اس کا بہت قلق ہوا، اور میں نے ارادہ کر لیا کہ کہیں نہ کہیں سے اُسے ڈھونڈھ ہی لاؤنگا۔ بہتیرا سر پھوڑا، ایک ایک شہر چھان مارا لیکن وہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس ناکامی پر مجھے جتنا بھی افسوس ہوتا کم تھا۔ اُس کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ مدتوں سے اُس نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ ایک مدت تک بیم و رجا کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر الامر یقین ہو گیا کہ وہ اس دنیا میں نہیں، اب اُس سے ملنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔

اس یقین کا آنا تھا کہ دل بھر آیا، خون کے آنسو رویا اور خوب رویا۔ معلوم ہوا آج سے میں بے یار و مددگار ہوں، میرا گھر ایک عزیز ترین دوست سے خالی ہو گیا، اور ہمیشہ کیلئے خالی ہو گیا۔ اب میں ہوں اور زمانہ کے المناک مصائب۔

اتفاق سے ایک دن میں اپنے گھر آ رہا تھا، راستہ بھول گیا، کیونکہ رات غیر معمولی طور پر تاریک تھی، اس خوفناک تاریکی نے مجھے ایک نہایت تنگ اور تاریک گلی میں ڈالدیا، جس پر جنوں کے مسکن کا گمان ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا، یہ گلی نہیں بحر اسود دونوں پہاڑوں

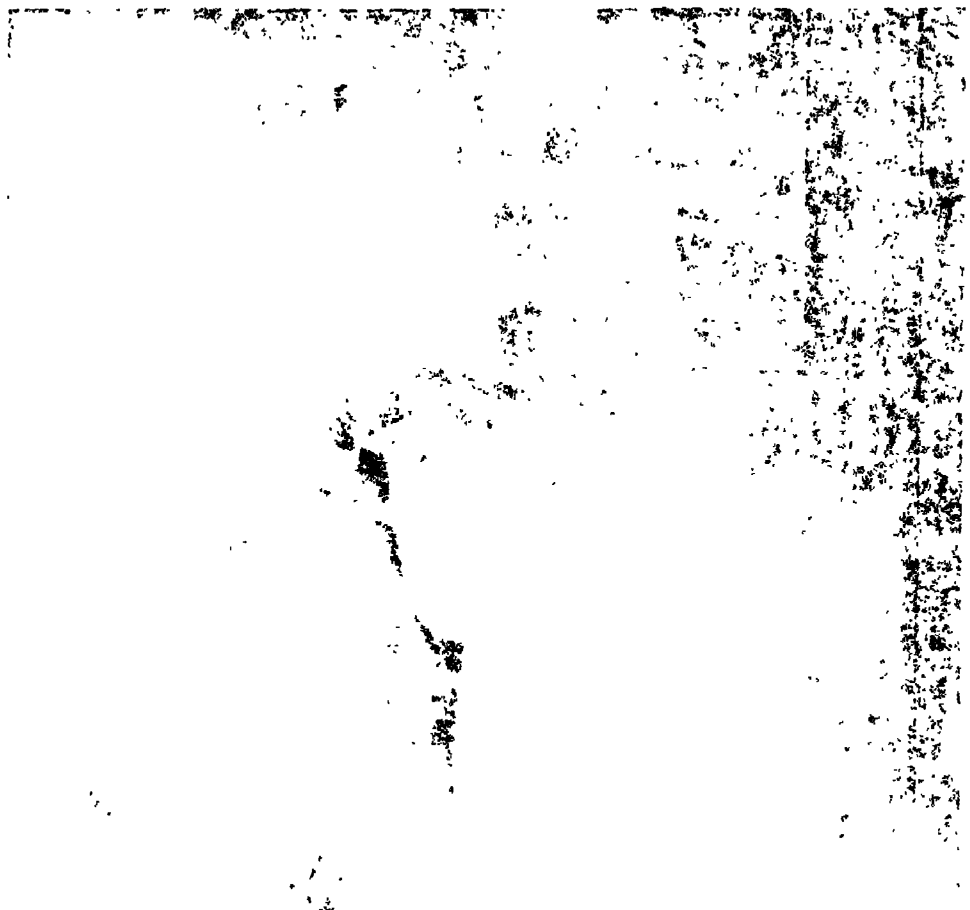
کے درمیان موجین مار رہا ہے، اور مجھے اپنے تاریک سیلاب مین بے اختیار بہائے لئے جا رہا ہے
اسی اثنا مین مین نے ایک دلسوز چیخ سنی، جو غالباً ان غیر آباد گھرون سے آ رہی تھی مین جستجو
ہی مین تھا کہ دوسری چیخ نے پھر مجھے چونکا دیا، اس کے بعد چیخون کا ایک اندوہناک سلسلہ قایم
ہو گیا، جس سے پرسکون فضا مین ہلچل مچ گئی، اور یہ خوفناک سکوت سامعہ پاش آوازون
سے تبدیل ہو گیا، اب مین بے اختیار ہو گیا، دل رحم و مروت کے گوناگون جذبات سے
لبریز ہو گیا، اور ایک حسرت انگیز آہ کے ساتھ بے ساختہ یہ الفاظ میری زبان سے نکل گئے
کہ "اُف یہ تاریک رات اپنے اندر کس قدر المناک راز پنہان رکھتی ہے"

اس سے پہلے مین عہد کر چکا تھا کہ مصیبت زدہ لوگون کی امانت مین حتی الوسع کوئی دقیقہ
فروگذاشت نہ کرونگا، چنانچہ مین نے ہمت کی اور اس مکان تک پہنچ گیا، جہان سے یہ آہ و بکا
کی درد انگیز آوازین آ رہی تھین، دروازہ کھٹکھٹایا، اور جواب نہ پانے پر پھر زور سے دوسری
دفعہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھل گیا، ایک دوشیزہ ٹمٹماتا ہوا چراغ لیکر نکلی، عمر دس سال سے زیادہ
نہ ہوگی، کپڑے پھٹے ہوئے تھے، لیکن گستاخ حسن اور شوخ نور ایسے اٹکھیلیان کرتا ہوا چھن
چھن کے نکل رہا تھا، گویا ماہِ دو ہفتہ تھا جو سیاہ اور منتشر بادلون مین ضیا افشانی کر رہا
تھا، مین نے پوچھا کوئی مریض کراہ رہا ہے، اس نے کہا ہان میرا باپ ہی زندگی کے آخری
لمحے گذار رہا ہے، وہ روتی ہوئی لوٹی مین بھی پیچھے ہو لیا، ایک تنگ و تاریک کوٹھری تک
ہم پہنچ گئے، اس کا دروازہ بہت چھوٹا اور مستم تھا، مین نے یک بیک محسوس کیا کہ مین کسی
دوسرے عالم مین ہون، یہ کوٹھری نہین قبر ہے، مریض نہین لاشہ ہے، اس کے قریب ہی مین
بیٹھ گیا۔ کمزوری سے یہ ڈھانچ ہو کے رہ گیا تھا، جس مین زندگی برائے نام کچھ لمحون کے لئے
مقید کر دی گئی ہو، شانہ پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھین کھول دین، اور غور سے دیکھنے لگا،
پھر ہونٹون مین سے ایک خفیف آواز نکلی کہ "خدا کا شکر ہے میرا دوست اس آڑے وقت
مین میرے پاس ہے" میرا دل دیوانہ وار ہلنے لگا، مجھے معلوم ہو گیا یہ میرا وہی دوست ہے

جس کی تلاش میں! میں مدتوں سرگرداں رہا، لیکن کاش میری کوششیں ناکام رہتیں میری قسمتِ خوابیدہ بیدار نہ ہوتی، اور میں اپنے عزیز دوست کو اسوقت نہ دیکھتا جب وہ ہمیشہ کے لئے مجھسے جدا ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا آپ ایسی نازک حالت تک کس طرح پہونچ گئے! اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا میں سمجھ گیا، وہ بیٹھنا چاہتا ہے۔ میں نے ہاتھ کا سہارا دیا وہ بیٹھ گیا، اور بمشکل اپنا دردناک قصہ یوں بیان کرنا شروع کیا۔

"دس سال ہوئے میں اور میری والدہ ایک مکان میں رہا کرتے تھے۔ جس کے ساتھ ہی ایک عظیم الشان قصر تعمیر تہا۔ جسے اپنے اندر ایک معصوم مگر بلا کی حسین دیوی رکھنے کا فخر حاصل تھا۔ میں اس پر مفتوں ہوگیا۔ کیونکہ مجھے اس سے زیادہ خوبصورت عورت دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بہتیری کوششیں کیں مگر ناکام رہا۔ اس نے ہر دفعہ مجھے ٹال ٹال دیا آخر ایک فریب دیکر میں نے اُسپر قبضہ کر لیا۔ آپ سمجھے وہ فریب کیا تہا وہ شادی کا لالچ تہا۔ اب وہ میرے قبضہ میں تھی۔ میں نے ایک ہی دن میں اس سے اُسکی معصوم شرافت اور معصوم دل کو چھین لیا۔ لیکن یہ شرمناک مصاحبت کچھ ہی دنوں کے لئے تہی۔ اور جب حالات معمول سے متجاوز ہوئے تو اُسے چھوڑ چھاڑ یہاں آکر رہنے لگا۔ جہاں تم مجھے اب دیکھ رہے ہو۔ پھر اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اسی مکان میں رہتے ہوئے مجھے کئی سال ہوگئے اور پچھلے واقعات مجھے خواب و خیال نظر آنے لگے۔ ایک دن ڈاکئے نے آکر یہ لفافہ دیا" یہ کہکر اس نے تکیہ کے نیچے سے ایک پرانا لفافہ نکالا جسکو امتدادِ زمانہ نے زرد کر دیا تہا۔ میں نے اُسے کھولا تو حسب ذیل سطور ثبت تھیں۔

"اگر میرا ارادہ اس خط لکھنے سے تجدید عہد یا دیرینہ محبت کو یاد دلانا ہوتا تو میں یقیناً ایک حرف نہ لکھتی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں، تمہاری جھوٹی اور ہوسناک محبت اس قابل ہی نہیں کہ اسکی قدر کی جائے۔ تم جانتے ہو تم نے مجھے کس وقت



چھوڑا؟ اسوقت جب میں تمہاری بوالہوسی کا ایک خطرناک عملی نتیجہ دیکھنے والی تھی ... تم بھاگ گئے۔ اسوقت میں جس کے اصلی سبب حقیقت میں تم ہی تھے ہاں تم مجھ سے اسوقت علیحدہ ہوئے جب میں طوفان اشک میں گھری ہوئی تمہیں مدد کے لئے بلا رہی تھی نہیں نہیں تم تو وہ طوفان تھے۔ ....

"...... ......"

اس کے بعد میں کیا تمہیں کوئی شریف النفس انسان تصور کر سکتی ہوں۔ بلکہ کیا تم انسان کہلانے کے بھی قابل ہو؟ حسن اتفاق سے تم میں وہ تمام صفات ایک ہی وقت میں جمع ہوگئی ہیں جو فرداً فرداً ہر خوفناک درندے میں پائی جاتی ہیں۔

تمہارا یہ دعوائے محبت سراسر جھوٹ تھا تمہارے ایسا ہوس ناک آدمی صرف اپنے پست جذبات سے محبت کر سکتا ہے۔ جب تم نے دیکھا کہ میں ہی تمہاری بوالہوسی کی شکار ہو سکتی ہوں تو تم نے مجھے اپنا بنانا شروع کیا۔ ورنہ تمہاری مجال تھی کہ میرا معصوم چہرہ ابدالآباد تک بھی دیکھ سکتے؟ تم نے مجھ سے بددیانتی اور وعدہ خلافی کی اور نکاح سے صرف اس لئے گریز کیا کہ میں اپنے دامن عصمت کو آخر تک محفوظ نہ رکھ سکی لیکن تم جانتے ہو تمہیں نے مجھے اس پر مجبور کیا۔ اور میں تمہارے ہی لئے ذلیل ہوئی میں نے تم ہی کو خوش کرنے کے لئے اتنی بڑی خطرناک جرأت کی جس کا نتیجہ آج یہ ہے کہ میری بے بسی ایسی ہی ہے جیسے قوی ہیکل خونخوار انسان کے سامنے ایک طفل شیر خوار کی تم نے میری عزت و شرافت کو غصب کر لیا۔ میری زندگی اجیرن کر دی۔ موت کے دن گنتی ہوں، پر وہ ختم ہونے کو نہیں آتے۔ تم ہی بتاؤ کیا ایسی عورت زندگی کو خوشگوار طریقے پر گذار سکتی ہے۔ جو نہ کسی کی ماں ہو نہ جائز بیوی، نہ اُسے کوئی سوسائٹی قبول کرنیکو تیار ہو، اور نہ وہ اس قابل رہے کہ کسی انسانی اجتماع میں شریک ہو سکے، ہاں جو ہر وقت کرب و اضطراب کے بحر مواج میں غوطہ زن رہے۔ جس کی آنکھیں ہر وقت اشک باری میں مصروف رہیں۔ جس کی ہر رگ و پے میں درد سرایت کر گیا ہو، اور

طعنہاے دلخراش، اسپر نمک پاشی کا کام دے رہے ہون۔
آہ! میرے آرام، طمانیت کو ہی تم نے چھین لیا، کیونکہ تمہارے بھاگ جانے کے بعد مین ماں باپ اور اعزا کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئی، اور ایک نہایت ہی ذلیل اور ادنے درجہ کے مکان مین آگئی۔ تاکہ زندگی کے یہ المناک دن اس تاریک اور تنگ مکان مین گذاردون
آہ! تم نے میرے ماں باپ کو بھی زندہ نہ چھوڑا کیونکہ وہ رسوائیون کے غم مین زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے، اور آہ! میری زندگی کا فانوس بھی تمہاری اور صرف تمہاری وجہ سے ٹمٹما رہا ہے اور عنقریب گل ہونے کو ہے، کیونکہ وہ زہریلے گھونٹ جو مین نے تمہارے ہاتھون پئے تھے پوری طرح سرایت کر چکے ہین۔ اب میری زندگی محال ہے۔ میری شمع حیات شمع سحری کیطرح جلد جلد تمام ہو رہی ہے اور شاید خدا نے میری دعاؤن کو سن لیا ہے۔ عنقریب ہی ان تمام مصائب سے چھٹکارا پانے والی ہون۔
تم مکار ہو۔ جھوٹے ہو، اور خوفناک چور ہو مجھے یقین ہے کہ خدا بغیر میرا سخت انتقام لئے ہوئے تمہین کبھی نہین چھوڑ سکتا۔
مین نے یہ خط اس لئے نہین لکھا کہ تم اپنی حرکتون پر پچتاؤ، اور نہ اس لئے کہ تمہارا دل پسیجے۔ کیونکہ تمہاری ذات اس سے نہ صرف محروم بلکہ بے نیاز ہے، اور خصوصاً اس وقت مجھے تم سے کیا اُمید ہو سکتی ہے جب مین قبر کے کنارے آ گئی ہون، اور زندگی کو پوری طرح خیرباد کہہ رہی ہون۔ اس لئے حاشا وکلا مجھے تم سے کوئی امید نہین ہے صرف ایک تمہاری امانت ہے جو مین تمہین دیدینا چاہتی ہون، اور وہ تمہاری بیٹی ہے .... اگر تمہارے دل مین ذرہ برابر بھی بنی نوع انسان سے محبت کرنیکا جذبہ موجود ہے تو اس خانمان بربادی کے باپ بنو اور خدارا اُسے موت کے پنجے سے نکال لو۔ ورنہ وہ بھی اسی طرح مرنے پر مجبور ہو جائیگی،،
مین نے ابھی خط ختم نہین کیا تھا کہ میرے دوست کی گریہ وزاری اور سرد آہون نے بے اختیار

تو ہر کر لیا۔ مین نے پوچھا پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ اس نے کہا مین نے اس خط کو پڑھا مجھے محسوس کیا کہ میرے بدن مین آگ لگ گئی ہے۔ ہاتھ پاؤن پھول گئے ہین کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ دل ہے کہ بلیون اچھل رہا ہے کچھ دیر تو فرط غم سے تصویر مجسم بنا رہا آخرش اس کے گھر جانے پر مجبور ہو گیا۔ اور وہی کوٹھری ہے جسے مین تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ غالباً اسی چارپائی پر جس پر اب مین لیٹا ہوا ہون ایک بے جان لاشے کو پڑے دیکھا۔ اس کے پاس ہی اسکی معصوم بچی بیکسانہ انداز سے رو رہی تھی۔ مین یہ المناک منظر دیکھ کر حیران ہو گیا۔ پاؤن تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ عجیب عبرت آموز واقعہ تھا۔ میرے گناہ ایک ایک کرکے میرے حافظہ مین مجتمع ہونا شروع ہو گئے۔ قوت متخیلہ نے انہین میرے سامنے عجیب خوفناک اشکال مین لا کھڑا کیا۔ مین تھرا گیا اور کانپتی ہوئی آواز مین عہد کیا کہ تا دم زیست اس کوٹھری کو نہین چھوڑون گا اور اسی طرح گھل گھل کر مرونگا جس طرح اس بیگناہ کا خاتمہ ہوا۔ یہی در و دیوار مجھے سسکیان بھرتے ہوئے، دم توڑتے ہوئے دیکھین گے۔ اور نفرت و ملامت کی ہنگر پاش صداؤن سے مجھے الوداع کہینگے۔

دیکھئے آج مین مر رہا ہون لیکن میرا دل خوش ہے اور مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ خدائے تواب نے میرے تمام گناہون کو بخش دیا ہے کیونکہ مین اپنے عہد پر قایم ہون اور آج اُسے پورا ہوتے دیکھ رہا ہون۔

وہ یہین تک پہونچا تھا کہ گویائی نے جواب دے دیا۔ چہرے پر مردنی چھا گئی۔ دھم سے فرش پر گرا اور گر کر جان دے دی۔ مین دیر تک بیٹھ کر روتا رہا اور لاوارث بچی کو تسلی دیتا رہا جس کا اب خدا کے سوا کوئی والی وارث نہ تھا۔ اس سے فارغ ہو کر اس کے اعزا و اقارب کو تار دئے جنازہ مین لوگون کا ہجوم قابل دید تھا۔ آہ و بکا سے فضا مین غیر معمولی شور برپا ہو گیا۔

خدا جانتا ہے مین قصہ ختم کر رہا ہون لیکن میرا دل میرے قابو مین نہین۔ مجھے رہ رہ کر اس کا یہ آخری جملہ بے چین کر رہا ہے۔ "میرے دوست .... میری بچی .... ! ! " -

مدوجزر

ایک دوشیزہ کی زبان سے

(از فخرالدین فخر ۔ ایچ ۔ لوی)

اُف رے تری دوشیزگیِ عالمِ نوبہار کی — محوِ خرامِ ناز ہے ایک پری خمار کی
تیری ادائے خامشی، ایک فریبِ ساحری — تیری نگاہِ دلبری ایک طلسمِ سامری
رقص کناں ہے بیخودی شوخ ترے شباب مین — جذبۂ دل ہے بیقرار آئینۂ حجاب مین
تیرا جمالِ بیہوشی کھینچ رہا ہے روحِ حیات — تیرے کشش کے تار پر گھوم رہی ہے کائنات

کون ہے کیا ہے؟ تو بھلا کیا ہے فسانۂ شباب — مجکو دوشیزہ کچھ سنا اپنا ترانۂ شباب
چہرہ پہ آب و تاب کیون دل مین یہ پیچ و تاب کیون — پیکرِ حسن مین ترے رنگِ رخِ گلاب کیون
کیا یہ ہی شانِ دلبری ہے تیری منزلِ مراد — باغِ جہان مین ہر گھڑی یونہی رہیگی شاد شاد
یا کوئی اور مشغلہ تیرا شریکِ کار ہے — عالمِ عیش مین تجھے بھی غمِ روزگار ہے

بولی دوشیزہ کیا کہون بات جو آشکار ہے — حسن و شباب کچھ نہین نشہ ہے یا خمار ہے
باغ مین آج پھول سے کہہ رہی تھی کوئی کلی — تجھپہ جو کچھ گذر گئی مجھپہ بھی کل کو آئیگی
نکہتِ گل شگفتگی حالتِ خستہ جائیگی — باغِ جہان سے ہر کلی یونہی شکستہ جائیگی

فخر شباب رنگ و بو ابھرا ہوا حباب ہے
ناز و ادا و بانکپن ایک طلسمِ خواب ہے

حُبِّ وَطن

ایک مصری ادیب کے قلم سے

مترجم محمد یوسف انصاری (فاضل) اعظم گڈھی

جوئی خون می چکد از حسرت دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

وطن کی محبت نے میرے دل و دماغ مین اپنا گھر بنا لیا ہے - اسکی جادو بھری محبت میرے قلب مین اقامت گزین ہے۔ محبت کی غیر معمولی تاثیر - غیر مکیف اثر۔ دل مین موجود ہے - جو لفظون مین بیان نہین کیا جاسکتا - مین چاہتا ہون کہ صفحۂ قرطاس پر اپنے دلی جذبات، قلبی کیفیات، کا نقشہ کھینچ دون - لیکن حیران ہون کس طرح کھینچون؟ اپنا درد دل آپ کو دکہانا چاہتا ہون لیکن حیرت ہے کس طرح دکہاؤن؟ افسوس! میرے پاس وہ الفاظ نہین جو میری حقیقی ترجمانی کر سکین - اور مین تحریری تصویر آپ کے سامنے پیش کر دون اگر منطقی نقطۂ نظر سے علیحدہ ہو کر دیکہا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ غیر ممکن نہین، لیکن دشواری سے کون انکار کر سکتا ہے۔ پھر دلی جذبات کو پیش کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیونکہ ؎

اس گلستان مین مگر دیکھنے والے ہی نہین
داغ جو سینے مین رکھتے ہین ولالے ہی نہین

بہر حال مین ہدیۂ ناظرین کرتا ہون - اور چاہتا ہون کہ وہ بہی اس درد مین مبتلا ہون - ان کے سینے مین بہی درد، اور درد مین تڑپ پیدا ہو -

وطن کے ساتھ مجھے محبت نہین بلکہ عشق ہے - میری شیفتگی اور وارفتگی، تمام جذبات محبت سے بھری ہوئی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ٹھنڈی ہوا، چمن کی دلفریب فضا - تارون بھری رات نسیم بہار کے چھوٹے پھولون کی چمک - پھولون کی مہک - لہلہاتے ہوئے سبزہ زار - دلکش مرغزار - جیلے پہلو

سوتے ؟ لیکن میرے دل مین اسکی کچھ وقعت نہین ۔ میرے دل و دماغ مین اگر کوئی خیال ہے تو وطن کا ، آنکھون مین اگر کوئی صورت بسی ہوئی ہے تو وطن کی ۔ میرے سامنے اگر کسی کا نقش ہے تو وطن کا ۔ اسی کی محبت مین سرشار اور اسی کی بادۂ الفت سے مست اور مخمور ہون ۔

مادر وطن ! جس طرح تو میرے مان باپ کا مولد و مسکن ہے اسی طرح میرا ہی ہے ۔ جس طرح ان کی تربیت ، پرداخت ، تجھسے ہوئی ہے اسی طرح مری ۔ ہم چھوٹے تھے ، تجھپر بسے ۔ تیری پیداوار سے ہماری نشو و نما ہوئی ۔ تیری ہی محبت بھری گودون مین ہم پلے ۔ بڑے ہوئے ۔ اور چلنے پھرنے لگے ۔ مان باپ نے بھی اپنے فرائض کو تجھ ہی سے پورا کیا ۔ سفر و حضر ، اقامت ، و رحلت مین تیری طرف نسبت ہمارے لئے باعث صد عزت و صد افتخار رہی ۔

اگر مان رحم کرتی ہے ، مہربانی سے پیش آتی ہے ، تو یہ کیا ہے ؟ یہ وہی محبت ہے جو تری محبت سے مکتسب ہے ۔ اس نے ہم کو خونِ جگر پلایا ۔ اپنے دودھ سے ہم کو سیراب کیا ، اور سینچا ، یہ دودھ کیا تھا ؟ تیرے جود و کرم کی ایک نہر ، یا تیرے عطا و بخشش کی ایک سلسبیل ، جس سے وہ اس سے پہلے سیراب ہو چکی ہے ۔ اس نے ہماری پرورش کی کیون ؟ اس لئے کہ ہم بڑے ہون اور اغیار و اجانب کے ظلم و ستم سے تجھے مصئون اور محفوظ رکھین ۔ اگر مان کے دل مین تیری محبت نہ ہوتی تو کبھی اس کے شجر لطف و عنایت مین نشو و نما نہ ہوتی ۔ تیری ہی محبت سے اصل محبت مین کونپلین نکلین ۔ شاخ اور ٹہنیان پیدا ہوئین ۔ برگ و ثمر آئے ۔ اور بارآور ہوئی ۔ تو ہی ان جذبات محبت کا منبع اور حقیقی سرچشمہ ہے ۔

مان کی شفقت بھری گودون مین ہم سوئے ۔ ہماری حفاظت کے لئے آنکھ پر آنکھ نہ لگائی ، پلکین جھپکنے نہ پائین ۔ تمام رات بیداری اور اختر شماری مین گذار دی ، تاکہ ہمین معلوم ہو جائے کہ وطن کی حفاظت و صیانت آزادی اور حریت مین اس قدر ، اور اس طرح مصائب و تکالیف برداشت کرنے پڑینگے ۔ اغیار سے تجھے محفوظ رکھنے مین اس طرح شب بیداری اور نگرانی و حفاظت کرنی ہوگی ۔

دیس ماتا ! مجھے اگر بھائی سے محبت ہے تو اس لئے اور صرف اس لئے کہ وہ مرا برابر کا شریک ہے ۔ جب تیری طرف غیرون کا دستِ ظلم بڑھتا ہے تو وہ مرا مونس ۔ و غمخوار ہوتا ہے ۔ وہ مرا دست و

بازو بجا تاہے۔ جس سے تجھپر آنیوالی مصیبتوں کو دور کرتا ہون۔ جب مین تیری خدمت کے لئے دشوار گذار گھاٹیان فلک ناپہاڑیان تکلیف دہ اور خطرناک راستے طے کرتا ہون تو وہ مرا رفیق اور ساتھی ہوتا ہے۔ میرا بھائی میری شمشیر آبدار ہے۔ دہر ستم شعار فلک نا ہنجار جب تیرے ساتھ عداوت اور دشمنی پر آمادہ ہوتا ہے تو اُسے میان سے کھینچ لیتا ہون۔ میرا شریک زندگی بھائی میرے لئے دام و جال کا کام دیتا ہے۔ جس سے مین سعادت خوش بختی تیری شادابی اور زرخیزی کی چڑیون کو جو تیری الفت و وفا کی فضا مین چہچہاتی ہین شکار کرتا ہون مین اور میرا بھائی تیرے قصر عالی کے ستون ہین۔ باہمی محبت ہے، اور یک مضبوط اور مستحکم بنیاد پر قایم ہے۔ وہ بنیاد کیا ہے؟ تری طبعی، دائمی، غیر منفک محبت ہے۔

پیارے وطن! تو ہی مرا خوشگوار مسکن ہے۔ وطن سے دور ہو کر انسان خواہ ترقی کرے پہلے ہر قسم کے آرام، و آسایش کے اسباب بہم ہون، لیکن یہ سب اس کی نظرون مین خار معلوم ہوتے ہین اور سچ تو یہ ہے

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے
لون نہ ہرگز اگر بہشت ملے

مین تو تیرے ہی آسمان سے سایہ کا طلبگار رہون۔ مجھے ہر چیز اسوقت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مین خوش کن چیزون سے اسی وقت لطف اندوز ہوتا ہون، جبکہ تو سرسبز و شاداب ہو۔ انسان وطن سے دور ہوتا ہے۔ سفر مین دوسرے مسافرون کے ساتھ مواخات اور دوستی قایم کر لیتا ہے۔ لیکن جب کبھی اس کا کوئی ہم وطن اسے ملجاتا ہے۔ تو گلے سے لپٹ جاتا ہے۔ دو حقیقی بھائیون سے زیادہ محبت ہوجاتی ہے یہ محبت کیون ہے؟ صرف اس لئے کہ وہ تیری سرسبز زمین مین پیدا ہوئے۔ اور تیری ہی عزت و رفعت کے سینے سے انہون نے دودھ پیا اور پرورش پائی۔

ایک فقیر کو تونگری سے، جان بلب مریض کو آبحیات سے، مایوس اور نا اُمید کو کامیابی سے۔ قحط اور خشک سالی کے بعد ارزانی اور شادابی سے کس قدر فرحت اور کس قدر مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کیا وہ لفظون مین بیان کی جا سکتی ہے؟ لیکن تیری شادابی، تیری حریت سے مجھے اس سے کہین زیادہ

خوشی حاصل ہوتی ہے۔

زندگی کے آخری گھنٹوں تک، جب تک جسم مین جان ہے۔ منہ مین زبان اور زبان مین گویائی ہے تجھے یاد کرتا رہون گا۔ میرے وطن! میری ہر پکار مین تیری یاد ہے۔ تیرا ذکر میرے لئے روح اور دل آرام ہے۔ تیرا بار بار ذکر تیرے نام کی تکرار، میرے لئے سرمایۂ حیات اور باعث زندگی ہے

اپنی جان کی قسم، میرے پاس سب سے بیش بہا اور انمول چیز میری جان ہے۔ مین اسے تجھ پر قربان کرتا ہون۔ تیری ترقی، ورفعت کی دیوی پر اپنی جان کی بھینٹ چڑھاتا ہون۔ اپنی ملکیت کا اعلیٰ جوہر تیرے پیش کرتا ہون۔ کیا میری قربانی تجھے منظور اور پسند ہے؟

مین آلام و مصائب جھیلون گا۔ تاکہ تو آزاد رہے۔ درد، دکھ سہون گا۔ تاکہ تو خوشگوار، سرسبز شاداب رہے۔ مین اپنی زندگی کو تجھ پر نچھاور کرون گا۔ تاکہ تو زندہ رہے۔ لیکن کیا ہماری محبت کی یہی حد نہین، یہ تو کچھ بھی نہین۔ تیری محبت، تیرے جذبات الفت کی بجلی کی یہ ایک چمک، تیرے درد کی یہ تڑپ ہے۔

تیری عزت و رفعت، کے چشموں سے سیراب ہونیوالے تیرے فرزند ہمیشہ تجھ پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار ہین۔ تیری پکار پر لبیک کہین۔ تیری آواز پر سر تسلیم خم کردین، تیرے حکم پر اپنی جان تیرے نذر کردین۔ یہی وہ رہگذر ہے جس پر ہمارے پیشرو چلے۔ ہم اسی منزل سے گذر رہے ہین تاکہ نسلین ہمارے نقشِ قدم پر چلین۔

فرزندان وطن! تمہارا وطن بیکسی اور بےبسی کے عالم مین چیختا ہے، تمہارا وطن جان بلب کا عالم ہے۔ اسے عیسیٰ نفس، آبحیات کی ضرورت نہین۔ بلکہ تمہارے خون دل وجگر، تمہاری جان کی ہے۔ کیا اس کے لئے تم تیار ہو؟ تمہارا وطن تم سے اسی چیز کا مطالبہ کر رہا ہے۔ سنو! کیا کہہ رہا ہے

"میرے لاڈلے بچو! آنکھین کھولو کب تک سوؤ گے۔ دن نکل چکا۔ اپنے نرم بستر سے اٹھو چھوڑو زادِ راہ لو" اور چل نکلو آرام و خوابگاہون کو خیرباد کہو۔ آرام و راحت عیش وعشرت کا خیال دور کرو۔ بہ تمہیر حق ہے۔ مین تمہاری جان چاہتا ہون، کیا تم اسے دینے مین عذر نہ کروگے؟ کیا تم سوتے رہو گے۔ دیکھو دیکھو۔ زمانہ تمہین کیا درس دے رہا ہے؟"

محشرِ جذبات

(از سرشار کسمنڈوی - ایڈیٹر حسن خیال ہردوئی)

پھر دیکھو اُسی ادا سے اشارہ کہیں جسے — ڈھا دے پھر اُسکو قصرِ تمنا کہیں جسے
صحرا نوردِ عشرتِ صحرا کہیں جسے — اک چیز ہے نہ آبلۂ پا کہیں جسے
اک جست کا ہے دامنِ صحرا کہیں جسے — جو لانگہِ خیال کا ٹکڑا کہیں جسے
حسرت نہ کر سحر کی مریضِ شبِ فراق — پیکِ اجل ہے صبح کا تارا کہیں جسے
لے آئی کھینچ کر مجھے کوئے حبیب میں — وہ بیخودی کہ جوششِ تمنا کہیں جسے
کس درجہ جانگداز ہے کس درجہ جانگسل — اے ہمنشین کشاکشِ دنیا کہیں جسے
دنیا سے لے چلا ہوں میں اے مرگِ ناگہاں — وہ اضطراب جوششِ تمنا کہیں جسے
لایا ہوں اپنے ساتھ لحد میں وہ بیخودی — اک یادگارِ غفلتِ دنیا کہیں جسے
کس درجہ جانگداز ہے مجنون کی سرگذشت — تفسیرِ کج نگاہیِ لیلا کہیں جسے
ہے دل کی کائنات کا ایک عنصرِ لطیف — اہلِ نگاہ خونِ تمنا کہیں جسے
اس دل سے واسطہ تجھے اے موجِ انبساط — اُجڑی ہوئی امید کی دنیا کہیں جسے
آخر نگاہِ داورِ محشر نے پالیا — وہ زخمِ دل نشانِ تمنا کہیں جسے
دیکھی گئی نہ اُس سے مری آخری نظر — تصویرِ کسمپرسیِ دنیا کہیں جسے
تیرا ہی بیوفا وہ غمِ جانگداز ہے — سب میرے دل کے خون کا پیاسا کہیں جسے

سرشار ایک وہ کہ ہیں جانِ حیاتِ عیش
اک میں کہ ننگِ ہستیِ رسوا کہیں جسے

تعلیم نسوان

(مولانا محمد جعفر حسین صاحب بدایونی)

عنوانِ بالا کی موافقت اور مخالفت مین ہزارہا مضامین مختلف رسائل و اخبارات مین شایع ہوچکے ہین۔ اور یہ مبحث اب اس درجہ فرسودہ ہوگیا ہے کہ اس موضوع پر مزید لکھنا بے سود معلوم ہوتا ہے۔ مسئلہ زیر بحث کے متعلق جتنے مضامین اب تک میری نظر سے گذرے ہین باستثنائی چند تمام کے تمام انتقام سے مملو نظر آتے ہین۔ جن مین بجائے دلائل و براہین کے زور قلم سے کام لینے کی ناکام کوششین کی گئی ہین۔ افسوس ہے کہ مسلمانون کا ایک متفق علیہ مسئلہ آج طبع آزمائی کا ذریعہ بنگیا ہے۔ اس ترقی و تمدن کے زمانے مین حدیث طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ کی موجودگی مین نفس تعلیم سے کسی مسلمان کو انکار کی جرأت نہین ہوسکتی۔

صرف طریق تعلیم و نصابِ تعلیم مین اختلافات ہین۔ ایک فریق کا دعویٰ ہے کہ جب تک عورتون کو اعلیٰ تعلیم نہ دی جائیگی مسلمانون کی سوشیل اور اقتصادی حالت درست ہونا ناممکن ہے۔ فریق مخالف کا بیان ہے کہ اگر عورتون کو اعلیٰ تعلیم دی گئی تو مسلمانون کی مذہبی اور سوشیل حالت بد سے بدتر ہو جائیگی۔ ہر دو فریق کے دلائل پر نظر غایر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صرف اعلیٰ اور ابتدائی تعلیم کا جھگڑا ہے۔ مسلمان عورتون کے تعلیمی اعداد و شمار دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ فی ہزار صرف چند عورتین معمولی نوشت و خواند سے واقف ہین۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم خواتین تو سارے ہندوستان مین چند ہونگی تعلیم سے لاپرواہی کیوجہ سے آج ہماری ہزارون بہنین ارکان دین اور معمولی مسائل دینی سے بھی ناواقف ہین۔ ایک ذرا سا خط پڑھوانے کے لئے کتنے گھرون کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ بلا ابتدائی تعلیم حاصل کئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ممکن ہی نہین۔ اس لئے حامیانِ اعلیٰ تعلیم اپنے دعاوی سے تھوڑے زمانہ کے لئے باز آجائین اور متفقہ طور پر ایک ایسا پروگرام قوم کے سامنے پیش کرین جس سے ابتدائی تعلیم ہی عام ہوجائے۔ جب ابتدائی تعلیم عام ہوجائیگی اسوقت اعلیٰ تعلیم کے

حسن و قبح پر بحث کر لی جائیگی۔

تمام ملک پر اس سرے سے اس سرے تک ایک نظر ڈالئے اور بغور دیکھئے تو فوراً معلوم ہوجائیگا کہ اللہ کی بنائی ہوئی زمین میلوں تک ایسے اسلامیوں سے بسی ہوئی ہے جن کی وقعت جنگلی جانوروں سے زیادہ نہیں۔ عورتوں کا ذکر نہیں مردوں کی حالت قابل رحم ہے۔ پھر ایک دوسری آبادی ایک ایسے لوگوں کی ملیگی جن میں مرد تو کسی قدر تعلیم یافتہ اور متمدن ہیں لیکن عورتیں قطعی جاہل اور غیر مہذب ہیں۔ ایسی مخلوق زیادہ تر دیہاتوں میں آباد ہے۔ ان سے بھی گذرئیے تو ایک گروہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ملیگا۔ ان کی عورتیں یا تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ ہیں یا کم از کم ابتدائی نوشت و خواند سے واقف ہیں ان سے ہمیں بحث نہیں۔ البتہ پہلے طبقہ کے جنگلی انسان اس امر کے محتاج ہیں کہ ان میں ذکور و اناث دونوں جنسوں کی تعلیم کے لئے یکساں تعلیم کا پروپگنڈا کیا جائے۔ دوسرے طبقہ کے مسلمانوں کے لئے جو عموماً دیہات کے باشندے ہیں۔ یہی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان میں گاؤں گاؤں زنانہ و مردانہ مدارس قایم کر دئے جائیں تا کہ انہیں تعلیم سے لگاوٹ و دلچسپی پیدا ہو۔ علاوہ ازیں مدارس شبینہ بھی کھولے جائیں جن کے لئے گاؤں کی مسجدیں نہایت موزوں ہیں۔ ان مدارس شبینہ میں بڈھے اور سن کا رسیدہ مسلمان تعلیم پائیں۔

نصاب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی خاص کمیٹی یا شخص کی بنائی ہوئی کتابیں پڑھیں بلکہ وہ جس مسلک کی کتابیں چاہیں شروع کر دیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ وہ کتب اور اخبار بینی کے قابل ہوجائیں پھر یہی لوگ بتدریج اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو پڑھانے کی ضرورت محسوس کرنے لگیں گے۔ اور بہترین صورت جو موقع اور مقام کے لحاظ سے ان کے پیش نظر ہوگی اختیار کر لیں گے۔

بہرحال ضرورت یہ نہیں ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لئے صرف اسباب کی تلاش میں مدتیں گذار دی جائیں بلکہ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے تمام کے تمام تعلیم کی طرف متوجہ اور مائل ہوجائیں اس موقع پر تعلیم یافتہ طبقہ کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ ہر آن خلوت و جلوت میں تعلیمی پروپگنڈا کیا کریں۔

اناطولیہ

(مولانا مسعود الرحمٰن خان۔ ندوی)

اناطولیہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی مشرق کے ہیں۔ اور جغرافیہ میں اس کا اطلاق ایشیائی کوچک اور سلطنت عثمانیہ کے بعض دوسرے مقبوضات پر ہوتا ہے۔ رومیوں کے زمانہ میں اناطولیہ کو ایشیائے کوچک کہتے تھے۔ اناطولیہ کے حدود اربعہ یہ ہیں۔

شمال مغرب میں درہ دانیال، بحر مرمرا، باسفورس، اور بحر اسود۔ مشرق میں سلسلۂ کوہ ارمینیا جنوب میں بحر متوسط اور مغرب میں بحر ایجہ اور مجمع جزائر یونان۔

اس کا رقبہ تقریباً ۲ لاکھ ۱۲ ہزار مربع میل ہے طول زیادہ سے زیادہ سات سو میل ہے۔ اور عرض چار سو میل۔ اناطولیہ کے سواحل سطح بحر سے بلند اور نہایت سنگین چٹانوں سے بنے ہوئے ہیں مغربی سواحل دنیا کے سب سے زیادہ دندانہ دار سواحل میں سے ہیں۔ اور بالکل پہاڑی ہیں اندرون ملک میں بھی پہاڑوں کے بہت سے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں جن میں سب سے بڑا اور مشہور سلسلہ کوہ طورس کا ہے جو ساحل بحر سے شروع ہو کر دریائے فرات تک چلا جاتا ہے۔

ملک میں بہت سے بحیرے بھی ہیں۔ جن کا پانی نہایت ہی شور ہے۔ سب سے بڑا بحیرہ قونیہ سے ستر میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ اس کی درازی ۵۵ میل ہے اور چوڑائی ۱۰ سے ۵ امیل تک اس سے ملک کی ضروریات کے لئے بہت بڑی مقدار میں نمک نکالا جاتا ہے۔ دریاؤں میں دو دریا بہت مشہور ہیں۔ "قزل ارمق" اور "سکاریہ"۔ پہلا دریا سیواس سے ۴۰ میل ادھر سے نکلتا ہے اور بحر اسود میں گرتا ہے۔ دوسرا انقرہ کے قریب سے نکل کر بحر اسود سے مل جاتا ہے۔ ملک کی آب و ہوا ازمنۂ قدیم سے مشہور ہے۔ مورخ۔ شعراء اور علماء جغرافیہ ہمیشہ سے اسکی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔ آب و ہوا غایت درجہ صحت بخش و عمدہ ہے۔ پہاڑ گرمی کی شدت کو کم کر دیتے ہیں اور سمندر جاڑے کی ٹھنڈک کو معتدل بناتے ہیں۔

اناطولیہ کے بعض مقامات میں معدنی چشمے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ جن سے نہایت گرم وکبرتی پانی ابلا کرتا ہے۔ اور اُن چشموں کے گرد مخروطی شکل میں جم کر ٹھہر جاتا ہے۔ بعض مقامات میں زمین سے مشتعل ہو جانے والی گیس نکلتی ہے۔ اور ایک جگہ ایک غار ہیں سے اس قسم کے بخارات نکلتے ہیں جو چشم زدن میں انسان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ معدنیات بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ سیسہ، لوہا، تانبہ چاندی، اور سونے کی وافر مقدار پہاڑوں میں موجود ہے۔ اور قدیم زمانہ میں ایک معتد بہ مقدار ان اشیاء کی برآمد بھی کیجا چکی ہے۔ سارا ملک نہایت زرخیز اور زرعی حاصلات اور پیداوار کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ طرح طرح کے میوے، پھل۔ غلہ۔ اور تمباکو کے علاوہ انواع و اقسام کی قابل استعمال لکڑی اس کے پہاڑی جنگلات میں کثرت پیدا ہوتی اور تمام ممالک عثمانیہ کی ضروریات پوری کرتی ہے۔

اس کے ماسوا ہر قسم کے چوپایوں کی افزائش بھی بہت ہوتی ہے۔ اناطولیہ کی بھیڑ بکری اور گھوڑا تمام دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ بھیڑ بکری کی شہرت نرم بالوں کی وجہ سے ہے اور گھوڑا اپنی تیز رفتاری اور مضبوطی کے طور سے ازمنۂ قدیم سے ضرب المثل ہے۔ ملک میں زراعت کے علاوہ تجارت وصنعت وحرفت بھی اچھی ہے جن میں زیادہ قابل ذکر انجیر۔ بھیڑ و بکری۔ اور اونٹ کی اون۔ دباغت کی ہوئی کھالیں۔ کہربا۔ لاجورد، افیون۔ مشک۔ قالین۔ گیہوں۔ ۔ ۔ نی۔ تل۔ اور جو ہے۔ ریشم اور سوت کے متعدد کارخانے بھی ہیں۔ اور قہوہ اور چاء کے باغات اپنی مثال میں فرد ہیں۔ اناطولیہ دنیا کے اُن ملکوں میں ہے جو غایت درجہ تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ مشرق ومغرب کے مابین پل کا کام دیتا رہا ہے۔ وہ تقریباً ۴ ہزار سال سے مختلف وحشی قبائل و اقوام کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً بے شمار قوموں نے اُسے تاخت وتاراج کیا ہے۔ اس کا تمدن بھی بہت قدیم ہے۔ اور یونانی تمدن سے ۔ زیادہ قدیم ہے۔ بلکہ یونان میں علم وحکمت کا چراغ یہیں کے حکماء۔ شعراء اور فلاسفر نے جلایا ہے۔ چنانچہ مشہور فلاسفر تہالس، بٹاگوس بیاس۔ کلیوبولو۔ الیکسندریس۔ فیثاغورث۔ اور زینوفون۔ ہرکلیس، اور ہومر جیسے شہرۂ آفاق

شاعراسی کی مبارک خاک کے درخشان وتابناک ذرے ہین جن کی یاد سے آج بہی ادبی دنیا کے قلوب متحرک ہین۔یہی ذرے تہے جنہون نے آجتک یونان کے نام کو چار چاند لگائے۔

اب ہم اس کی قدیم تاریخ سے ہٹ کر اس کے کچھ انقلابی دوروں کا تذکرہ کرتے ہین کہ باوجود ان شدائد و مصائب کے آج بھی اس کی وہی حالت ہے جو اب سے پہلے ازمنۂ قدیمہ مین تہی سنہ ۲۱۱ ق-م مین یونانیون نے اناطولیہ مین قدم جمانا شروع کئے اور اس کے باشندون کو بتدریج مغلوب کرنے لگے سنہ ۵۴۶ ق-م مین کورش شاہ ایران نے اس پر قبضہ کیا۔پہر ایرانیون کے ساتھ اسکندر اعظم کے معرکے اس سرزمین نے دیکھے۔اس کے بعد سپہ سالارون کی خانہ جنگی کا میدان بھی اس این گرم ہوا۔سنہ ۲۷۲ ق-م مین تدسر کی عربی ملکہ زنوبیہ نے اس کے ایک بڑے حصے کو فتح کیا۔لیکن کچھ روز کے بعد رومانیون نے اسکو پھر واپس لے لیا۔ اورجب سنہ ۳۳۰ء مین قسطنطین اعظم نے بزنطینیہ (قسطنطنیہ) کو روما کے مقابلے مین مشرقی سلطنت کا پایۂ تخت قرار دیا تو اناطولیہ کی طرف اسے خاص توجہ ہوئی۔اور اوس نے اور اس کے جانشینون نے اس کی اصلاح وتعمیر مین پوری کوشش کی اور اسکو گلزار بنادیا۔

اسی رومی عہد مین اناطولیہ نے بہت ترقی کی خصوصاً اس وجہ سے کہ مسیحیت کا وہ ایک مرکز ہوگیا تہا۔ اورحواریون کی کارگذاریون کا ایک بڑا حصہ اس سے متعلق تہا۔ وہ سات مسیحی گرجون کا مرکز تہا۔ اوراسی مین متعدد مذہبی تاریخی اجتماع منعقد ہوئے۔ جوتاریخ عیسوی کا قابل یادگار سرمایہ ہین

(۲)

ساتوین صدی عیسوی سے اس پر مسلمانون کے حملے شروع ہوتے ہین۔چنانچہ عربون نے مشرقی ملیشیا کا علاقہ فتح ہی کر لیا تہا۔لیکن سنہ ۹۶۵ء مین رومیون نے اُسے پہر واپس لے لیا۔سنہ ۱۰۶۷ء مین ترکون نے ملیشیا فتح کیا۔ اورگیارہوین صدی ختم نہ ہونے پائی تہی کہ تقریباً پورے اناطولیہ پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ اورشہر قونیہ کو انہون نے اپنا پایۂ تخت بنالیا۔صلیبی جنگون کے دوران مین اناطولیہ ہی مین ہوکر مجاہد جاتے تہے ۔ اوراسی بناپر یہان انکو مسلمانون سے بہت سی خونریز لڑائیان لڑنا پڑین اورسنہ ۱۱۰۱ء مین ان کے پانچ لاکھ آدمی اس اناطولیہ کے میدانون مین ہلاک ہوئے۔سنہ ۱۲۶۲ء مین تاتاریون

نے اسکو پائمال کیا۔ ۱۲۸۸ء مین عثمان بن طغرل نے سلجوقیون کی سلطنت پر قبضہ کر کے اناطولیہ کو بالکل عثمانی ملک بنا دیا۔ سلطان اورخان ابن سلطان عثمان نے قونیہ کے بجائے بروصہ کو دارالسلطنت قرار دیا۔ اور ملک کو بہت ترقی دی۔ ۱۴۰۲ء مین تیمور لنگ نے حملہ کیا اور سلطان بایزید کو شکست دیکر اکثر علاقون پر قابض ہوگیا۔ مگر چند ہی روز مین سلطان محمد فاتح نے تمام علاقہ جات واپس لے لئے۔ اور قسطنطنیہ و طرابزون کو فتح کر کے اناطولیہ کو بالکل محفوظ کر لیا۔ اسوقت سے یہ ملک برابر عثمانیون کے قبضہ مین ہے۔ محمد علی پاشا مصری نے بھی اس پر اسی صدی مین یورش کی تھی۔ اور اس کے اکثر حصون کو فتح کر لیا تھا۔ مگر یہ واقعہ چندان اہمیت نہین رکھتا۔ کیونکہ اول تو یہ اندرونی خانہ جنگی تھی اور دوسرے یہ کہ تھوڑے ہی عرصہ مین محمد علی پاشا کو تمام ملک خالی کر دینا پڑا۔

۳

لہذا صحیح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سات سو برس سے اناطولیہ عثمانی ترکون کا قومی وطن ہے اسی مین ان کی ساری آبادی ہے۔ اور اسی پر ان کی سلطنت کی بقا ہے۔ لیکن یوروپ کی مسیحی طاقتین خصوصاً برطانیہ ترکون کو اس ملک مین بھی آزاد نہین دیکھنا چاہتی۔ اب تک یہ کہا جاتا تھا کہ یوروپ کی سرزمین پر ترکون کو رہنے کا حق نہین۔ چنانچہ ڈیڑھ صدی کے اندر اُنھین یوروپ سے جلا وطن کر دیا گیا۔ لیکن آئے دن ترکون کو ان کے ایشیائی وطن سے بھی جلا وطن کرنے کی ترکیبیں ہوتی رہتی ہین وہ نہین چاہتی کہ ایشیا کی سرزمین پر بھی یہ قوم آزاد رہ سکے۔

اقتباسات

(انگریزی جرایدورسایل سے)

رفتارزمانہ

(مولاناعبدالستارصاحب فاروقی)

رومیون کا وجود برطانیہ مین۔

پروفیسر آر۔جی۔کالنگ اوڈ جو "برطانیہ پررومی قبضہ" کے زبردست زندہ موئدین مین سے ہین ابھی ایک درمیانی رپورٹ جو ماہ ستمبر ناٹ اینڈ فلیٹ اوڈ مین ملے ہوئے رومی سکون پر مشتمل ہے لکھتے ہین کہ ان سکون کا اکتشاف اسقدر اہمیت رکھتاہے کہ جس سے رومن برطانیہ کی تاریخ پر نظرثانی کرنالازمی ہوگیاہے۔ ان سکون مین بہت سے ایسے ہین جو روم ہی مین مضروب ہوئے ہین۔ وہ نہ صرف نادرات زمانہ مین سے ہین بلکہ تاریخی نقطۂ نظرسے ان کی اہمیت بہی بہت زیادہ ہے دوسکون پر والیرنس Valerianus اورسلونیئس Saluninus بادشاہون کے نام کندہ ہین، یہ رومی ٹکسال کے ڈھلے ہوئے ہین۔ اس لیے سکون کے نظریہ کی روسے شمالی مغربی انگلستان پر رومی قبضہ کی مستند تاریخ متعین کی جاسکتی ہے۔ اوراس ایک امرسے اس مضمون کی تمام پچہلی تاریخون کا منقلب ہوجانا بعید از قیاس نہ ہوگا۔

موجودہ ذہنیت پروفیسر رابرٹ اے ملیکان کا جومشہور عالم سائنس دان اور علم طبیعات مین نوبل انعام حاصل کرچکے ہین۔ دعوی ہے کہ آج سے تین ہزار سال پہلے یعنی ایتھینیہ اوراسکندری عہد کی عقل سے موجودہ انسان کی دماغی حالت ہرگز زیادہ نہین ہے۔ وہ فرماتے ہین کہ یہ سچ ہے کہ عالم طبیعات کے اختراعات جدیدہ سے عالم سائنس مین ایک انقلاب برپا ہوگیا ہے لیکن جہان تک

ہم عہد کہن کی تہذیب و تمدن کا موجودہ تمدن سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ہم ان میں یک نسبت پاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح آج لوگ اٹھتے بیٹھتے اور بات چیت کرتے ہیں یہی تمام آج سے دو تین ہزار سال پیچھے بھی نظر آتی ہے۔

ان چیزوں سے جیسے عورت کا حسن آدمی کی قوت، خواہشات کی لذت، پھولوں کی خوشبو دوستوں کی دوستی، عدالت، طلاق و زوجیت اور گھوڑوں کی ریس، پتنگ بازی کے آج بھی وہی اثرات لوگوں کی زندگیوں پر مترتب ہوتے ہیں جو پہلے ہوا کرتے تھے۔

زندگی کے مقاصد عالیہ کی رو سے بھی دیکھا جائے تو ہم نے کوئی ترقی نہ کی ہے اور نہ کر رہے ہیں۔ بارہا یہ سوال اٹھایا گیا اور ہمیشہ دنیا کے نیک نام ادیبوں فلاسفروں اور مذہبی پیشواؤں کی طرف سے اس کا جواب نفی میں ملا ہے۔ آج سے تین ہزار سال پہلے کی فنون لطیفہ سے متعلق طوتا خامن کے مقبرہ میں چیزیں ملی ہیں جو بہر حال اس شعبہ کی موجودہ چیزوں سے اپنی ہمسری کا دعویٰ کر رہی ہیں۔

اگر ہم بسہولت تمام تحیر خیز یونانی مجسموں اور یونانی تعمیری آثار کی نقل اتاریں تو پتہ چل جائیگا کہ آج ہماری دماغی حالت ایتھنی اور اسکندری عہد کے مقابلہ میں کہاں تک ترقی یافتہ ہے۔

ایک مغربی خاتون صحرائے عرب میں کاؤنٹس ملگنسٹی وہ پہلی یوروپین خاتون ہے جس نے عرب کے ان صحراؤں سے سفر کیا ہے جن سے مغربی سیاح بھی بہت کم واقف ہیں۔ اس خاتون نے اپنے اس سفر کی کہانی وائڈ ورلڈ میگزین میں قلمبند کی ہے۔ عرب سلاطین سے اجازت لیکر اس نے دمشق سے ایک بڈھے اونٹ والے کی رہنمائی میں اپنے سفر کا آغاز کیا اور راستہ کی صعوبتوں اور تکلیفوں کو سہتی ہوئی مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئی اور یہاں سے پھر دمشق کو واپس ہوگئی۔ اس دوران میں وہ عربی لباس استعمال کرتی رہی۔ اس نے دوران سفر کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جسے یہاں نقل کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا

"شام کے کھانے کے وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک عرب میرے لئے کھانا لا کر پیالے

دکھا اور یکایک بے تحاشا کود کر دوسری طرف جا رہا۔ مین نے پوچھا کیا ہوا؟ تو اس نے جواب دینے کی بجائے رونا اور ساتھ ہی ساتھ ہنسنا بھی شروع کر دیا اور اچھلتا کودتا ہوا گلے گانے اور چلّانے لگا۔ مین سمجھی یہ پاگل ہوگیا ہے۔ اس لئے شیخ کو آواز دی" خدا کے لئے" اُس نے آتے ہی کہا۔ جلد باجہ بجاؤ اس کو تو ترنتولا Tarantula نے کاٹا ہے۔ یہ سنتے ہی نوکرون نے ٹین پیٹنا شروع کر دیا۔ بیچارہ مجروح اچھلتا کودتا ناچتا شور کرتا: قریباً ۲۰ منٹ تک یہ شور و غل ہوتا رہا۔ پھر وہ بیہوش ہوکر گر پڑا۔ "اب اسکی جان بچی" شیخ نے کہا۔ وہمی آدمیون کا خیال ہے کہ راگ راگنی سے ترنتولا کاٹے کی جان بچتی ہے۔ لیکن دراصل بات یہ ہے کہ ایسے مجروح کو بہت زور شور سے ناچنا چاہئے۔ جب وہ آدمی ٹھیک ہوچکا تو ترنتولا کی تلاش ہونے لگی۔ کیونکہ یہ ڈر تھا کہ کہین وہ اور کسی کو مجذوب یا مجروح نہ کر دے۔ وہ مرے چھوٹے ٹیبل کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بنفشی رنگ کا بڑے مکڑے کی صورت کا تھا۔ مین نے چاہا کہ اسکو مار کر رکھ لون مگر انہون نے کہا کہ یہ مرا ہوا بھی ضرر پہونچاتا ہے۔ اس لئے اسکو پامال کرکے خاک مین ملا دینا بہتر ہے۔

عورتین کیا کر رہی ہین۔ "استری دھرم" ہندی جریدہ نے دنیا کی عورتون سے متعلق حسب ذیل معلومات شایع کی ہین۔ چین کی دو مشہور ڈاکٹر لیڈیان۔ ڈاکٹر ٹنگ چی موٹی ڈکنیٹن اعلیٰ پیمانے پر عورتون اور بچون کے ایک ہسپتال کی دیکھ بھال کرتی ہین وہ خود اس کی مالکہ ہین۔ ڈاکٹر مری اسٹون نے بھی اسی قسم کا ایک ہسپتال ننگہائی کے وسط مین کھولا ہے۔ ان دو کے علاوہ پیکن کی یاماکن لیڈی ڈاکٹر بھی اپنے پیشہ مین مشہور ہین۔

جاپان کی کاروباری عورتین۔ "ہوم آفس سوشیل بیرو" کی اطلاع کے موافق جاپان مین گیارہ لاکھ عورتین کاروبار کرتی ہین۔ ان مین سے ۵۰ فیصدی صرف ٹوکیو مین رہتی ہین لیڈی ڈاکٹر نرس اور اسی شعبہ کی دوسری عورتون کی تعداد ۹۸۰۰۰ ہزار ہے استانیان ۷۸۰۰۰ ہزار ہین۔ سرکاری دفاتر مین ۴۵۰۰ ہین تجارت پیشہ عورتون کی تعداد چھ لاکھ ۷ ہزار ہے۔

فلسطینی عورتوں کی ترقی۔ فلسطین میں ایک یہودی انجمن مساوی حقوق نسواں ہے جسکی شاخیں سات بڑے بڑے شہروں میں ہیں۔ اسکی ایک ہزار عورتیں ممبر ہیں۔ ایک لاکھ عورتوں میں سے اٹھائیس کو فلسطین کی نیشنل اسمبلی کا ممبر نامزد کیا گیا۔ اسمبلی کی مجلس منتظمہ کی ۳۳ مردوں میں چار عورتیں بھی ممبر بنائی گئی تھیں۔

اضطرار شاد

(محمد ارشاد حسین شاد صابری)

شوق میں ہیں دیدہ و دل بیقرار — ہو گئی محفل کی محفل بیقرار
انقلاب دہر دکھلا کر ہمیں — کر دیا عالم میں اے دل بیقرار
اور کیا ہو انقلاب شوق میں — ہیں نگاہیں مضطرب دل بیقرار
فرصت نظارۂ عالم کہاں — اپنے جلووں میں ہے کامل بیقرار
گردشوں میں ہیں زمین و آسمان — ہو رہی ہے ہر دو منزل بیقرار
رہ گئی تھک تھک کے سعی نا تمام — آئیں موجیں تا بہ ساحل بیقرار
دیکھ لے برق تجلی دیکھ لے — شوق میں ہے جذبۂ دل بیقرار

دیکھئے نیرنگی عالم کو شاد
جائیے منزل بمنزل بیقرار

معلومات

دنیا کی سب سے بڑی چیزین کہان ہین

(مولانا محمد عمر انصاری)

دنیا کا سب سے بڑا **بینک** لندن مین۔ سب سے بڑا **اسپتال** پیرس مین۔ سب سے بڑا **کلیسہ** روما مین۔ سب سے بڑی **حجری عمارت** مصر مین۔ سب سے بڑا **پل** نیویارک مین۔ سب سے بڑا **مطبع** واشنگٹن مین۔ سب سے بڑا **جرس** اوس کا (جرمنی) مین (اس جرس کی بلندی ۲۶ قدم دائرہ ۴۸ قدم اور وزن ۷۴ ٹن ہے) سب سے بڑی **نہر** امریکہ مین (جو نہر ما زون کے نام سے مشہور ہے۔ اس نہر کا طول ۴ ہزار میل سے زاید تبلایا جاتا ہے) اور سب سے بڑا پہاڑ ہندوستان مین ہے۔

عکاس خانے یا سینما

دنیا کے بڑے بڑے ممالک مین عکاسخانون (سینما) کی تعداد حسب ذیل ہے۔

امریکہ (۱۸۰۰۰) جرمن (۳۷۲۱) روس (۳۵۰۰) برطانیہ (۳۲۰۰) فرانس (۲۴۰۰) ایطالیہ (۲۴۰۰) بلجیم (۸۰۰) سوئیڈن، ناروے اور ڈنمارک (۷۷۹) پولنڈ (۷۰۳) ہالنڈ (۲۲۷) اسپانیا (۱۵۶) ترکی (۲۳) آج کل ترکی مین عکاسخانون کی روز افزون ترقی ہو رہی ہے۔ (گلشن فارسی)

حال ہی مین جریدہ **الفیحا** نے دنیا کے بعض بڑے شہرون کی آبادی کے متعلق جو اعداد شمار پیش کئے ہین وہ حسب ذیل ہین:۔

لندن (۷۴۷۶۸۰) نیویارک (۵۹۰۰۴۸) برلن (۴ ملین) پیرس (۳ ملین) شکاگو (۲۷۰۱۷۰۵) ٹوکیو (۲۱۷۳۰۰۰)

دنیا کا طویل ترین نام

اسوقت دنیا کا طویل ترین نام چکاگو کے ایک شخص کا خیال کیا جاتا ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

Gust, j, papa theodora Kawnoid urgisto mochala Kupulas.

ئسٹ جے پاپا تہیوڈور گونڈ و رگسٹو مکالا کوپوس۔

حال ہی مین نیو یارک مین ایک کتاب دستیاب ہوئی ہے۔ جو دنیا کی سب سے بڑی کتاب خیال کی جاتی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ کا طول ۱۰ قدم اور عرض ۵ قدم ہے

رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے حال ہی مین بدھ مذہب کی ایک قدیم دستاویز کا انکشاف کیا ہے۔ اس دستاویز پر چینی زبان مین ۶۷۵ء لکھا ہے۔

اس وقت دنیا کا سب سے بڑا وصیت نامہ فریڈرک البعی کول کا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ وصیت نامہ کتابی صورت مین ۴۶۱ صفحات پر بسیط ہے۔ اور ہر صفحہ مین (۱۹۰) الفاظ ہین۔

ماچس کی ایجاد کو کامل ایک صدی کا زمانہ گذرا۔

دنیا مین جس قدر جرائد شایع ہوتے ہین۔ اس کا نصف صرف امریکہ سے شایع ہوتا ہے۔

انگلستان کے قدیم ترین "اسٹامپ کا رنگ" کالا تھا۔

یورپ مین سب سے پہلے پوسٹ آفس کا شعبہ ۱۴۶۴ء مین فرانس مین قایم کیا گیا۔ اس کے پہلے اسلامی حکومتون مین اس کا ایک خاص شعبہ ہوتا تھا۔

انسان ایک دقیقہ مین ۱۸ مرتبہ سانس لیتا ہے۔

شیکسپیر نے اپنی مؤلفات مین ۱۵۰۰۰ مختلف الفاظ استعمال کئے ہین۔ حالانکہ ابھی تک کسی انسان نے اپنی زندگی مین ۴۰۰۰ ہزار الفاظ سے زاید نہین استعمال کئے۔

ایک گھوڑے کی طاقت انسان کی طاقت سے نسبتاً ۷ ۱/۲ گن زائد ہوتی ہے۔

اگر ایک عورت کے سر کے بال ایک دوسرے سے جوڑ دئے جائین تو اس کا طول ۶۰ میل سے زاید ہوگا۔

مکڑی کو ۱۰ آنکھین ہوتی ہین۔ مکھی کی عمر پانچ سال سے زاید نہین ہوتی۔ مکھی ایک منٹ مین ۳۳۰ مرتبہ اپنے بازؤن کو حرکت دیتی ہے اور ایک کیلو میٹر مسافت طے کرتی ہے۔

تعارف

حسن خیال اڈیٹر رضی کاکوری اور سرشار کمنڈوی۔ مقام اشاعت دفتر حسن خیال منڈی سیہور، ریاست بھوپال قیمت سالانہ دو روپے۔

یہ بزم شعراء کا ماہانہ ادبی رسالہ ہے جس مین بیشتر حصہ نظم کا ہوتا ہے پرچہ زیر تبصرہ مین نثر کا صرف ایک مضمون ہے۔ جو ہر طرح قابل ستایش ہے نظمین بھی دلچسپ ہین۔ فی الجملہ رسالہ اچھا ہے۔ اور ایک قابل قدر کوشش ہے۔

امارت مدیر سید محمد عثمان غنی۔ مقام اشاعت پھلواری شریف پٹنہ قیمت سالانہ عہ ششماہی ۱۲/

ایک پندرہ روزی اخبار ہے جس مین علاوہ اور دلچسپیون کے ہر قسم کی خبرین اور اطلاعات بھی ہوتی ہین۔ اہل بہار کو خصوصاً اسکی سرپرستی کرنی چاہیئے۔

ریاست اڈیٹر دیوان سنگھ مفتون۔ مقام اشاعت دفتر ریاست دہلی قیمت سالانہ چھ روپے ششماہی تین روپے۔

ایک ہفتہ وار اخبار ہے جو ہر سنیچر کو شایع ہوتا ہے مضامین اعلیٰ معلومات انوکھی۔ مقالات دلچسپ اور تصاویر دیدہ زیب و پسندیدہ ہوتی ہین۔ ہندوستان کے ہفتہ وار اخبارون مین ممتاز ترین اخبار ہے۔ لایق اڈیٹر نے مختلف النوع دلچسپیان جمع کرنے مین بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔

ہنٹر پنچ اڈیٹر عثمان محمد حاجی واللہ۔ مقام اشاعت دفتر ہنٹر پنچ امام باڑہ بمبئی نمبر ۹ قیمت

سالانہ چار روپے ششماہی ڈھائی روپے۔ ایک مزاحی ہفتہ وار اخبار ہے جس میں تفنن اور تفریح کے کافی سامان موجود ہوتے ہیں۔ بمبئی کے لئے یہ کوشش لایق تحسین ہے۔

ماہر اڈیٹر حکیم محمود علی خان ماہر اکبرآبادی۔ مقام اشاعت فراشخانہ دہلی۔ قیمت سالانہ چار روپے ششماہی دو روپے چار آنے۔

ایک ہفتہ وار اخبار ہے جس میں طبی معلومات کے اضافہ کے ساتھ تمام دلچسپیاں جمع ہوتی ہیں۔ حکیم صاحب کی یہ کوشش ہر طرح امداد کی مستحق ہے۔

الخلیل ایڈیٹر محمد خلیل الرحمن مقام اشاعت بجنور۔ قیمت سالانہ پانچ روپیہ ششماہی ڈھائی روپے ہفتہ میں دو بار بجنور سے شایع ہوتا ہے۔ ایک اچھے اخبار میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ تمام موجود ہیں۔ اہل ذوق حضرات کو اس کے ملاحظہ کی کوشش کرنی چاہیئے۔

الکامل ایڈیٹر ابو علی آزاد بہاری اور ابوالعلا بہاری مقام اشاعت دفتر چشمۂ کامل دہلی۔ چندہ سالانہ عہ ہر قسم کے مضامین کا ایک ماہوار رسالہ ہے۔ قیمت کے لحاظ سے ارزاں ہے اور مضامین کے لحاظ سے اعلیٰ۔ لایق ایڈیٹروں کو تھوڑی اور توجہ کرنی چاہیئے۔

(خلیل احمد سبکروی)

تازہ بتازہ نو بنو

ایجاب

(از مولوی شیخ عباس صاحب)

اگرچہ یہ مسئلہ بہت فرسودہ اور پامال ہو چکا ہے۔ اور اسپر مشاہیر قوم نے اپنے زرین خیالات کا بارہا اظہار فرمایا ہے۔ تاہم یہ مسئلہ ابھی تک اس قدر تشنہ و غیر منفصل ہے کہ ابھی اسپر بہت کچھ لکھا جانا چاہئے۔ مین چاہتا ہون کہ اسپر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائے۔ اسوقت اس مسئلہ کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالونگا۔

پردہ کے دو پہلو دکھانے سے اسکی پوری اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک پہلو تو ایجابی ہے۔ دوسرا سلبی۔ ہم اس موقع پر سلبی پہلو کے ایک عنوان پر بحث کرنا چاہتے ہین۔ سلبی پہلو مین پردہ اُٹھ جانے سے ایک خطرہ حیا کے اُٹھ جانے کے متعلق ہے۔ انسان خواہ وہ کسی قطعہ ارضی کا بسنے والا ہو حیا کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتا ہے۔ کون نہین جانتا کہ عورت کا بہترین زیور حیا ہے۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو حیا ہی وہ زبردست قوت ہے جو عصمت کی دیوی کی نگہداشت اور رکھوالی کر سکتی ہے اگر یہ چیز نسوانی زندگی سے گم ہو جائے تو بجا کہنا بجا ہے کہ عورت زیور عورتیت سے عاری ہے۔ اگر ایک انسان اپنے جوہر اور اوصاف کم کر کے ترقی کرے تو درحقیقت وہ انسانی ترقی نہین ہے۔ اصلی ترقی تو وہ ہے جو حدود اخلاق اور اوصاف انسانیت کو قایم رکھتے ہوئے بلندی کی طرف قدم بڑھائے جائین۔ اگر مذکورہ بالا امور مسلم ہین تو ہمین ایک نظر اس طرف ڈالنی چاہئے۔ کہ آیا بے پردگی سے یہ جوہر عورتیت زائل ہو رہا ہے یا نہین۔ اگر ہم سرسری طور پر دیکھین تو آج یورپ اور دیگر مغربی ممالک کے تلخ تجربات اور مثالین ہمارے لئے عبرتناک بصیرت کا سامان پیدا کر رہے ہین۔

داستان آرزو

(از جناب غلام علی خان صاحب مانی بی اے اجمیری)

برق سوزان بر دیارم آرزوست
قلبِ بریان در کنارم آرزوست

الّذاذِ انتظارم آرزوست
دلبرِ غفلت شعارم آرزوست

زیر سر چرخِ چهارم آرزوست
تکیہ بر زانوئی یارم آرزوست

دل ز عشقش داغدارم آرزوست
منظرِ صد لالہ زارم آرزوست

جان و دل را مضطرب دارد سدا
آن خلش پروردگارم آرزوست

سبزہ زارم چشم دارد از خزان
بادِ صرصر در بہارم آرزوست

حاجتِ ہمدم ندارم نہ چراغ
شمع روئی بر مزارم آرزوست

بر جگر خوردہ خدنگ نیم کش
مثلِ ماہی بیقرارم آرزوست

جامِ صہبا را نمی خواہم مگر
یک نگاہِ مستِ یارم آرزوست

تا شود سیراب کشتِ تشنہ لب
چشمہائی اشکبارم آرزوست

بشنود مانی بخلوت او شبے
داستانِ حالِ زارم آرزوست

اُردو زبان کا مشہور کثیر الاشاعت علمی و ادبی رسالہ

ہمایون لاہور

اڈیٹر میان بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا ہمایون کی باطنی خوبیان اسکی ظاہری شان سے کم نہین۔ ہمایون کا کاغذ اسکی لکھائی چھپائی اسکی تصویرین دلکش ہین ہمایون کے بلند پایہ علمی ادبی اور اخلاقی مضامین اس کے افسانے اور اسکی گران پایہ نظمین نہایت دلچسپ اور مفید ہین ہمایون پانچ سال سے ملک کی خدمت انجام دے رہا ہے اور تاریخ اشاعت کی پابندی کے لحاظ سے بے نظیر ہے چندہ سالانہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپے علاوہ محصولڈاک منیجر رسالہ ہمایون ۳۰ مزنگ روڈ لاہور

خریداران ہنٹر پنچ کو انعام

۱۹۲۷ء کے سال کی پوری خریداری رجسٹر کرنیوالے احباب کو بطور انعام ایک ضخیم ناول کتابی صورت مین

صوفی نما ٹھگ مکمل

اچھی لکھائی اور چھپائی سے مزین کیا گیا پیش کیا جائیگا یہ وہی ناول ہے جسکو دو سال سے ہمارے ناظرین ہنٹر پنچ کے مضمون مین ملاحظ فرما رہے ہین جس مین نواب کی سادہ لوحی بیگم صاحبہ کی عیاری خرانٹ بوڑھی دایہ کی چالبازی ایماندار ملازمونکی جانسوزی صوفی نما ٹھگ کی مکاریان پولیس کی ہوشیاری قابل دید ہے تمام خریداری آخر دسمبر تک آجانی چاہئے۔

مینجر ہنٹر پنچ جوناگیا ٹھا شوستری امام باڑہ بمبئی نمبر ۹

تمام اردو رسالون سے مقابلہ

پیمانہ .... اور

الحمد للہ کہ رسالہ پیمانہ ۱۹۲۳ء سے جاری ہے۔ اور برابر ترقی کر رہا ہے۔ آج اکثر رسالے پیمانہ کی تقلید کو باعث فخر سمجھتے ہین۔ پیمانہ کی قیمت اب تک ۵؎ سالانہ تھی مگر اب

جنوری ۱۹۲۷ء سے

صرف مقابلہ مین کامیاب ہونیکیلئے مع محصول چار روپیہ کر دی گئی ہے اس رعایت سے فوراً فائدہ اٹھائیے ۲۰×۳۰ سائز کے ۸۰ صفحات ایک بلاک کی تصویر متعدد نظمین متعدد افسانے ڈرامے۔ علمی و تاریخی مضامین عجیب و غریب تحقیقی معلومات ظرافت ادبی خبرین۔ غرضکہ پیمانہ عام دلچسپی کا ایک بہترین خزانہ ہے۔ نمونہ مفت نہین دیا جاتا ۵ کے ٹکٹ بھیجئے۔

ناظم پیمانہ۔ آگرہ

سید منیر الحسن مالوی بامحود

مرتّب

رشید صدیقی

معاون

منیر الٰہ آبادی

نومبر ۱۹۲۶ء

معاون

خلیل احمد سکروی

عہ/

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بزم ادب

بمبئی جیسے بڑے تجارتی شہر میں جہاں ہر قسم کے سامان عیش کی فراوانی اور ضروریات زندگی کی افراط باعث آرام و مسرت ہے۔ وہاں بعض اہم اور اسی لازمی چیزوں کی کمی حد درجہ تکلیف دہ ہے۔ منجملہ ان کے موزوں اور حسب ضرورت کتب خانوں اور لائبریریوں کے وجود کی کمی ہے۔ اتنے وسیع شہر کے اس سرے سے اس سرے تک کوئی ایسا مکمل کتب خانہ نہیں ہے جہاں ہر کس و ناکس کو ہر قسم کی کتابیں میسر آسکیں۔ یہ ایک ایسی کمی ہے جس کا احساس کم و بیش ہر ذی علم شخص کو ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات تو ایسی دقت پیش آجاتی ہے کہ جس کا حل سوا بیکسی اور بیچارگی کے ساتھ خاموشی و صبر کے کچھ نہیں ہوتا۔

اس سے یہ مقصود نہیں کہ یہاں کتب خانوں کا وجود سرے سے ہی مفقود ہے۔ دو چار ایسی لائبریریاں موجود ہیں جو اہل شہر کی ضرورتوں کو پوری کرتی ہیں۔ لیکن انہیں بالکل حسب ضرورت اور حسب حیثیت وسیع بنانے کے لئے تھوڑی توجہ کی ضرورت ہے۔

کیا بمبئی کے اہل علم و اہل دل حضرات اس جانب توجہ کریں گے؟

زبان اردو کے سلسلہ میں ہم بمبئی کی تعلیمی حالت پر بھی ایک نظر ڈالنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کیونکہ "ادبستان" کے اجرا سے ایک بڑا مقصد اس حصۂ ملک میں ترویج و اشاعت زبان بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس وقت تک رسالہ کو اس معیار تک نہ لا سکے جو ہمارے پیش نظر ہے کیونکہ اندیشہ ہے کہ عوام اس سطح تک پہونچنے سے قاصر ہیں اور (خدانخواستہ) ہماری کوششیں ناکام ثابت ہوں۔ اب اس مقصد اور یہاں کی تعلیمی حالت سے جو تعلق ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن اس خصوص میں ہم اپنی رائے فی الحال محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

ہماری علمی کاوشیں

(از خلیل احمد سیکروی)

ہمارا علمی شغف دو حیثیتوں سے قابل غور ہے۔ مسلمانوں کی خصوصیات علمی ہر دور میں امتیازی رہی ہیں اور ہندوستان کا مذاق علمی بھی کچھ کم ممتاز نہیں رہا۔ پس ہماری مذہبی اور وطنی دونوں حیثیتیں اس خصوص میں شاندار ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارے کریکٹر کا کوئی پہلو خوبیوں سے اس درجہ مملو ہو کہ اس میں برائیوں کے تلاش کرنے کو جی نہ چاہتا ہو لیکن تحقیق و تنقید کی نظروں سے تو بہرحال دنیا کی کوئی شے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

دور موجودہ میں ہماری تعلیمی ترقی بمنزلہ صفر کے سہی لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم میں کم و بیش ہر قسم کے علوم و فنون کا چرچا ہے۔ اب ان کی تقسیم یوں کی جا سکتی ہے کہ سائنس ریاضی اور انجینئرنگ وغیرہ جیسے علوم و فنون تو بالکل مغربی سمجھ لئے گئے ہیں۔ ادب و زبان مشترکہ مانی جاتی ہے مسلمانوں کے حصہ خاص میں علم دین طب اور تاریخ رہ گئے ہیں۔ اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان تینوں علوم میں علیحدہ علیحدہ بہت کچھ کوشش کی جا چکی ہے اور ہو رہی ہے۔

اسوقت صرف تاریخ ہی کو لیجئے مختلف انجمنوں نے اجتماعی حیثیت سے اور بہت سے حضرات نے انفرادی حیثیت سے اس باب میں کوششیں کی ہیں۔ ساتھ ہی یہ سلسلہ روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ لیکن اگر اس ذوق کی جستجو کیجئے جو اسوقت مغرب کی متمدن دنیا کا سرمایہ ہے تو ابھی بہت کمی نظر آئے گی۔ تاریخ کی دو زبردست صورتیں ہیں ایک کتابی اور دوسری جنسی کتابی صورت میں تو بہت کچھ مواد فراہم ہو چکا ہے لیکن جنسی صورت میں ابتک اجتماعی یا انفرادی حیثیت سے کچھ نہیں کیا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہندوستان میں آثار قدیمہ کے دریافت کرنیکے لئے انجمنیں (Research Societies) ہیں متعدد میوزیم یا عجائب خانے بھی ہیں لیکن وہ تمامتر ہمارے نہیں ہیں۔

تاریخ میں کتاب اور جنس کا تعلق بہت زیادہ ہے۔ کسی زمانہ کے تمدن کے حالات تواریخ میں پڑھئے اور اسی کا نقشہ کھنڈرات سکہ جات اور دیگر قدیم اشیاء میں دیکھئے تو فوراً اندازہ ہوجائیگا کہ دونوں کا اثر کس درجہ مفید و موثر ہے۔

ممالک مغربی کے اہلِ ذوق حضرات انفرادی حیثیت سے جہاں نایاب کتابوں کے فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہیں آثار قدیمہ کے جواہر ریزوں کی تلاش میں بھی سرگرداں رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا دوران قیام شاہجہانپور میں البتہ میں نے ایک صاحب کے پاس کچھ قدیم سکے، تلواریں، چھریاں وغیرہ دیکھی تھیں جو کسی حد تک تاریخی اہمیت رکھتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ افسوسناک بات بھی تھی کہ وہ ان سے کوئی نتیجہ نہیں نکالنا جانتے تھے۔ برخلاف اس کے دوسرے متمدن ممالک کا یہ عالم ہے کہ اس ذوق کو ابھارنے کے لئے وہ کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اسکاؤٹنگ (Scouting) میں بھی جو ایک جدید اور بہت ہی معمولی تحریک ہے۔ اس امر کی ترغیب موجود ہے۔ کہ اسکاؤٹ (Scouts) اپنی لائبریری کو زیادہ قیمتی بنانے کے لئے قدیم اشیاء کے فراہم کرنے کی کوششیں کریں۔

یہی نہیں بلکہ اگر آپ تلاش کریں گے تو ایسے بہتیرے لوگوں کے حالات ملیں گے جنہوں نے محض اپنی کوششوں سے ایک قیمتی اور نایاب ذخیرہ تاریخی اشیاء کا فراہم کرلیا۔

اسی سلسلے مین کلیفورنیا (امریکہ) کے ایک ذخیرہ کا ذکر خالی دلچسپی نہ ہوگا جو محض مختلف انواع، مختلف زمانہ، اور مختلف ممالک کے گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ اس ذخیرہ کے جامع نے اپنے واقعات سفر اور تلاش ایک مختصر کتاب کی صورت مین شایع کئے ہین۔ اس کتاب سے مختصراً کچھ واقعات پیش کئے جاتے ہین۔

"میرے اس ذخیرہ کی ابتدا ۱۹۰۵ء مین نہایت معمولی طور پر ہوئی اس سال میری لڑکی روم مین تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ کرسمس کا زمانہ

تھا میری لڑکی اپنی دوسری اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ کرسمس کے لئے کچھ سامان خریدنے گئی۔ ان میں سے ایک نے ایک دکان میں کچھ پرانی گھنٹیاں دیکھیں۔ جن میں سے ایک پر کچھ فوجی سپاہیوں کی صورتیں بنی ہوئی تھیں۔ چونکہ میری لڑکی کو میرا تاریخی شغف معلوم تھا اس لئے اس نے اسے کرسمس کے موقع پر بہترین تحفہ خیال کیا اور خرید لائی۔

وہ گھنٹی جس پر کچھ سپاہیوں کی صورت بنی ہوئی تھی مجھے بہت پسند آئی۔ میرے دماغ میں فوراً اٹلی کی قدیم عمارات کے خاکے اور سپین کے اونچے برجوں کے نقشے گشت لگانے لگے۔ مجھے گرجا گھر کے گھنٹے یاد آئے اور میں نے خیال کیا کہ جہاں ان گھنٹوں کو مذہبی اہمیت حاصل ہے وہیں ان کا دوسرا یعنی تاریخی پہلو بھی زبردست حیثیت رکھتا ہے۔ پس میں نے گھنٹوں کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی دریافت سمجھا۔ اور جب دوسرے سال میں یورپ واپس گیا تو میں نے یہ دستور بنا لیا کہ جس شہر میں میرا گذر ہوتا میں وہاں سے کوئی ایسا گھنٹہ حاصل کرنے کی ضرور کوشش کرتا جس میں کوئی خاص بات ہو۔ چنانچہ جلد ہی یہ شوق میری تمام خواہشات پر غالب آ گیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں دنیا کا سفر نہایت دلچسپ تجربات سے لبریز تھا۔

اس موقعہ پر میں ایک قدیم گھنٹے کے حاصل کرنے کا واقعہ لکھتا ہوں جسے برٹش میوزیم نے مجھ سے لے لینے کی انتہائی کوشش کی۔ میں ویسٹ منسٹر برج ہوا تھا کہ وہاں کے بڑے گھنٹے (Big Bell) کو بجتے ہوئے سنا۔ میں نے دریافت کر کے یہ معلوم کر لیا کہ وہ گھنٹہ کس کارخانہ میں بنا تھا۔ چنانچہ دوسرے ہی

روز وارمر اینڈ سنز (Warmer & Sons) کے یہاں پہنچا اور پوچھا کہ وہ میرے ذخیرہ کے لئے Big Bell جیسا دوسرا گھنٹہ بنا دیں گے؟ پہلے تو انہوں نے اس درخواست کو محض مذاق سمجھا۔ لیکن پھر بنانے پر رضامند ہوگئے۔

اس کارخانہ میں ادھر ادھر نظر دوڑانے پر میں نے پرانے لوہے کے ڈھیر میں دو گھنٹے دیکھے جن میں سے ایک پر لاطینی زبان میں کچھ کندہ تھا۔ اور دوسرا مشرقی وضع کا تھا۔ لیکن دونوں اسدرجہ پرانے تھے کہ ٹوٹ جانے کے قریب تھے۔ میں نے نہایت عالی حوصلگی سے ان دونوں کو خرید لیا اور بہت محظوظ ہوا۔ میری لڑکی نے اسیوقت اس لاطینی تحریر کی نقل لی اور دوسرے روز برٹش میوزیم میں گئی کہ اس کا ترجمہ کرالائے اسے ایک افسر کے پاس پہنچایا گیا جس نے اس سے دریافت کیا کہ وہ گھنٹہ کہاں ہے اور اس نے بلا سوچے سمجھے بتا دیا۔ جب میں لوٹ کر دوبارہ اس کارخانہ میں گیا کہ گھنٹہ اٹھالاؤں تو وہاں کے ڈائرکٹروں سے ملاقات ہوئی جو مجھے باصرار قیمت واپس کر رہے تھے کیونکہ وہ گھنٹہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ معلوم ہوا کہ برٹش میوزیم کے حکام نے یہ کہلا بھیجا تھا کہ یہ گھنٹا ملک سے باہر نہ جانے پائے بلکہ اسے جنوبی کنسنگٹن کے عجائب خانہ میں بھیجدیا جائیگا۔ لیکن میں نے قبول نہیں کیا اور کہا کہ میں تو اسے خرید کرچکا ہوں۔ برٹش میوزیم والے دیر سے پہونچے لیکن وہ کسی طرح نہیں ملتے تھے چنانچہ میں نے سفیر امریکہ سے مدد چاہی مگر معلوم ہوا کہ وہ اس باب میں کچھ نہیں کرسکتے۔ اگر اس وقت مسٹر کریوڈسن نے میری مدد نہ کی ہوتی۔ جو برٹش میوزیم کے ٹرسٹیوں میں سے تھے تو غالباً ہمیں وہ گھنٹا نہ ملتا۔

اس گھنٹے کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ یہ مسیحی تاریخ میں سب سے پرانا گھنٹہ ہے۔ یہ اسپین کے بادشاہ جیمس اول کے زمانۂ حکومت (۱۲۴۷ء) میں بنایا گیا تھا۔ تاریخ نہایت صاف کندہ ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ یہ گھنٹہ انگلستان کیونکر پہونچا۔ گمان غالب ہے کہ یہ ان خانقاہوں میں سے کسی میں آویزاں تھا جو ہنری ہشتم کے زمانہ میں ڈھائی گئیں۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ گریٹ برٹین کا قدیم ترین گھنٹا اسٹفورڈ شائر
(s taffordshire) کندہ ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کی تاریخ صاف نہیں ہے اس لئے
بہت سے لوگوں کو اس کی صحت میں کلام ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ انگلستان میں ایک گھنٹا جو
سنہ ۱۲۹۹ء کا ہے۔ فرانس میں سنہ ۱۲۳۱ء اور جرمنی میں سنہ ۱۱۴۴ء کے گھنٹے موجود تھے لیکن کوئی
پچاس سال ہوئے کہ وہ ٹوٹ پھوٹ گئے۔ گھنٹے گرجوں میں ساتویں صدی عیسوی میں آئے لیکن بارھویں
صدی سے قبل ان پر تاریخ وغیرہ کندہ کرنے کا رواج نہ تھا۔

اس سفر کے دوران میں میں نے مختلف انواع کے تاریخی گھنٹے ہالینڈ۔ جرمنی۔ فرانس اور
اٹلی سے جمع کئے۔ روم میں میں نے ایک تانبے کا گھنٹا خریدا جو تقریباً چار سو سال قبل پال سوم کا تھا۔
سنہ ۱۹۱۱ء میں میں نے یورپ کا دوبارہ سفر کیا۔ اس زمانہ تک میرے پاس کافی ذخیرہ
ہو چکا تھا۔ لیکن اب تو خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ میری خوش نصیبی تھی کہ میں نے یہ سفر قبل از جنگ کیا۔
کیونکہ زمانۂ جنگ میں جرمنی اور بلجیم میں تمام گھنٹے دھات حاصل کرنے کے لئے گلا ڈالے گئے۔
سفر یورپ کے بعد میں نے اپنے لڑکے اور لڑکی کو مشرق کی جانب اسی غرض سے روانہ
کیا۔ انہوں نے تقریباً سو گھنٹے ہندوستان سے۔ اتنے ہی جاپان سے اور بہت سے دوسرے
مقامات سے جمع کئے جنمیں سے دو نہایت قیمتی تھے ایک قدیم یونان کا اور دوسرا عہد مغلیہ کا
ان کے علاوہ مندروں اور گرجوں کے بھی بہت سے گھنٹے تھے۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے چین۔
سیلون اور دوسرے مشرقی مقامات سے بھی ذخیرہ جمع کیا۔

کسی گھنٹا کے خریدنے کے وقت اس کی قیمت اور اہمیت نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ اسے صاف
کرنے اور اس کی تاریخ وغیرہ معلوم کرنے کے بعد اس کی قدر معلوم ہوتی ہے چنانچہ میں نے امریکہ
میں ایک جاپانی گھنٹا خریدا۔ بیچنے والوں کو نہیں معلوم تھا کہ اس پر کچھ کندہ بھی ہے۔ لیکن جب
گھر لا کر میں نے اسے صاف کیا تو اس پر یہ عبارت تھی۔

"ہونڈا یوشی متسو تیکوا کے دوسرے سال جون کے مہینہ میں ایک خوشی کے موقعہ پر زنکو

مدکو پاشہ دیا گیا۔

اب نیکوا کا دوسرا سال مطابق ہے ۲۶۱۹ء کے۔ گویا یہ بارہ سو ستر برس قدیم ہے۔ میرے
ہیں یہ جاپانیوں کا قدیم ترین گھنٹا ہے۔ اور کئی دھاتوں سے ملا کر بنایا گیا ہے جو اس زمانہ میں
د ہے۔

میرے ذخیرہ میں سب سے بڑا گھنٹا ۔ فٹ اونچا ہے اور اس کا وزن ۔ ٹن ہے یہ چین سے
۱۹ء کے انقلاب کے بعد خریدا گیا تھا۔

مذکورہ بالا واقعات کو دیکھتے ہوئے جن چیزوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ شوق اور
یہ ہیں۔ ہم میں شوق بھی ہے تو سرمایہ نہیں جس کی کمی کسی طرح پوری نہیں کی جاسکتی
م اس جانب توجہ کرنے کے بعد کچھ دکچھ تو ضرور کیا جاسکتا ہے۔

جواہر ریزے

(از اصغر علی صدیقی)

(۱) بیوقوف آدمی اپنی تعریف کرتا ہے مگر عقلمند آدمی بیوقوف کی تعریف کرتا ہے۔

(۲) مشغول دماغ مسرور رہتا ہے۔

(۳) نیک بیوی اور صحت دنیا کی بہترین دولت ہیں۔

(۴) کام میں آسانی مشق سے حاصل ہوتی ہے۔

(۵) ایسا شخص آج تک دنیا میں پیدا نہیں ہوا جو سب لوگوں کو خوش کر سکے۔

(۶) شب کا تاریک ترین حصہ صبح کے قریب ہوتا ہے۔

(۷) خیالات تمہارے بس کے ہیں مگر الفاظ نہیں۔

(۸) تم بدی سے بچو۔ بدی تم سے بچے گی۔

(۹) بہترین زمانہ موجودہ زمانہ ہے۔

اتفاق

(از منیر الہ آبادی)

[ذیل کی نظم انجمن معین الادب کے ماہانہ جلسہ میں پڑھی گئی۔]

سیم و زر سے بھی کہیں رتبے میں بڑھکر اتفاق
ایک جنس بے بہا ہے مثل گوہر اتفاق

شان کیں زیبا ہے لکھوں اس کے حل المشکلات
مشکلیں آسان کر دیتا ہے اکثر اتفاق

اک بڑا رکن رکیں ہے مذہب اسلام کا
چاہئے مسلم کو رہتے ہر جگہ پر اتفاق

درس اول تھا یہ تعلیم رسول اللہ کا
فرض ہے اسلام کے ہر مرد و زن پر اتفاق

ہار کر میداں سے بھاگے بے طرح اصحاب فیل
کر دیا ننھے پرندوں نے جو مل کر اتفاق

کرتا ہے قرآں میں بھی تاکید رب العالمین
کل مومن اخوۃ آیا ہے بنا بر اتفاق

کوئی قوت مات دے سکتی نہیں اس قوم کو
ہو کمر بستہ کھڑا جس کی مدد پر اتفاق

دولت و علم و حکومت سب میں بازی لے گئے
ہو گیا مشرق یہ مغرب کا منظر اتفاق

دم میں پہونچا قافلہ وہ منزل مقصود پر
بن گیا خوش قسمتی سے جس کا رہبر اتفاق

بیشک اس ملت کا مستقبل زوال انگیز ہے
اٹھ گیا جس قوم نا کارہ سے یکسر اتفاق

کر نہ دے اس کا نزاع باہمی اس کو تباہ
امت اسلام کو یارب پھر عطا کر اتفاق

قہر تو یہ ہے کہ قومی کام میں کرتے نہیں
مولوی سے مولوی لیڈر سے لیڈر اتفاق

ترک کر کے تجھ کو ہم رسوا ہوئے ہیں بیشمار
قدر تیری کوئی پوچھے ہم سے آکر اتفاق

جب یہ حالت ہے کہ مسلم کو ہو مسلم سے نفور
ہندو و مسلم میں ہو سکتا ہے کیونکر اتفاق

تجھ سے طالب ہے مدد کا مسلم گم کردہ راہ
رہروان منزل مقصد کے رہبر اتفاق

غیر کی شرکت کی کوشش کیجیے گا بعد ازیں
پہلے آپس ہی میں تو کر لیں آپ مل کر اتفاق

سن چکا نظم منیر اے سامع عالی دماغ
کر لے بس آپس میں بسم اللہ پڑھکر اتفاق

"بہار" سے خطاب

(از رشید صدیقی)

کس کو نہیں یہ آرزو گل میں ہزار بھی رہے
دورِ زماں ہے جب تلک اور بہار بھی رہے
موج ہو۔ جل ترنگ ہو۔ نغمۂ سازِ حسن میں
کھیل رہی ہوں شوخیاں۔ دامنِ نازِ حسن میں
محو ہو کائنات سب۔ کیف مئے شباب میں
غرق ہوں لاکھ سوزشیں جلوۂ آفتاب میں!
دور کہیں افق کے پاس کوند رہی ہوں بجلیاں
اڑتی پھریں روش روش رنگ برنگ تتلیاں
حسن فروشِ دہر کی ٹھنڈی فضا میں نور ہو
عشق نواز کائنات، بے خبر سرور ہو
ناچ رہی ہوں انگلیاں ساز کے تار تار پر!
رقص کناں ہوں اہل بزم۔ گردشِ چشم یار پر!

ارض و سما پہ چھا گیا جیسے خمار زیست ہے
چھیڑ دے کوئی راگنی! تو کہ بہار زیست ہے
نغمۂ درد زا سنا! تو ہے کمال زندگی
کھینچ دے لوحِ دہر پہ نقش مآل زندگی!

Adabistan.



The Spring.



Naghma

ikshmi Art, Bombay 8.

نغمہ

(از رشید صدیقی)

صحرا میں گلزار میں پنہاں
بلبل کی منقار میں پنہاں!
دریا کی رفتار میں پنہاں!
ہر غنچہ - ہر خار میں پنہاں نغمہ ہے ہر تار میں پنہاں

جھرنے کی آواز میں دیکھو
طائر کی پرواز میں دیکھو!
دنیا کے جس ساز میں دیکھو
ہستی کے اقرار میں پنہاں نغمہ ہے ہر تار میں پنہاں

منظر صبح و شام کے اندر
پیکر خوش اندام کے اندر!
ساغر مئے میں - جام کے اندر
نغمہ ہے اشعار میں پنہاں نغمہ ہے ہر تار میں پنہاں

آتش عشق افزا کی چمک میں
چشم حیا پرور کی جھلک میں
قلب کی سوزش۔ دل کی کسک میں
حُسن ستم افگار میں پنہاں۔ نغمہ ہے ہر تار میں پنہاں
سورج کی زرتار کرن میں ! !
تاروں کے پرتو رچمن میں ! !
رتیلے میدان میں۔ بن میں !
چڑیوں کی چہکار میں پنہاں۔ نغمہ ہے ہر تار میں پنہاں
فطرت کی تصویر میں کیا ہے ؟
ہوش ربا تحریر میں کیا ہے ؟
درد افزا تقریر میں کیا ہے ؟
راحت بر آزار میں پنہاں۔ نغمہ ہے ہر تار میں پنہاں

نوادر تاریخیہ

(از جناب ناظر امام صاحب گیاوی)

اہل بورنیو کے شکار کا طریقہ نہایت ہی تعجب انگیز ہے وہ شکار میں بندوق وغیرہ سے مطلقاً کام نہیں لیتے، ایک چھوٹے سے بانس سے جس کا طول تقریباً آٹھ ہاتھ ہوتا ہے بخوبی اپنے شکار کو مجروح کرسکتے ہیں، یہ بانس ہندوستان کے معمولی بانسوں کی طرح نہیں ہوتا، بلکہ بورنیو میں ایک خاص قسم کا درخت ہے جو یا جنج کہلاتا ہے اس کی شاخ ہوتی ہے جو نرکل سے قریب قریب بالکل مشابہ ہوتی ہے، اس کے اگلے سرے پر تیر کا پھل لگا رہتا ہے جب کوئی شکار کرنا چاہتا ہے تو اس بانس کا رخ شکار کی طرف کرکے اس کے نچلے سرے میں منہ لگا کر زور سے پھونکتا ہے ہوا کے زور سے تیر اڑ کر ٹھیک شکار پر جا بیٹھتا ہے اور چشم زدن میں شکار مع تیر کے زمین پر آرہتا ہے اہل بورنیو اس حربہ کو بڑی محنت و جانفشانی سے بناتے ہیں پہلے انہیں یا جنج کاٹنا پڑتا ہے پھر اس میں سے حسب ضرورت آٹھ آٹھ ہاتھ لمبی شاخیں کاٹتے ہیں اور چھیل چھال کر برابر کرنے کے بعد ایک شخص اس کو زمین پر سیدھا کھڑا کرکے پکڑے رہتا ہے، دوسرا سیخ سے اس کے اندر سوراخ کرتا جاتا ہے اور تیسرا ریشے صاف کرنے کی غرض سے اس پر پانی ڈالتا جاتا ہے اس طرح متواتر چھ گھنٹے میں جاکر یہ حربہ تیار ہوتا ہے، اور یہیں تک نہیں بلکہ اس کو کچھ دنوں تک گرمی پہونچائی جاتی ہے، تیر کے پھلوں کو زہر میں بجھایا جاتا ہے جو ایبوہ[1] کا دودھ ہوتا ہے، دودھ کو گرم کرکے پھل کے شگاف میں ڈالدیا جاتا ہے اور اس وقت یہ آلہ بالکل استعمال کے قابل ہو جاتا ہے۔

اس مرتبہ اس بات کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ علیحدہ علیحدہ ہر بڑی سلطنت میں باربرداری کی جتنی کشتیاں ہیں وہ مجموعی حیثیت سے کے ٹن بوجھ لادتی ہیں، ذیل کے نقشے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جائے گی۔

---

[1] ایبوہ بورنیو میں ایک زہریلا درخت ہے

برطانیہ اور آئرلینڈ	۔۔۔۴۰۰۰ ۱۹۲۷ ٹن	برٹش امپائر۔	۰۰۰ ۳۲۲ ٹن
ولایات متحدہ ۔۔	۲۰۵۰۰۰ ۱۱ ٹن	فرانس ۔	۰۰۰ ۶۲ ۳۲ ٹن
المانی ۔	۰۰۰ ۲۹۹۴ ٹن	اٹلی ۔	۰۰۰ ۲۸۹۴ ٹن
جاپان ۔	۰۰۰ ۴۱ ۳۷ ٹن		

وندل شمال یورپ میں ایک حبشی قوم تھی رفتہ رفتہ یہ قوم یورپ کے بالکل جنوب میں آکر آباد ہوگی، اور شمالی افریقہ کا بہت بڑا حصہ اپنے قبضہ میں کرلیا لیکن جب رومانیوں نے ان کو جلا وطن کر دیا تو جنوبی افریقہ کی طرف بھاگ گئے اور زنگیوں میں خلط ملط ہوگئے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ اس وقت بھی چند زنگی قبائل ایسے موجود ہیں جن کی وضع قطع، خو بو بالکل وندلیوں کی سی ہے۔ چنانچہ ہرترو اور مدآرہ ان دو قبیلوں کا طرز معاشرت اور بود و باش کا طریقہ ویسا ہی ہے جیسا وندلیوں کا تھا ان کا فیشن یہ ہے کہ تین شاخہ ٹوپی پہنتے ہیں جو وندلیوں کا خاص لباس رہا کیا ہے۔

نوائے خاموش

(از جناب خاموش)

حسن جب روئے گل و لالہ میں عریاں ہوگیا　　عشق کا ہر ذرہ نکہت میں پریشاں ہوگیا

المدد اے ناخدائے کشتی دل المدد　　کاروان عمر نذر جوشش طوفاں ہوگیا

اللہ اللہ میرے چشم دل کی پردہ داریاں　　دل سے گذرا تیر جو آنکھوں میں پنہاں ہوگیا

بس وہی ہے حاصل عمر و بہائے زندگی　　تم سے اس دنیا میں جو کار نمایاں ہوگیا

سیکڑوں غم کے ہیں مدفن مرقد خاموش میں
ابر بھی آیا گھڑی بھر کو تو گریاں ہوگیا

"فردا"

(از جناب مصطفےٰ کریم دستوری)

مجھے یہ معلوم ہے کہ جو کچھ میں نے کل سوچا تھا وہ اس وقت لکھ رہا ہوں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں اپنے قلم کو اپنی انگلیوں میں پکڑے ہوں اور سامنے سفید کاغذ ہے جو قلم کی رفتار کے ساتھ ساتھ تھوڑا تھوڑا سیاہ ہوتا جارہا ہے لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آیا قلم اپنے مقصد کو پہونچیگا یا اس سے پہلے سرنگوں ہو جائیگا اور مجھے اس کا علم نہیں کہ آیا میں اس مضمون کو پورا لکھکے چھوڑوں گا یا اس سے پہلے ہی، زمانہ کا کوئی حادثہ اسے روکدیگا اس لئے کہ میں زمانہ کے حالات سے کچھ بھی واقف نہیں اور اس لئے کہ فردا خدا کے اختیار میں ہے۔

مجھے یہ معلوم ہے کہ میں نے اپنے کپڑے صبح کو پہنے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت تک پہنے ہوئے ہوں لیکن اس کی خبر نہیں کہ کیا میں اسے اپنے ہاتھ سے اتاروں گا یا فرشتہ موت۔

فردا ایک صورت ہے جو دیکھنے والے کو دور سے دکھائی دیتی ہے فردا کبھی تو رحیم معلوم ہوتا ہے اور کبھی ملعون شیطان بلکہ بعض مرتبہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک کالی گھٹا ہے کہ اگر اس پر ٹھنڈی ہوا چلے تو اجزا منتشر ہو جائیں۔ گویا کہ اس کا وجود ہی نہ تھا۔

فردا ایک بحر زخار ہے جس کی موجیں لہرا رہی ہیں۔ اور ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں جس کے تھپیڑے شور پیدا کر رہے ہیں۔ اور تلاطم برپا کر رہے ہیں لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی تہ میں آبادی ہے یا موت۔

فردا کی حقیقت عقل سے باہر ہے۔ آنکھیں اس کے پہچاننے سے مجبور ہیں۔ یہاں تک کہ اگر انسان عمل سے باہر نکلنے کے لئے قدم اٹھاتا ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ اپنے محل کے آستانہ پر قدم رکھ رہا ہے یا تختۂ تابوت پر۔ فردا پر اسرار باتوں سے بھرا ہوا سینہ ہے جس کے گرد آنکھیں گھومتی ہیں عقل کچھ لینا چاہتی ہے آنکھیں کچھ دیکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن ایک راز بھی نہیں کھلتا ہاں! اگر تجھ سے پانی نکلنے لگے تو ممکن ہے کہ کوئی راز کھلجائے۔ ہماری آنکھیں فردا کی طرف لگی رہتی ہیں لیکن وہ ہم سے اوجھل ہے

وہ پردے سے ہماری اُمیدوں کو دیکھ رہا ہے۔ اور حقارت سے زیر لب تبسم ہے اور اپنے دل میں کہہ رہا ہے کہ اگر جمع کرنیوالا جانتا کہ یہ اندوختہ دوسروں کے لئے جمع کر رہا ہے اور یہ صانع خراب ہونے کے لئے بنا رہا ہے تو نہ جمع کرنیوالا جمع کرتا۔ اور نہ صانع بناتا۔

انسان نے دنیا کی ہر چیز کو اپنا تابع بنالیا ہے۔ زمین سے اپنی روزی پیدا کرلی ہے۔ آسمان پر سیڑھیوں سے چڑھ گیا ہے۔ تانبے اور لوہے سے مشرق و مغرب ایک کر دیا ہے۔ ستاروں کی دوری اور کرنوں کی مسافت معلوم کرنے کے لئے آلے ایجاد کئے ہیں۔ زمین کو اجمالاً و تفصیلاً ناپنے کے لئے وزن مقرر کیا ہے۔ دریا اور سمندر میں غوطہ لگایا ہے۔ اور اس کی گہرائی کو ناپ لیا ہے بحری جانوروں کو اپنا مطیع کر لیا ہے۔ دریا کے دفینے اور خزانے معلوم کرلئے ہیں۔ اس کے آبدار موتیوں کا مالک ہوا ہے۔ پتھروں اور کھوہوں سے نادر چیزیں نکالیں، اس کے رہنے والوں کو دیکھا اور جانا کہ وہ کیونکر زندگی بسر کرتے ہیں۔ کہاں رہتے ہیں کیا کھاتے ہیں، حواس ظاہرہ سے حواس باطنہ کا پتہ چلا لیا۔ غرض اپنی ذہانت سے تمام پردوں کو چاک کر دیا اور تمام دروازوں کو کھول دیا۔ لیکن فردا کے سامنے آکر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا کھولنا تو درکنار کھٹکھٹانے کی بھی جرأت نہ کر سکا کیونکہ وہ اللہ کا دروازہ ہے اور

"علم غیبی کس نمی داند بجز پروردگار"

اے نقاب پوش شیخ! کیا تو اپنے چہرے سے نقاب کو تھوڑا سا بھی اٹھا سکتا ہے؟ تاکہ ہم تجھ کو ایک نظر دیکھ لیں آ قریب آ ہم تیری صورت پردے کے اوپر ہی سے دیکھ لیں کیونکہ ہمارے قلب و جگر تجھے دیکھنے کے بہت مشتاق ہیں۔ اے فردا ہماری بڑی چہیتی، ابھی تیری بہت سی امیدیں ہیں تو ہمیں بتا دے کہ ہماری امیدوں کے ساتھ کیا کریگا اور ہماری آرزوئیں کب پوری ہونگی کیا تو انہیں پامال کر دیگا یا پورا کریگا نہیں انہیں تو اپنے راز کو طشت از بام نہ کر اپنے نقاب کو چہرے پر ڈالے رکھ ہماری آرزوؤں کے متعلق کچھ نہ بتلا ورنہ ہمیں تکلیف اور روح کو پریشانی ہوگی کیونکہ ہماری زندگی آرزوؤں اور تمناؤں ہی پر ہے اگرچہ غلط و بیکار ہیں ؎ دل میں کہتے تھے کہ یہ ہوگا وہ ہوگا لیکن ہائے گذری عمر امید دل ہی میں کچھ بھی نہ ہوا۔

انگلستان کے سیّاح

اور

اُن کے دلچسپ بیانات

(مولانا عبدالستار فاروقی)

انگلستان کے سیاحوں کے محفوظ تاریخی بیانات، یقین ہے کہ ناظرین کی انتہائی دلچسپی کے موجب ہوں گے بالخصوص اس لئے کہ یہ بیانات اس وقت کے ہیں جبکہ "جان بل" اور اس کا جزیرہ نفط جزیرہ کے صحیح معنی میں دنیا سے بے تعلق تھے۔ سولھویں سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں ایک کافی تعداد میں سیاح انگلستان آئے جن کی حیثیتیں مختلف اور اغراض جدا گانہ تھے۔ ان میں ایک خاصی تعداد سفراء حکومت کی ہے اور کچھ افاضل ہیں اور بعض وہ ہیں جن کو محض فرنگستان کا شوق سیاحت تھا جیسا کہ ہم تبلا چکے ہیں ان کے اغراض جدا گانہ تھے اس لئے لازمی طور پر ان کے بیانات بھی انگلستان کے طرح طرح کے حالات کے آئینہ دار ہیں سفراء کے سیاحت نامہ میں آپ کو حکومت اور امراء و دولت اور شاہی دربار کے حالات سے متعلق کافی مواد ملیگا۔ اہل علم و فضل کے بیانات سے تعلیم گاہوں کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ عام سیاحوں نے جو کچھ دیکھا وہ لکھا ہے۔ اس طرح انگلستان کی عام معاشرت اور روزمرہ کی زندگی کا نقشہ ہماری نظروں میں کھنچ جاتا ہے مگر ایک مشترک بیان جو ان تمام سیاحت ناموں کے بے شمار واقعات سے ماخوذ کیا جاسکتا ہے وہ یہاں کے عوام کی اخلاقی پستی ہے۔ ہر حیثیت کا سیّاح یہاں کے لوگوں کے گستاخانہ برتاؤ کا گلہ مند ہے انگلستان کے سب سے پہلے زائرین میں سفراء اور ایلچی ہیں جو امن و صلح اور عہد و پیمان کے پیامبر کی حیثیت سے وہاں داخل ہوئے تھے۔ ان کی رپورٹوں سے ضمناً انگلینڈ اور اس کے باشندوں کے عام حالات معلوم ہوتے ہیں اور خصوصاً ان میں (رپورٹوں میں) دربار حکومت۔ بادشاہ اور ملکہ کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان کے سیاحت ناموں سے نہیں یہ صرف معلوم ہوتا ہے کہ

کس طرح سفراء کا استقبال اور ان کی ضیافتیں کی جاتی تھیں۔ کتنی تعداد میں اور کس قسم کا ماحضر ان کے سامنے آتا تھا۔ امرائے دولت اور اہلِ دربار کا ان کے ساتھ کیا سلوک تھا۔ ڈیوک آف ورٹمبرگ کا سکریٹری ۱۵۹۲ء بیان کرتا ہے کہ کس طرح ملکہ نے اس کے آقا کا استقبال کیا۔ وہ حیرت سے نوجوان اور شاہی بیگمات کے رکھ رکھاؤ اور شانِ جمالی اور جلالی کا اظہار کرتا ہے۔ اس نے بھول سے بھی ایک لفظ عوام کی تعریف میں نہیں لکھا ہے۔ وہ لوگوں کو ہمیشہ شراب نوشی میں مشغول اور باغیچوں میں بیلوں کا پڑاؤ دیکھ کر سخت متنفر ہو گیا تھا اور ان فرنگیوں کو وحشی اور جنگلی خیال کرتا تھا۔ ایک موقع پر لکھتا ہے "پردیسیوں کی حیثیت کا خیال نہ کرتے ہوئے یہاں کے لوگ آوارہ گرد لڑکوں کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان سے کون کچھ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے"۔ اس کے بیان اور دوسرے بیانات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں انگلینڈ کی عورتیں بہت آزاد اور نڈر واقع ہوئی تھیں۔ ایک فرانسیسی مسٹر مسن نامی کا بیان ہے کہ "یہاں کی بیہودہ اور آزاد عورتوں کی گرمی کو فرو کرنے کا یہ دلچسپ طریقہ ہے کہ اس کو ایک کرسی سے باندھ کر ندی یا تالاب میں جرم کی نوعیت کے لحاظ سے غوطے کھلاتے ہیں اگر سخت جرم کی مرتکب ہو تو زیادہ اور چھوٹے جرم کی ہو تو کم۔

سیاحوں کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ انگلستان میں چارپائے بکثرت اور خوبصورت پائے جاتے تھے۔ گھوڑوں کی قدر قیمت بہت تھی ان کو بغیر لائسنس کے باہر بھیجنے کا حکم نہ تھا۔ بھیڑ کثیر تعداد میں چرتی رہتی تھیں اور گائیں چمکیلی اور موٹی ہوتی تھیں۔ ایک سیاح لکھتا ہے کہ چرواہے اپنی بھیڑوں کو سوائے شبنم کے اور دوسری چیز نہیں پلاتے تھے۔ سیاحوں نے دیہاتوں سے متعلق بہت کم معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کے جھونپڑے بہت چھوٹے اور ان خرمنوں کی آڑ میں پوشیدہ ہوتے تھے جن کو کسان اپنے کھیتوں کے کنارے جمع رکھتے ہیں۔ لوگ دریا اور ندی میں عام طور پر مچھلی کا شکار کھیلتے تھے دو سیاحوں نے مچھلی کے شکار کے اس طریقہ کی تشریح کی ہے جو سدھے ہوئے بگلوں سے کھیلا جاتا تھا۔ ہنس وار مسرولان ونیڈان کم ورٹمبرگ کے شہزادہ

ونس کے ساتھ سنہ ۱۷۱ء میں انگلستان آیا تھا وہ لکھتا ہے کہ "یہاں بگلوں سے مچھلی پکڑنے کا عجیب طریقہ ہے بگلہ پانی میں ڈوب کر بام اور دوسری مچھلیاں منہ میں لے آتے ہیں اور زندہ لا کر اپنے مالک کے سامنے اگل دیتے ہیں"۔ مسٹر رئی اپنی کتاب England as seen by Foreigner (۱۸۶۵ء) میں لکھتے ہیں "بگلہ کی گردن کے نیچے کے حصہ کو ایک پٹی باندھ دی جاتی ہے اور اس کو دریا میں چھوڑ دیا جاتا ہے جب کچھ مچھلیاں شکار کر لیتا ہے تو اس کو بلا کر مچھلیاں نکال لیتے ہیں اس شکار کا تھوڑا سا حصہ بگلہ کو بھی دیدیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آج بھی چین میں لوگ اسی قسم سے مچھلی کا شکار کرتے ہیں۔ مسٹر رئی ہی کا بیان ہے کہ سنہ ۱۶۱۸ء میں ویسٹ منسٹر کے قریب ان گارڈن میں خاص طور سے "مچھلی حوض" اور "بگلہ گھر" بنائے جاتے تھے۔

سفرا یا ان کے سکریٹریوں جن کے بیانات شہر اور دربار کے حالات تک محدود ہیں اور دیگر سیاحوں کو قدیم زمانہ میں بلکہ اٹھارویں صدی تک بھی عوام کے بے قاعدہ گروہوں کی وجہ کئی خطرات کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا خصوصاً سطحی فرانسیسی ان میں اکثر مبتلا ہوتے رہے۔ جولائی سنہ ۱۶۱۲ء کا واقعہ ہے کہ ڈان پڈرو ڈی زونیگا جو اسپین کے سفیر تھے جب اپنی چھ خچروں والی گاڑی پر بمقام ہلبرن برج چڑھنے لگے تو ایک اسپ سوار جوان نے ان کی ٹوپی جسمیں ایک قیمتی موتی ٹکا تھا جھپٹ کر لے بھاگا۔ جوان کی اس بیباکانہ حرکت پر لوگوں کو صدمہ ہونے کے بجائے دلی مسرت حاصل ہوئی۔ عوام کی اسی ذہنیت کی وجہ سے جوان کو یہ جرأت ہوئی اور وہ بچ نکلا اور اس کا پھر کچھ پتہ نہ چلا۔ سربازار دھینگا مشتی اور لڑائی جھگڑے کے بیشمار واقعات قلمبند کئے گئے ہیں لوگوں میں تضحیک پسندی اور چھچھوراپن بہت تھا اس قسم کے اکثر واقعات سپرد قلم ہوئے ہیں۔ مارشل ساکس سے جو بعض بلکہ سنہ ۱۷۲۴ء میں انگلستان کی پیدل سیاحت کر رہے تھے ایک جاروب کش کسی بحث کے دوران میں الجھ پڑا۔ اور آپ پر جھپٹ کر حملہ کرنا چاہتا مگر مارشل موصوف نے اس کو گردن پکڑ کر ہوا میں اوپر پھینکدیا جو اپنی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس گاڑی میں جا پڑا جو غلاظت سے لبریز تھی۔ تماشائیوں نے واہ واہ کے شور سے مارشل کی ایک گونہ تعریف کی

ٹہرو کھیل تماشہ جس میں لڑائی کا سامان ہو" ایک فرانسیسی مسن کہتا ہے "ایک انگریز کو بہت پسند آتا ہے" دو لڑکوں کو آپس میں الجھا دیکھ کر راہ گیر کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہاں تک شہ دیتے ہیں کہ باہم گھونسہ بازی ہونے لگے۔ ایسے واقعات تو روزانہ وقوع پذیر ہوتے رہتے تھے کہ دو لاٹھی کھیلنے والے یا مکہ باز بیانگ دہل اپنی لڑائی کا اعلان کرتے ہوئے ایک خالی میدان میں جمع ہو کر لڑنے لگتے تھے۔ اس قسم کے کھیل ولیم دوئم کے عہد میں ممنوع قرار دئے گئے۔

انگلستان کی سیاحت کا شوق آدم کے بیٹوں کو ہی نہ تھا بلکہ مائی حوا کی بیٹیاں بھی جان بل کو دیکھنے کی مشتاق رہی ہیں۔ ان سیاحوں میں جن کا تعلق جنس لطیف سے ہے شہزادی سیسلا گستوس وسا شاہ سوئڈن کی لڑکی، اور شہزادہ یرک کی بہن، قابل ذکر ہے جو ملکہ الزبتھ کی منظور نظر بھی تھی سیسلا بڑی خوبصورت اور حسین تھی۔ اس کے بال سنہرے اور آنکھیں چمکیلی تھیں۔ ۹ برس کی عمر میں کاؤنٹ آف فرشلینڈ سے محبت ہوگئی کاؤنٹ بھی اس وقت ۱۲ سالہ نوجوان تھا۔ خدا کی کرنی اور سیسلا کی بدقسمتی کہ اس کے خاندان کو یہ بر پسند نہ آیا اور وہ اس شادی کے سخت مخالف ہو گئے۔ کاؤنٹ اپنے بھائی کی شادی کے موقع پر سوئڈن آیا تھا۔ اس کے بھائی کا نکاح گستوس کی بڑی لڑکی کیتھرائن سے تھا۔ مراسم شادی کی حرکت سے کاؤنٹ اور سیسلا کو آنکھیں دو چار کرنے کا موقع ملتا رہا جب محبت کے بینگ بہت بڑھ گئے تو یہ دونوں عاشق و معشوق باوجود سخت احکام کے اطراف کے جنگل جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر ملاقات کرنے لگے۔ عاشق کاؤنٹ کالی کالی ڈراؤنی راتوں میں قلعہ واڈسٹینا کی سیڑھیاں لگا کر سیر کرنے لگا جو اس کے نظر بند معشوق سیسلا کی شاہی خوابگاہ تھا۔ ان خفیہ ملاقاتوں کا حال شہزادی کے بھائی یرک اور گگنوس کو معلوم ہو گیا اور آخرش ایک روز کاؤنٹ کو قید کر دیا گیا۔ ہمیں چونکہ اس موقع پر کاؤنٹ کا حال نہیں لکھنا ہے اس لئے اس کے متعلق ہم صرف یہ لکھ دینا مناسب سمجھتے ہیں وہ خدا خدا کر کے اپنے وطن جرمنی کو پہونچ گیا تھا۔ سیسلا جو ماشاءاللہ خوبصورت اور دولت مند بھی تھی اس کے

پھر کئی چلانے والے پیدا ہو گئے جنہیں قابل ذکر اور ممتاز روس کا بادشاہ "جان دی ٹربل" ہے مگر سیسلا نے برضا و رغبت مارگریو آف بیڈن سے نکاح کر لیا۔ خاندان کے ساتھ اور گھر کی زندگی شوخ اور آزاد طبع شہزادی کو حیات زندان سے زیادہ ناگوار تھی اس لئے اس نے سفر کا پختہ ارادہ کر لیا "جان" ہمیشہ انگلینڈ کی تعریف کیا کرتا تھا اس نے بھی "جان بل" کی زیارت کا عزم مصمم کر لیا اور چل کھڑی ہوئی۔ کامل دس ماہ ادھر اُدھر جکڑ کھانے کے بعد ستمبر ۱۵۶۵ء میں بندرگاہ ڈوور کو پہونچی۔ ملکہ الزبتھ کے ایما سے سرہنری کریس اور لارڈ کوبھم اور دیگر معززین نے یہاں آکر شہزادی کا پرجوش استقبال کیا۔ اور چند روز بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ لندن میں داخل ہوئی اور "بڈفورڈ ہوس" میں مقیم ہوئی۔ مارگریو اپنی عیاشی اور شوخ اہلیہ کی وجہ سے عیاشانہ زندگی گذارنے پر مجبور تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارگریو بہت جلد مقروض ہو گیا۔ جب قرض کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو اس نے چاہا کہ میں اپنی عزت بچا کر یہاں سے منہ کالا کروں۔ اس کا خیال تھا کہ میری عزت آبرو کا خیال کرتے ہوئے کوئی روک ٹوک نہ کریگا مگر اس کو بہت افسوس ہوا جب اس کو ڈوور کے راستہ میں اوچسٹر کے میئر کے حکم سے قید کر دیا گیا۔ تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مارگریو کب تک اپنی بے عنوانیوں کی سزا بھگتتا صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادی سیسلا کے لحاظ سے ملکہ الزبتھ نے بیچ بچاؤ کر کے اس کو رہا کر دیا تھا اور جو کسی مزید مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے ہوئے اپنے وطن کو پہنچ گیا تھا

انگلستان کے مصیبت زدہ سیاحوں میں اگر بعض وہ ہیں جو محض اپنی بے اعتدالیوں اور فضول خرچیوں کی وجہ سے نت نئی مصیبتوں میں گرفتار ہوتے رہے اور جن کی مثال اوپر گذر چکی ہے تو ان میں بعض وہ ہیں جو اپنی سیاسی حیثیت کا خیال نہ رکھتے ہوئے "دل پھینک" ہو گئے تھے اس لئے رسوائی اور بدنامی ان کے حصہ میں آئی اس قسم کے سیاحوں میں ڈیس رینی ڈی کردلی کا نام بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جو ایک موقع پر شاہ فرانس کا فرستادہ تھا۔ بالعموم انگلستان کی سیاحت کا ذریعہ اس زمانہ میں صرف گھوڑا تھا۔ کوچ کی سواری گراں تھی۔

ترجمان یا رہنما بہت تھے جن کا پیشہ صرف یہی تھا کہ سیاح کو ملک کے مختلف اضلاع اور ان کی تاریخی یادگاروں کی سیر کرا کے روزی کمائیں۔ مگر وہ تمام سیاح جنہوں نے ان کی رہنمائی میں سیاحت کی ہے ان کی بے ایمانی اور دغا بازی کی شکایت کرتے ہیں۔

سلطان صلاح الدین

(از مولانا مسعود الرحمن خاں ندوی)

دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو اپنے گذشتہ مشاہیر کے حالات و واقعات کو بطور یادگار مرتب نہ کر چکے ہوں۔ مگر ہندوستان اپنے اسلامی ہیروز سے بہت بڑی حد تک ناواقف ہے۔ تاریخ اسلام کی اگر آپ ورق گردانی فرمائیں گے تو آپ کو ملک الناصر صلاح الدین یوسف ابن ایوب ابن شاذی کا نام الوالعزم بادشاہوں کی فہرست میں ملیگا۔ صلاح الدین کی تیز تلوار اور بلند ہمت نے ایسے آڑے وقت رسول عربی (روحی فداہ) کے مذہب کی حمایت کی جب یورپ کا بچہ بچہ مسلمان کی جان کا خواہاں تھا۔ دجلہ کے اس کنارے پر جو ملک شام کے دوسری طرف واقع ہے ایک آزاد خانہ بدوش قوم "کرد" نامی آباد ہے۔ اور یہ خطہ اسی وجہ سے "کردستان" کہلاتا ہے یہ قوم انتہائی محنتی چست و چالاک لوٹ مار کے شائق اور اپنے قومی سرداروں کے بہت مطیع ہوتے ہیں یہ آج تک خاندان عثمانیہ کے مقابلہ میں اپنی قدیم آزادی کی اسی طور پر محافظت کر رہے ہیں کہ ان کے آبا و اجداد نے کیخسرو اور اس کے جانشینوں کے مقابلہ میں کی تھی سلسلہ قوت جسمانی اور افلاس نے ان میں پیشہ سپہ گری کے ساتھ خاص مناسبت پیدا کر دی ہے اور اب بھی ترکی فوج میں اس قوم کے نوجوان اپنی بہادری اور وجاہت ظاہری سے پہچانے جاتے ہیں اس قوم کے شریف ترین قبیلہ رواذیہ کی ایک شاخ قصبہ دوین میں جو آذربائیجان کی شمالی سرحد پر ملک گرجستان (جارجیا) کے نزدیک واقع ہے آباد تھی۔ اس قصبہ کے حصار کے دروازہ کے باہر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا

جو اجتنا گاؤں کے نام سے مشہور تھا۔

صلاح الدین کا مورث اعلےٰ شاذی اس گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اسی قوم اسی خاندان و مقام کا ساکن تھا۔ یہاں تک معلوم ہو سکا ہے شاذی وفاشعار احباب پرست یکرنگ آدمی تھا اس ایک شخص سے جس کا نام و لقب بعد میں مجاہد الدولہ بہروز ہوا اس قدر ربط و اتحاد تھا کہ دونوں کسی وقت جدا نہ ہوتے تھے اور آپس میں بھائی سے زیادہ محبت سے رہتے تھے۔ انقلابات زمانہ کہ بہروز کو ایک بدچلنی سے وطن سے بےوطن کیا اور عجیب بات ہے کہ اس سے اس کی اور اس کے دوست کے خاندان کی آئندہ عظمت کی بنیاد پڑی۔ بہروز کے حسن و شباب کی رعنائیوں نے وہیں کے ایک امیر کی بی بی سے ناجائز تعلقات پیدا کئے بہت عرصہ تک یہ راز پوشیدہ نہ رہ سکا امیر کو بھی بہروز کی اس حرکت کا علم ہوا بالآخر امیر نے بجائے قاضی کے یہاں فریاد لے جانے کے خود اس کو ایسی سزا دی کہ وہ تمام عمر کے لئے ایسی حرکات سے پشیمان ہو گیا۔ مگر قسمت کی یاوری بہروز کو غیاث الدین مسعود ابن محمد ابن ملک شاہ سلجوقی کے دربار تک لے گئی۔ اور وہاں پہونچکر شہزادوں کی اتالیقی کو اپنی آئندہ ترقیوں کے لئے ایک دروازہ سمجھا۔ تھوڑے عرصہ میں بہروز نے اپنی عقل و دانائی سے کام لیکر دربار سلطان میں کافی سے زیادہ رسوخ حاصل کر لیا۔ جب بہروز کو کامل طور پر سلطان پر بھروسہ و اعتماد ہو گیا تو اس نے شاذی کو ایک خط لکھا کہ خدا کی عنایت سے اب میں اعلےٰ ترین مناصب پر فائز ہوں اب آؤ اور اپنے دوست کا اعزاز آکر دیکھو۔ شاذی کے دل میں بہروز تک پہونچنے کا ولولہ موجزن ہوا کچھ تو پرانی رفاقت کے خیال سے اور کچھ ذاتی نفع کی امید موہوم پر مع اپنے ہر دو بیٹوں نجم الدین ایوب اور اسد الدین شیرکوہ کو ساتھ لے کر بہروز کے پاس آیا۔ بہروز نے انتہائی محبت و شوق سے شاذی کا استقبال کیا اور جب سلطان نے اس کو بغداد میں شحنہ مقرر کیا تو شاذی اور اس کے دونوں بیٹے بھی اس کے ہمراہ ہوئے۔ سلطان کی قدردانی نے بہروز کو قلعہ تکریت جاگیر میں مرحمت فرمائی

شاذلی وہاں کا وزدار مقرر کیا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں شاذلی نے انتقال کیا اور بہروز کی شکر گذاری نے اس کے بڑے بیٹے نجم الدین ایوب کو اس کی جگہ مقرر کیا۔ ایوب باوجود نوجوان ہونے کے ایک زبردست ماہر سیاسیات و مدبر تھا۔ چند روز میں تکریت کے قرب و جوار رہزنوں اور ڈاکوؤں سے اس نے محفوظ کر دئے اس کی لیاقت اور عملی کارکردگی نے بہروز کے دل پر اثر ڈالا تھوڑے ہی عرصہ میں گراں بہا خلعتوں اور انعاموں سے سرفراز فرمایا۔ ایوب کی قلعہ داری کے زمانہ میں قرب و جوار کی سلطنتوں میں بڑے بڑے انقلاب ہو رہے تھے، مسعود ابن محمد ابن ملک شاہ سلجوقی کی بیقرار پر حوصلگی نے ۵۲۶ھ بمطابق ۱۱۳۲ء میں اتابک عماد الدین زنگی صاحب موصل (وہی موصل جس پر بہت دشواریوں کے بعد غیور ترکوں کو فی الحال قبضہ حاصل ہوا ہے) کی مدد سے بغداد حملہ آور ہونے کا قصد کیا۔ خلیفہ مسترشد بھی غافل نہ تھا۔ گو اب خلافت برائے نام باقی رہی تھی مگر بنو عباسیہ کے نام میں وہ جادو بھرا ہوا تھا کہ زبردست و باجبروت بادشاہ بھی اپنے امام کی خدمت اپنا فخر و سرمایہ سمجھتا تھا۔ مسترشد کی پُراثر درخواست نے قراجہ اشاقی حاکم فارس و خجستان کی قوی مدد حاصل کی مسعود و زنگی تکریت کے قریب خیمہ زن تھے اور مسترشد کی کمزوریاں ان کا شکار تھیں بالآخر پنجشنبہ کے روز ۱۲ جمادی الثانی ۵۲۶ھ کو قراجہ نے ان کو دفعتاً آدبایا اور ایسی شکست فاش دی کہ وہ فرار ہو گئے۔ زنگی کی بے سروسامانی اور سخت ترین پریشانی اس کو تکریت لائی اور نجم الدین ایوب کی رحم دلی نے اس کو مدد پہونچائی اخلاق و تواضع کے ہر پہلو کو اس شکست خوردہ بادشاہ پر نجم الدین ایوب نے عیاں کیا۔ بہروز نے اس فیاضی کو اپنے حق میں خضر سمجھتے ہوئے ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا "ہمارا سخت ترین دشمن تمہارے ہاتھ آیا اور تم نے اس کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرنے کے علاوہ اپنے چنگل سے نکل جانے دیا"۔ اس عرصہ میں اسد الدین شیر کوہ ایوب کے چھوٹے بھائی نے ایک عیسائی کو جو قلعہ تکریت کا

سپہ سالار اور بہروز کا بہت منہ چڑھا تھا یا تو کسی عورت کی بیکسی پر رحم کھا کر یا اپنی ذاتی دشمنی سے قتل کیا۔ ایوب نے کمال ہوشمندی سے اپنے بھائی کو پابہ زنجیر کیا اور بہروز کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ بہروز تو عماد الدین زنگی کے معاملہ کی وجہ سے پہلے ہی سے دل برداشتہ تھا اس واقعہ سے سخت دل برگشتہ ہوگیا۔ اور یہ مختصر تحریر نجم الدین ایوب کو لکھا "تمہارا باپ میرا سچا دوست تھا اس کے احسانات جس وقت میرے پیش نظر آجاتے ہیں تو میرا دل نہیں چاہتا کہ میں تم پر کسی قسم کی سختی کروں لہذا میری زبردست خواہش ہے کہ تم جلد سے جلد اپنے بھائی کو لے کر تکریت سے نکل جاؤ۔ نجم الدین ایوب نے باحسرت و یاس تکریت سے موصل کی راہ لی۔ عماد الدین زنگی کی قدر شناسی نے اس کو ایک بڑی جاگیر عطا کی اور اس کو مع اس کے بھائی کے فوج میں اعلے مناصب عطا کئے۔ اور وہ مع اپنے اہل و عیال کے بہ عیش و آرام وہاں رہنے لگا۔

---

۱ تاریخ زوال سلطنت روما۔ ۲ ابن اثیر۔ ابن خلکان۔ ابن شام۔

۳ خلافت کی تو اس زمانہ میں بالکل ایسی حالت ہوگئی تھی جیسے آجکل ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی ہے جو کچھ ظاہر میں ہوتا وہ دیوان العزیزی کے نام سے ہوتا تھا لیکن حکومت دراصل ملوک سلجوقیہ کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنی طرف سے ایک نائب بغداد میں رکھا کرتے تھے جس کا لقب "شحنہ" ہوتا تھا۔ اس کے فرائض و پوزیشن بالکل دیسی ریاستوں کے رزیڈنٹ جیسی ہوتی تھی۔

۴ اس معاملہ میں میں ابن خلکان کی اس روایت کو تسلیم کرتا ہوں جو اس نے نجم الدین ایوب کے ترجمہ میں بیان کی ہے۔ ان حالات کی نسبت بہت کچھ اختلاف ہے۔ ابن خلکان ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ جمال الدولہ مجاہد بہروز ایک سپید رنگ یونانی غلام تھا اور ابن اثیر اور ابن ابی الحمی الطلبی بیان کرتے ہیں کہ ابتدا میں نجم الدین ایوب دوین سے آکر سلطان غیاث الدین مسعود کا ملازم ہوا قیصر بہروز اس کی کارروائی سے خوش ہوا تو اس نے اس کو قلعۂ تکریت کا دزدار مقرر کیا جو اس کی

ایک مسلسل ناول

نازنین جاسوس

(از مولانا عبد الواحد انصاری فطرت ندوی)

باب (۱)

نو وارد

"رات نصف سے زیادہ گذر چکی ہے۔ آج احباب کی سوسائٹیوں میں مجھے معمول سے زیادہ دیر ہو گئی ہے۔ ایک جگہ سے رخصت ہوا تو دوسری ٹوٹی آن گئی۔ اس سے خدا خدا کر کے پیچھا چھڑایا تو تیسری جگہ ٹھیرنا پڑا۔۔۔۔۔ نیند بھی اب اچاٹ ہو چکی ہے۔ کمرہ میں جاؤں بھی تو اور وحشت ہوگی۔۔۔۔۔ گھر کیا جاؤں۔ گھر کے بجائے چلو تھوڑی دیر کے لئے دریا (ٹیمز۔ لندن) کے کنارے پر جا کر طبیعت بہلاؤں چاند کی خاموش روشنی اور ہوا کے ہلکے پھلکے پرسکون جھونکے، ممکن ہے میری نیند کو واپس لاسکیں!۔۔۔۔۔ ہاں یہی مناسب ہے۔۔۔۔۔ جب نیند کا غلبہ ہوگا تو کمرہ میں جا کر لیٹ جاؤں گا۔۔۔۔۔

ستمبر کا آخری ہفتہ تھا۔ مسٹر چارلس نے لندن کی نیم شبانہ مصروفیتوں سے فرصت پا کر مذکورہ بالا الفاظ کہے اور دریائے ٹیمز کے کنارے ہو لیا۔

تنہائی کا عالم تھا۔ موجوں کی آواز اور ہوا کی "سائیں سائیں" کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی جو اس وقت کی خاموشی کو توڑتی۔ چارلس بھی تنہا تھا اور مذکورہ بالا دو چیزوں کے سوا اور کوئی چیز اس کی ہم سیاحت نہیں تھی۔ جاتے جاتے جب ایسکس روڈ کے سامنے پہونچا تو اسے معلوم ہوا کہ ایک اور آدمی بھی دریا کی طرف آرہا ہے۔

آنیوالا شخص چونکہ دور تھا، اور رات کا وقت، چارلس باوجود کوشش کے اس کے پہچاننے میں ناکام رہا۔ اکیلا تو تھا ہی محض اس خیال سے کہ چلو اس سے بات چیت ہوگی اور وقت آسانی سے

کٹ جائیگا۔" چارلس کی نظریں اس عکس سے مانوس ہونے لگیں۔ اور وہ خوش ہوا کہ تنہائی کی مصیبت سے نجات ملی۔

مگر رات زیادہ آگئی تھی، اس وقت کسی آدمی کا دریا کی طرف آنا خلاف عقل نہ سہی لیکن خلاف عادت ضرور تھا۔ لہذا چارلس اسے دیکھ کر قدرتاً اس ادھیڑ بن میں لگ گیا کہ

"یہ ہوگا کون؟"

"اس وقت کیوں آرہا ہوگا؟"

"کیا وہ کسی کو قتل کرنے کی غرض سے آرہا ہے؟"

"کیا وہ کوئی فرقت زدہ عاشق ہے اور اپنے محبوب کی تلاش میں نکلا ہے؟"

"کیا اس پر کوئی غیر معمولی مصیبت آپڑی ہے؟"

"کیا اس کو بھی میری طرح نیند نہیں آتی —— اور دریا کے کنارے سیر کو نکلا ہے؟"

الغرض ان خیالات میں چارلس گھر گیا۔ اور اس عکس کو نہایت غور سے دیکھنے لگا۔ جوں جوں وہ قریب آتا جاتا تھا۔ چارلس کے تعجب اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ آخر وہ بالکل قریب آگیا اور چارلس نے غلط یا صحیح یہ اندازہ لگایا کہ وہ ضرور کسی اہم کام کے لئے آیا ہے۔ وہ کسی بہت بڑے مقصد کا متلاشی اور کسی نازک معاملہ کا رازدار ہے!

چارلس اب دریا کے کنارے پڑی ہوئی بنچوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور بحر ظلمات کے مسافر کی طرح —— جو کسی آنیوالے جہاز کی روشنی کی طرف مضطربانہ انداز سے دیکھتا ہے —— اس عکس کو دیکھنے لگا۔ یہ عکس بھی اب ایک واقعی انسان کی شکل میں تبدیل ہوگیا اور اس بنچ کے پاس آگیا۔

چارلس بالکل بے حس و حرکت اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ نو وارد کو اس کا گمان بھی نہ ہوا کہ وہاں اس کے علاوہ کوئی اور آدمی بھی موجود ہے۔

نو وارد نے بنچ کے پاس پہونچکر چاروں طرف متجسسانہ نظر دوڑائی اور اسی بنچ پر بیٹھ گیا۔

جس پر چارلس بیٹھا ہوا تھا۔
چارلس نے اس کی وضع قطع سے معلوم کیا کہ وہ کوئی فوجی آدمی ہے۔ وہ نہایت چوکنا اور کسی کا منتظر معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ سوجوں کی آواز سنتا رہا اور آخر اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ اسی بنچ پر دراز ہو گیا اور خراٹے لینے لگا۔
چارلس کو رہ رہ کر یہی خیال متعجب بناتا تھا کہ "آخر یہ ہے کون؟" اور کس غرض سے آیا ہے"؟۔
چارلس کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ نووارد یہاں پہونچتے ہی بالکل بے فکر ہو کر سو بھی گیا ہے!
نووارد کے بشرے سے غریبی اور فقیری کی بھی کوئی علامت نہ معلوم ہوتی تھی ورنہ چارلس یہی گمان کر لیتا کہ اس کو کہیں اور لیٹنے کی جگہ نہیں ملی —— اور یہیں آکر لیٹ گیا ہے۔ پھر اس کا آتے ہی مست خواب ہو جانا اس خیال کو بے بنیاد ثابت کرتا تھا کہ وہ کوئی وعدہ وفا کرنے یا کسی کا انتظار کرنے کے لئے یہاں آیا ہے۔

کوئی جاسوس ہے!

نووارد صاحب تو بنچ پر پڑے عالم بالا کی سیر کر رہے تھے اور مسٹر چارلس اسی فکر میں تارے گن رہے تھے کہ "یہ کون ہے؟" کہ اتنے میں مسٹر چارلس نے دوسرے ایک اور آدمی کو اسی طرف آتے دیکھا۔ یہ دوسرا نووارد ہے (جو ابھی کافی دور ہے) بھی اسی سمت سے آ رہا ہے جدھر سے پہلے نووارد صاحب تشریف لائے تھے۔ دوسرے نووارد کا تن و توش پہلے کی نسبت ذرا زیادہ لمبا چوڑا تھا۔
چارلس نے دل میں کہا کہ آج کی رات شاید عجیب و غریب واقعات ظہور پذیر ہونے والے ہیں۔ دیکھنا چاہئے کہ ہوتا کیا ہے؟ اور یہ معمہ کس طرح حل ہوتا ہے؟
اپنے پیشرو کی طرح اس دوسرے نووارد نے بھی ان بنچوں کے پاس پہونچکر ادھر اُدھر غور سے دیکھنا شروع کیا۔
چارلس اب بالکل سمٹ سمٹا کر، چپ چاپ، لیٹ گیا اور نئے نووارد کو وہاں کسی اور بیدار

متنفس کی موجودگی کا گمان تک بھی نہ ہوا

دوسرے نووارد نے جب اطمینان کر لیا کہ۔ اوّل تو یہاں کوئی اور شخص ہے ہی نہیں، اگر ہے بھی تو اس وقت سب سو رہے ہیں۔۔۔ تو وہ پہلے نووارد کے پاس آیا اور اس کو اس طرح غور سے دیکھا کہ گویا وہ اسی کی تلاش میں تھا۔

بہرحال، وہ اسے دیکھ کر اس بینچ سے ہٹا اور چار قدم پر پڑی ہوئی ایک اور بینچ پر جا بیٹھا۔

چارلس نے اس کے حلیہ سے اندازہ لگایا وہ بھی پہلے نووارد کی طرح کسی خاص کام کے لئے آیا ہے اور غالباً اسی بنا پر چارلس اس کی نقل و حرکت کو بغور دیکھنے لگا۔ نیا نووارد پہلے تو اسی بینچ پر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہاں سے اٹھا اور پہلے نووارد کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا جو ہمارے دوست مسٹر چارلس کے پاس ہی، بینچ پر سو رہا تھا۔

بینچ کے پاس پہونچکر چارلس نے ادھر اُدھر غور سے دیکھا اور سب کو سوتا پا کر پہلے نووارد پر جھکا اور ہاتھ بڑھا کر کسی چیز کو ٹٹولنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنا متلاشی ہاتھ ذرا پھرتی سے کھینچ لیا اور اس مست خواب کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال کر جلدی جلدی کسی چیز کو تلاش کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ کی حرکت غیر معمولی خوف اور اضطراب کا پتہ دیتی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔آخر تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنا ہاتھ جیب سے باہر نکالا۔

چارلس اس نقل و حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ چونکہ اندھیرا تھا اور تمام چیزیں صاف معلوم نہیں ہو سکتی تھیں اس لئے چارلس اس کا اندازہ نہ لگا سکا کہ جیب میں سے کیا چیز نکالی ہے؟ پھر بھی چارلس کو اس کا تو یقین ہو گیا کہ جیب سے باہر نکالتے وقت دوسرے نووارد کے ہاتھ میں سفید سفید بنڈل ضرور تھا جو کاغذ سے نہایت احتیاط کے ساتھ لپٹا اور بندھا ہوا تھا۔

دوسرے نووارد کا غذوں کے اس بلندے کو مست خواب کی جیب سے نکالا اور نہایت پھرتی سے اپنی جیب میں رکھ کھسک جھٹ اسی بینچ پر بیٹھ گیا جس پر وہ پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ وہ اسی بینچ پر بیٹھا رہا اور اٹھ کر چلدیا۔

یہ تمام قصہ ہو ہو اچکا لیکن مسٹر چارلس نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ بلکہ وہ بدستور اپنی جگہ پر پڑا رہا۔

جب چور ذرا دور نکل گیا تو چارلس کو فوراً خیال آیا کہ —— نہیں! —— یہ تو ضرور کوئی اہم واقعہ ہے! —— یہ شخص اس سونے والے کی کوئی چیز چرائے لئے جا رہا ہے —— رات کا وقت ضرور ہے، لیکن میں بالکل اس کے قریب اس کی تمام نقل و حرکت دیکھ رہا تھا! —— چند ہی قدموں کا تو فاصلہ تھا! —— ہو نہو، یہ چور ہے! —— اور کوئی اہم چیز چرائے جا رہا ہے!"

تم کون ہو؟

مذکورہ بالا خیال کا آنا تھا کہ چارلس فوراً اٹھ بیٹھا اور اپنے پاس کے سونے والے پہلے نووارد کو جگانے لگا۔

چارلس نے اپنی زندگی میں چوری کے ہزاروں واقعات دیکھے اور سنے تھے، مگر یہ چوری اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس کے لئے ایک نئی بات تھی۔ چارلس کو اب اس مست خواب کے اٹھانے کی بھی ضرورت تھی اور ادھر بھاگتے ہوئے چور پر بھی نظر رکھنی تھی کہ وہ کہیں غائب نہ ہو جائے کیونکہ اب وہ بھی رفتہ رفتہ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا ——،

"اٹھو اٹھو، تمہاری چوری ہو گئی! جلدی اٹھو!!"

یہ الفاظ کہہ کر چارلس نے پہلے نووارد کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ پہلا نووارد بیدار ہو گیا —— اس کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ ہمارا دوست چارلس اپنے تعجب کو بھی بھول گیا —— اور اب اس کا تعجب ایک خوف اور اندیشہ میں تبدیل ہو گیا ——!

چارلس نے جب اس مست خواب نووارد کو نیند سے جگایا تو اس نے اٹھتے ہی بجائے اس کے کہ اس چور کا تعاقب کرتا ——، چارلس کے بازو تھام لئے۔ وہ اپنی آنکھیں بھی نیند سے کھولتا جا رہا تھا۔ اور چارلس کے بازو بھی مضبوطی سے پکڑتا جا رہا تھا یہاں تک کہ جب اچھی

طرح بیدار ہو گیا تو چارلس کے بازوؤں کو جھٹکا دیکر زبردستی سے اسے بینچ پر بٹھالیا۔
چارلس نے پھر یہی الفاظ دہرائے ——،
"اٹھو، اٹھو، تمہاری چوری ہو گئی!"

بیدار: — چپ رہو!

چارلس: — ارے بھئی، تمہاری چوری ہو گئی ہے!
("بیدار" جس کی چوری ہو گئی ہے، ایک ذمہ دار افسر ہے، اب ہم اسے "افسر" کہیں گے)

ایک لمحے تک تو اس افسر نے چارلس کو نہایت مضبوطی سے تھامے رکھا۔ افسر اس چور کو بھی دیکھتا جاتا تھا جو ابھی ابھی چند کاغذات اس کی جیب سے نکال لے گیا ہے۔ اور چارلس کو بھی دباتا جاتا تھا۔ چور اگرچہ کافی دور نکل گیا تھا تاہم اس کا عکس ابھی تک دکھائی دے رہا تھا۔ افسر نے چارلس سے سوال کیا۔

افسر: — اچھا! تو —— تم کو اس چوری کا علم کیونکر ہوا؟

چارلس: — میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ چور نے جو جو حرکات کیں میں ان سب کو بغور دیکھتا رہا۔ اور ابھی —— وہ دیکھو، تمہارے سامنے جا رہا ہے۔

افسر: — (چلا کر اور چارلس کے ہاتھ کو جھٹکا دیکر) اس شخص کو دیکھتے رہو، لیکن خدا را —— بولو نہیں! —— اور نہ کوئی حرکت کرو!

چارلس: — میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس سے تمہاری کیا غرض ہے —— تم دیکھتے ہو کہ چور تمہارے سامنے جا رہا ہے اور پھر اس کو جانے دے رہے ہو۔
چارلس کے اس جملہ پر افسر نے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اس سے سوال کیا۔

افسر: — تم کون ہو؟

چارلس: — کیا تم میرا نام دریافت کرنا چاہتے ہو —— ؟ شوق سے —— مگر یہ موقعہ اس کا نہیں تھا —— بہرحال، اگر تمہیں ابھی بے موقعہ سوال پر اصرار ہے تو سنو —— مجھے چارلس کیلفرڈ

کہتے ہیں۔

افسر :۔ نہیں، نہیں، مجھے تمہارے نام سے کوئی سروکار نہیں ہے ــــــ مجھے تم یہ بتاؤ کہ کہاں رہتے ہو اور کیا کام کرتے ہو ؟

چارلس :۔ میں کوئی دس بارہ سوسائیٹوں کا ممبر ہوں۔ مارکٹ روڈ پر رہتا ہوں۔ میں نہ تو سویرے سونے کا عادی ہوں اور نہ بہت سونے کا۔

افسر نے چارلس کے اس جواب کو نہایت غور سے سنا۔ افسر ابھی چور کے عکس کو بھی دیکھ رہا تھا جو رفتہ رفتہ دور سے دور تر ہوتا جا رہا تھا۔

چور کی طرف سے نظر ہٹا کر افسر نے چارلس کی طرف دیکھا اور اس سے کہنے لگا۔

افسر :۔ (اعتماد کے لہجہ میں) چارلس ! آپ کی بڑی عنایت ہوگی۔ ــ ــ ــ ــ آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں ــــــ،

آپ ایک شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ میری مدد کریں آپ میری مدد کیجئے

چارلس :۔ (بات کاٹ کر) تم کون ہو ؟

افسر :۔ میں دراصل ایک ملازم ہوں۔ میرے لئے ضروری ہے کہ یہ چور گرفتار ہو جائے۔ ورنہ میری زندگی خطرہ میں پڑ جائیگی ــــ اور میری موت وحیات کا فیصلہ مجلس جنگ کے رحم پر ہوگا اس شخص کو پکڑنا ضروری ہے۔ ورنہ میرے لئے بجز افسوس کے کچھ باقی نہ رہے گا ــ

چارلس نے چور کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ جاتے جاتے دور کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا ہے اور بیٹھنے کے بعد اپنی جیب سے گھڑی نکالی ہے۔ ٹائم دیکھکر، گھڑی کو پھر جیب میں رکھا ہے اور ابھی بیٹھا ہے ۔

چارلس :۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ کس قسم کا کھیل ہے ؟

افسر :۔ کھیل ویل نہیں ہے ! یہ ایک اہم ترین واقعہ ہے ! ! اور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ اور خطرناک صورت اختیار کریگا ۔

(باقی باقی)

تنظیم کے چار پہلو

(از ض ۔ ا ۔ ب)

افسوس ہے کہ مسلمانون نے اپنی تنظیم کا کام بے انتہا دیر سے شروع کیا ہے ۔ سچ پوچھیے تو یہ کام برسون پہلے شروع ہونا چاہیے تھا ۔ اگر مثلاً دس سال قبل بھی اُس کی داغ بیل ڈالدی جاتی تو آج ہم کہین سے کہین جا پہنچتے ۔ بہر حال اتنا بھی غنیمت ہے کہ خواہ دیر سے ہی تنظیم کی جدو جہد شروع ہو گئی ہے ۔ اگر مسلمانون نے صدق دلی، خاموشی اور جوش کے ساتھ کام کو جاری رکھا اور اپنی بڑھتی ہوئی قوتون کو دوسری ہمسایہ اقوام کے ساتھ لڑنے مین صرف کرنے کی بجائے تعمیری کام مین لگایا تو یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ابتری جو ہماری قومی زندگی کے ہر شعبہ مین اسوقت پائی جاتی ہے دس بیس سال کی مدت مین اچھی خاصی شیرازہ بندی سے بدل جائیگی ۔ ہم مسلمانون کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا مستقبل اگرچہ تمام وکمال ہندوستان سے وابستہ ہے تاہم ساتھ ہی ہمین دنیا کی شایستہ اقوام کی نظرون مین بھی اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو از سر نو حاصل کرنا ہے ۔ اور یہ مطمح نظر ایسا ہے جسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے ۔

ہماری سب سے فوری ضرورت مذہبی تنظیم ہے ۔ انگریزی تعلیم کے تھوڑے بہت رواج نے اس کام کو ایک گونہ آسان کر دیا ہے ۔ اس لئے کہ اس نے ہماری آنکھین کھولدی ہین اور ہم سمجھنے لگ گئے ہین کہ جو بہت سی باتین مذہب کے نام سے کیجارہی ہین وہ حقیقتاً جز و مذہب نہین ہین ۔ اسلام کا مقصد یہ تھا اور ہے کہ بندون کو اپنے مولا سے ملا دے ، انھین غلط خداؤن کی پرستش سے ہٹا کر اُس معبود حقیقی کی طرف لیجائے جس سے تعلق پیدا کرنا انسان کی روحانی ترقی کے لئے از بس ضروری ہے ۔ مگر اسلام کے بعض نام نہاد ہادیون نے مسلمانون

کو صحیح راہ سے ہٹاکر پھر بنی نوع انسان کی پوجا کی طرف لگا دیا ہے۔ قبر پرستی و پیر نوازی کے سلسلہ مین جو جو خرافات عمل مین آرہی ہین اور جو جو نظارے اجمیر اور دوسرے مقامات مقدسہ مین دیکھے جارہے ہین، ان سے کم سے کم اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ جس توحید پر اسلام کو ناز تھا وہ اب اپنے اصلی رنگ مین جلوہ گر نہین ہے۔ ابتدائی دور کے مسلمانون کی تمامتر ترقیان مذہب کی سچی پیروی کا نتیجہ تھین۔ اسی مذہب پروری کا ظہور تھا کہ مسلمانون نے خدائی پیغام پہنچانے کے لئے دنیا کا کوئی کونہ نہین چھوڑا۔ اسلام ہی ابتدائی مسلمانون کو آگے بڑھنے اور ترقی کی جانب قدم رکھنے کے لئے ابھارتا تھا۔ اور یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ جہان جہان اسلام گیا وہان سے جہالت کی ظلمت دُور ہوئی اور علم کی روشنی جلوہ گر ہوئی۔ اسلام نے مذہبی احکام کی بنا پر دوسرون سے اکتساب علم کیا اور پھر اُس علم مین چار چاند لگا کر اُسے تمام دنیائے معلومہ مین پھیلا دیا۔ آج جو ہماری علمی و ذہنی ترقی رُکی ہوئی ہے اسکا واحد سبب مذہبی جمود ہے جو ہمین ایک طرف تو جدید خیالات قبول کرنے سے روکتا ہے اور دوسری طرف ہمین ایسی ایسی تباہ کن رسمون مین مقید کردیتا ہے کہ ہم پہلے کی طرح اپنے آپ کو آزاد نہین پاتے۔ لہذا مذہبی تنظیم کا مقصد نہ صرف یہ ہونا چاہئے کہ مذہب کو بیرونی آلائشون سے پاک کرکے مسلمانون کو راہِ مستقیم پر ڈالدیا جائے بلکہ یہ بھی کہ ایسے علماء پیدا کئے جائین جو بیسوین صدی کی ضروریات کو مدنظر رکھکر اسلام کا وعظ کہین اور مسلمانون مین پھر پہلا سا مذہبی شغف پیدا کردین تاکہ ہماری زندگیان نام کی مذہبی نہ بنی رہین بلکہ درحقیقت ایسی زندگیان بن جائین جو تمام افعال و اقوال مین خدائی احکام کی پابند رہین۔ اس کے علاوہ ایک اور کام بھی کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے مختلف فرقون کی باہمی لڑائیون اور تعصبات کو کم کرکے ہر عقیدے کے مسلمانون کو ایک مرکز پر جمع کردیا جائے۔ مین ذاتی طور پر مختلف فرقون کے معبود کو توڑ کر یا ربنے سے زیادہ وقعت نہین دیتا۔ یہ فرقے دیر یا سویر ایک مرکز پر آکر رہینگے۔ اس لئے کہ یہ بات سراسر غیر فطرتی ہے

کہ بیسویں صدی میں پرانے فرقے سابقہ شان پر قائم رہیں۔اب قدیم اختلافات کو باقی رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معدوم ہو جانا ہی تقاضائے فطرت ہے۔

دوسرا پہلو جس میں مسلمانانِ ہند کو تنظیم کی اشد ضرورت ہے، معاشرتی ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ زندگی میں اصلاح کیجائے جس میں فی الحال کوئی نظام نہیں پایا جاتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں جدید بننے کے لئے ترکی کی طرح یورپین وضع اختیار کر لینی چاہیئے۔ ہمیں محض ظاہری حالات کو درست کر لینے سے اندرونی مرض کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ معاشرتی اصلاح سے میری مراد وہ خراب اور تباہ کن رسمیں ہیں جو نہ صرف ہماری جہالت کی بین دلیل ہیں بلکہ ہمارے افلاس کو زیادہ کرنے والی ہیں اور اغیار کی نظروں میں ہماری سبکی کا باعث بن رہی ہیں۔ مزید برآں ہمیں اپنی عورتوں کی حالت کو اُس سے بلند سطح پر لانا ہے جہاں وہ اب ہیں۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن میں انکی بیچارگی اور بیماری قوم کے لئے وبال جان ہو رہی ہے۔ اگر ہم انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھادیں، اگر ہم انھیں جاہل رکھنے کی بجائے تعلیم یافتہ بنادیں، اگر بیماری میں دن کاٹنے کی بجائے ہم انھیں تندرست زندگی بسر کرنے کے قابل کر دیں، اگر ہم انھیں صحیح معنوں میں شریک زندگی بنا کر جہادِ حیات میں حصہ لینے کے لئے تیار کر دیں تو یقیناً ہماری آدھی قوت جو اب تک بن جُتی زمین کی طرح بالکل بیکار پڑی ہوئی ہے، ہمارے لئے بیحد مفید ثابت ہو جائے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم نے جان بوجھکر اپنی عورتوں کو بیکار، بیمار، اپاہج اور جاہل بنا رکھا ہے۔ اُن پر ایسے سخت پردہ کی بندشیں عائد کر رکھی ہیں جس پر کسی نوع اسلامی پردہ کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کے حقوق ہم نے زبردستی چھین لئے ہیں، اُن کو ان کے جائز احترام سے گرا رکھا ہے اور اسپر اگر وہ ذرا سا بھی اُبھرنے کی کوشش کرتی ہیں تو ہم انھیں آگے بڑھنے سے ایکدم روک دیتے ہیں۔ آج مسلمانوں میں جو قحط الرجال ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ جاہل مائیں بچوں کی مناسب تعلیم و تربیت نہیں کر سکتیں۔ ہمارے بچوں کے

ابتدائی سال جس افسوسناک حالت اور تباہ کن ماحول مین گذرتے ہین وہ انکے افلاس تربیت کا بین ثبوت ہے۔ بچون کی اصل تعلیم گاہ مان کی گود ہے جس مین ہزارہا بڑے بڑے آدمی پرورشس پاچکے ہین۔ اب کیون ہم مین بڑے آدمی زیادہ تعداد مین نہین پائے جاتے ؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے عورتون کو ان کی جائز جگہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ عورتون کے متعلق ہم اپنے خیالات کی اصلاح کرین اور جو حقوق اسلام نے انھین عطا کئے ہین ان کی بجاآوری مین ہٹ اور ضد سے کام نہ لین۔ عورتون کی صحیح تعلیم ہمین ایسی بہت سی بلاؤن سے نجات دیگی جنکا رونا ہمارے لیڈر ہر قومی جلسہ مین روتے ہین۔ ان کی تعلیم ضامن ہوگی اس امر کی کہ ہم مین سے خراب رسوم چلی جائینگی، ہمارے بچے بہتر ہو جائین گے۔ اور ہماری خانگی زندگی سچی مسرت کی زندگی مین تبدیل ہو جائے گی۔

تنظیم کا تیسرا پہلو تعلیم سے متعلق ہے۔ آج ہندوستان کے مسلمان بلحاظ تعلیم پسماندہ اقوام مین شامل کئے جاتے ہین اور یہ حالت نتیجہ ہے اُس جہالت پسندی کا جو غدر سے قبل اور بعد سرسید کی کوششون کے باوجود مسلمانون پر مستولی رہی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب کا یہ قول کس قدر سچائی پر مبنی ہے کہ فی الحال ہمارا سب سے بڑا کام یہی ہونا چاہئے کہ ہم پستی اور ذلت کے اس داغ کو جسقدر جلد ممکن ہو اپنی پیشانی سے دور کردین مسلمان ذہنی لحاظ سے دوسری ہمسایہ اقوام سے یا یورپین اقوام سے کسی طرح ہیٹے نہین ہین۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ہماری معاشرتی زندگی سب خرابیون کی جڑ ہے۔ مسلمان لڑکا ابتدائی تعلیم کے زمانہ مین ہندو لڑکے سے زیادہ تیز اور ہوشیار رہتا ہے۔ لیکن ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مدارج مین اس کی ذہانت آوارگی اور لہو ولعب مین یا تو ناولون کے مطالعہ مین اور شعرگوئی مین صرف ہو جاتی ہے اور پھر اسکی بالیدگی ٹھٹھر کے رہ جاتی ہین۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے مگر اس سے انکار نہین کیا جاسکتا۔ لہذا اگر ہمین اپنے مستقبل کو ماضی کا سا

شاندار بنانا ہے تو لازم ہے کہ بچون اور بچیون کی ذہنی زندگیون کی جلد سے جلد اصلاح کرین اور انھین غلط اور گمراہ کن راستون پر نہ چلنے دین جن پر وہ بُری صحبت کی وجہ سے چلنے کے لئے خود کو مجبور پاتے ہین۔

چوتھا اور آخری پہلو سیاسی حیثیت رکھتا ہے یعنے یہ کہ ہمین اپنے سیاسی مقصد کے حصول کے لئے کیا کیا کام کرنے ہین۔ ہمین اپنی سیاسی تنظیم کا یہ مقصد ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ہم ہندوستان کی دیگر اقوام کے ساتھ ملکر اپنے ملک کا مستقبل بنائین گے۔ یہ سچ ہے کہ اتحاد کے لئے موجودہ فضا خراب ہوگئی ہے۔ لیکن مسلمانون کو یاد رکھنا چاہئے کہ ڈاکٹر موئنجے وغیرہ موسمی پرندے ہین جو ہمیشہ ہمیشہ فضائے عالم مین اڑتے پھرتے نظر نہ آئین گے۔ یہ آج ہین کل نہین۔ بیسوین صدی کی کوئی قوم علیحدہ زندگی بسر نہین کرسکتی خصوصًا مسلمانانِ ہند جو عجیب وغریب طریقے سے ہندوون کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے پر مجبور ہین۔ یہ خدائی انتظام ہے کہ ہم اور ہندو ملکر ملک کی بھلائی کا بچار کرین۔ آج ہماری حالت یقینًا خراب ہے اور دونون اقوام کے افراد کے خیالات مین سخت ہیجان برپا ہے۔ لیکن یہ کسی طرح دیرپا نہین ہوسکتا۔ حالت گو ناخوشگوار ہے مگر مایوس کن نہین۔ اور اگر ہندو مسلم اتحاد کا خواب پورا نہ ہوا تو مسلمانانِ ہند کے لئے کسی سیاسی مستقبل کا خیال تک کرنا ناممکن ہے۔

بہر حال یہ چند خیالات پریشان ہین جنھین مین لیڈرانِ تنظیم کی خدمت مین پیش کرنا چاہتا ہون اور ساتھ ہی یہ معروضہ بھی گوش گذار کرنا چاہتا ہون کہ کم سے کم وہ اپنے افعال سے یہ ثابت نہ ہونے دین کہ تنظیم کی تحریک عام ملکی ترقی کی راہ مین رکاوٹ کا باعث ہے یا ہوسکتی ہے۔ مسلمانون پر یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کردینا چاہئے کہ ہر شعبہ مین ان کی مضبوطی اور شیرازہ بندی کے معنی یہ ہونگے کہ وہ سوراج کے قریب تر آرہے ہین۔ اگر مسلمان لیڈرون کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر مسلمان

کا مذہبی فرض ہے کہ وہ ملکی آزادی کے حصول کو امر واقعہ بنا دے تو پھر دوسری اقوام سے اتحاد نہ کرنا یہ ثابت کریگا کہ وہ اپنے فرض مذہبی کو پورے طور سے بجالانے سے قاصر رہے ہین۔ مسلمان سیاسی میدان مین تنہا کچھ نہین کرسکتے۔ اسکے معنی یہ نہین ہین کہ وہ زندگی کے تمام شعبون مین اپنی ٹانگون پر کھڑے نہ ہون یا کھڑے ہونے کی کوشش نہ کرین۔ بلکہ میرے کہنے کا تمامتر مقصد یہ ہے کہ مسلمان علٰحدگی کی زندگی کبھی بسر نہین کرسکتے۔ اور یہ کہ ہر ایسی تحریک جسکا منتہائے نظر علٰحدگی ہو ایک ناممکن الحصول کوشش ہے۔

غزل

(مولانا کیفی چریا کوٹی)

کسی بیدرد سے کیا کہیئے کہ کیا ہے دل میں
لب پر آتا نہیں جو درد اٹھا ہے دل میں

بند قطرے میں ہے وہ بحر جو بے پایاں ہے
ایک طوفان تمنا کا بپا ہے دل میں !

دیدۂ تر میں مرے جس سے لہو آتا تھا !
لئے پھر آج وہی درد اٹھا ہے دل میں

آستیں دیدۂ پرآب سے اٹھے کیونکر !
عمر گذری ہے کہ ناسور پڑا ہے دل میں

تو نے اسے ضبط کہاں لا کے ڈبویا مجھ کو
گریہ جو بند ہے، طوفان اٹھا ہے دل میں

جی میں آتا ہے کہ تاثیر دعا سے پوچھوں
آج کیا بات ہے کچھ درد سوا ہے دل میں

کچھ چھلک بھی نکل جائے تو جانوں اس کو
بادۂ بیخودیٔ شوق بھرا ہے دل میں !!

تو ہی جب جلوہ نما ہو شربائی کو نہیں
کیا کہوں تجھ سے کہ کیا تیرے سوا محمل میں

تم ہو بے پردہ مگر دید کو محرومی ہے !
جذبۂ شوق سے پردہ سا پڑا ہے دل میں

رہ نوردانِ حرم یہ بھی پتہ ہے تم کو
جسکو تم ڈھونڈھ رہے ہو وہ خدا ہے دل میں

پردہ داری کی مجھے کرتے ہی بنے گی کیفی
راز کی طرح کوئی آ کے چھپا ہے دل میں

پن پربھاؤ

(از رام گنیش گڈکری)

(مترجمہ جناب اسلامی)

(مسلسل)

الیشور :۔ وسندرا ! تو میری داستان غم سننے کے لئے طیار ہے ۔ اچھا سن ! لیکن افسوس میں کس طرح بیان کروں ۔ میں بیان کرنا نہیں جانتا ۔ جب سے تیری محبت نے مجھ سے قطع تعلق کیا میں نے ہر چیز سے قطع تعلق کر لیا ۔ میں اب بات کرنا بھی نہیں جانتا ۔ اچھا وسندرا ! تجھے اپنی شادی کی کیفیت یاد ہے ۔

وسندرا :۔ شادی کے واقعات بھی بھولنے والے ہوتے ہیں ۔

الیشور :۔ سچ ہے انسانی زندگی میں صرف تین ہی روز قابل یاد داشت ہوتے ہیں ۔ ایک تو پیدائش کا دن ۔ دوسرا شادی کا اور تیسرا موت کا ۔ لیکن شادی کے علاوہ دوسرے دو دن انسان کو یاد نہیں رہ سکتے کیونکہ وہ قدرتاً اس قابل ہی نہیں ہوتا ۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے اس وقت اس میں قوت حافظہ نہیں ہوتی اور جب مرتا ہے تو قوت حافظہ ختم ہو جاتی ہے اس لئے صرف شادی ہی کا دن ایسا ہے جو یاد رہ سکتا ہے ۔ لیکن آہ وسندرا ! تیری شادی کے دن نے میرے مقصد زندگی کو خاک میں ملا دیا اب میں موت کے انتظار میں ہوں ۔ وسندرا ! تیری شادی کے روز تیری زندگی کی راحتوں کا جنم اور میری زندگی کی آسائشوں کی موت ہوئی ۔ گویا تو نے اپنے گھر میں ہنسی خوشی قدم رکھا اور میں نے اپنے گھر سے باحسرت و یاس آخری قدم نکالا ۔

وسندرا ۔ الیشور ! میری شادی کے متعلق تین درخواستیں آئیں ۔ جنمیں سے دو کو میرے باپ نے نامنظور کیا ۔ ہورنداون کی درخواست اس لئے ناقابل قبول سمجھی گئی کہ وہ عالی خاندان نہ تھا اور تم

الیشور ——— اور مجھ کو ——— اور مجھکو اس لئے ناقابل سمجھا کہ میں تیرے لائق نہ تھا ۔

وسندرا : میرا کہنا بُرا نہ مان۔ یہ میری تقریر کا قصور ہے۔

وسندرا :۔ الیشور! اچھا تم مجھے قابلِ الزام تو نہ سمجھو گے!

الیشور :۔ واہ! بھلا ایسا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! تیرے باپ کا خیال غلط نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو میں تجھ پر کیوں الزام لگاؤں۔ وسندرا! تو حسن کی دیوی ہے! تو دنیا کی ایک بے بہا دولت ہے! اور ایک دولت جس کے حصہ میں آتی ہے۔ مجھ جیسے گداگر کو اپنی قسمت سے شکوہ کرنا چاہیئے نہ تجھے الزام لگانے کا مجھے کیا حق ہے! دیکھو! آسمان سے جو ستارہ ٹوٹتا ہے وہ زمین کے خوبصورت پھولوں میں سما جاتا ہے۔ تو بھی آسمانِ حسن کا ایک ستارہ ہے جو دنیا کے ایک شگفتہ پھول میں سما گیا ہے۔ زمین پر پڑے ہوئے پتھروں کو اپنے نصیب پر ماتم کرنا چاہیئے۔ مجھے الزام لگانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بلکہ تیرے روز افزوں نشاط کو دیکھ کر مسرور ہونا چاہیئے۔

وسندرا :۔ الیشور! الیشور! مجھے معاف کرو! مگر ابھی تک تمہارے دل میں ——

الیشور :۔ وسندرا! تیری طرف سے میرے دل میں کوئی بدگمانی نہیں ہے۔ میں نے تو اسی وقت سے کلیجہ پر پتھر رکھ لیا ہے۔ میں ایسا نا سمجھ نہیں ہوں کہ تیرے جیسے نازک پھول کی اپنے پتھر جیسے دل سے پرستش کروں۔ وسندرا! تیری شادی کے وقت جب تیرے بیاہ کے نغمے گائے جا رہے تھے تو میں سمجھتا تھا کہ میرے جنازہ کے رسوم ادا ہو رہے ہیں۔

وسندرا۔ الیشور! تمہاری اداسی مجھے غمگین کر رہی ہے ؎

شور بلبل کم نگردد گر گل ہر دو گر چمن ... حسن بے بنیاد باشد عشق بے بنیاد نیست

الیشور! میں تم سے ایک درخواست کرتی ہوں۔ کیا تم اسے قبول کرو گے؟ ——

تم جلد کہیں شادی کا بند و بست کیوں نہیں کر لیتے؟ ۔

الیشور۔ آہ وسندرا! جس کی امید میں میں بچپن سے تھا وہ امید ختم ہو گئی ——

وسندرا: اگر میں اور کچھ زبان کھولوں تو شاید گنہگار ٹھیروں۔

وسندرا۔ بیشک! لیکن دنیا میں آدمی کی تمام آرزوئیں تھوڑی ہی پوری ہوتی ہیں! انسان کو

چاہیئے کہ تھوڑی بہت راحت جو میسر آئے اسی پر قناعت کرے۔
الیشور۔ آہ وسندرا! میرے لئے حقیقی راحت کہاں؟ میری راحتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ میں کس چیز پر قناعت کروں؟ اگر کوئی شاندار جلوس جا رہا ہو جس میں ایک ہاتھی ہو۔ اور دفعتہً ہاتھی مر جائے تو کیا اس کے مردہ جسم پر اس کے دانتوں کی نمائش کرنے سے کوئی مسرت حاصل ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اگر ایک کسان جس کی فصل قریب طیاری کے ہو اپنے کھیتوں پر ابر دیکھے اور اس خیال سے خوش ہو کہ بارش ہوگی اور میں خاطر خواہ فائدہ اٹھاؤں گا۔ لیکن وہ گھٹا یا ابر سے گذر جائے تو کیا اسے محض اس خیال سے تسکین ہو سکتی ہے کہ اس نے ابر کے سایہ سے تھوڑی دیر فائدہ اٹھایا؟ وسندرا! میں تجھے کائنات کی ملکہ سمجھتا تھا۔ اور تیرے تصور کی رنگینی میں اپنی تمام قوتیں صرف کیا کرتا تھا۔ کیا اب تو چاہتی ہے کہ میں ان قوتوں کو ایک بازار سے خریدے ہوئے جاندار کھلونے کے تصور میں صرف کروں؟ آہ وسندرا! میرا ارمان دل کچھ ایسا ویران ہوا ہے کہ اب اس کے لئے کوئی سکھ کی صورت نظر نہیں آتی۔ اب تو مجھے اس زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیئے
وسندرا۔ الیشور! ہم دونوں بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں۔ اس لئے تم میری باتوں کا برا نہ ماننا۔ محض خیالی مسرتوں پر بھروسہ کر لینا اور ان کے نہ ملنے پر دنیا کو تج دینا کونسی عقلمندی کی بات ہے؟

(باقی آئندہ)

رام گنیش گڈکری

(گذشتہ سے پیوستہ)

(از جناب منشی عبداللہ خانصاحب)

عقل کی فضیلت کا فیض کہئے یا خدا کی دین کا اثر سمجھئے تلوار۔ ترازو اور دل کی نسبت چھوٹا سا قلم بازی لے گیا۔ میدان پر بہا ہوا خون ایک بارش کے بعد ہی دھل کر صاف ہوجاتا ہے مگر کاغذ پر کی روشنائی سیکڑوں موسم گرما کے بعد بھی جوں کی توں قائم رہتی ہے سونا تولنے کی ترازو مالک کے مرجانے کے بعد بیکار ہو جاتی ہے مگر قلم سے نکلے ہوئے الفاظ دل پر نقش کالحجر کے مترادف ہیں ہل جتی ہوئی زمین ایک سال کے پیشتر ہی محنت کا معاوضہ دیدیتی ہے اور بہت جلد نظروں سے غائب بھی ہو جاتی ہے لیکن قلم سے۔ بوئی ہوئی فصل ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتی ہے ایسے لوگوں کی عظمت کے متعلق پیشتر ہی سے علم ہونا ممکن ہوتا تو بہت سی ابتدائی زمانہ کی دلچسپ باتیں میسر ہوتیں چونکہ ایسے لوگ ایک آبدار موتی کے مانند ہوتے ہیں اور جبتک موتی سیپ میں سمندر کی تہ میں ہوگا اس کی حالت کا اندازہ ناممکن ہے باہر آنے کے بعد اس کی قدر ہوتی ہے۔ گڈکری ملک گجرات کے قصاری قصبہ میں ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے ان کا اصلی وطن کوکن میں کرنجت کے قریب سانگوی ہے گڈکری کے والد ملازمت کی وجہ سے گجرات میں تھے۔ گڈکری کی تعلیم کی ابتدا مکان ہی میں ہوئی مگر جب ان کے والد ۱۸۹۱ء میں بیمار ہوئے تو تعلیم کا سلسلہ بھی کچھ کمزور ہوا آخر اسی بیماری میں ان کا ۱۸۹۳ء میں انتقال ہوا اب گڈکری یتیم ہونے کی وجہ سے حالت طفلی کے خواب سے بیدار ہوگئے اور زمانہ کی بھیانک صورت انہیں نظر آنے لگی مگر ان کی والدہ نے بڑی ہمت سے ان کا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا زمانہ کی بادمخالف نے صیاد کی طرح پیچھا کیا اس وجہ سے ان کا مرغ دل بہت ہی بیقرار تھا مگر کہیں جاکر پناہ کی جگہ حاصل کرنا ناممکن تھا۔ اس حالت میں وہ تعلیم پاتے رہے جب عبارت پڑھ کر سمجھنے کی قابلیت حاصل ہوئی تو کتابوں کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئے

ذہین طلبا کے لئے مدرسہ کے اسباق ذہن نشین کرنا بہت آسان ہوتا ہے مگر یہ اسباق دل کی تسلی کا باعث نہ ہو سکے تاریخ میں بہت سے اولوالعزم شخصوں کی سوانح عمریاں دیکھیں ان کی ترقی کے ذریعہ اور قصے اور وہ مثالیں ان کی حالت کی مناسبت سے بیکار نہیں۔ جغرافیہ کے ذریعہ تمام کرۂ زمین کا حال معلوم کیا مگر اپنی ترقی کے لئے مناسب مقام کونسا ہے اس کا پتہ نہ چلا علم ریاضی میں کرشمون کا یقین دیوں کیا مگر مفلسی نے پیچھا نہ چھوڑا دولت کی نسبت صحت زیادہ اچھی یہ سبق فقط کتابوں میں ہی پڑھنے کے لئے تھا تمدن میں بیکار معلوم ہونے لگا۔ اب مطالعہ کی طرف ان کی زیادہ توجہ ہوئی اور کتابیں بھی ان کی دل کی تسلی کا واحد ذریعہ ثابت ہوئیں سینکڑوں اشعار از بر کئے اور موجودہ زمانہ کی لکھی ہوئی ناٹک کی کتابیں آہستہ آہستہ دیکھنی شروع کیں عمر کے گیارھویں سال انہوں نے ایک ڈرامہ لکھا زمانہ طفلی کی امیدیں بہت بڑی ہوتی ہیں امیدوں کے راستہ میں مشکلات کے پہاڑ و دریا حائل نہیں ہو سکتے اور تجربے کی باگ نہ ہونے کی وجہ سے وہ بے دھڑک ہر طرف دوڑتی پھرتی ہیں۔ ان طفلانہ امیدوں کے سہارے وہ اپنے تصنیف شدہ ناٹک کو لیکر کرو سکر جیسی مشہور ناٹک کمپنی کے پاس پہونچے۔ کس کو خبر تھی کہ ڈرامہ حاصل کرنے کے لئے آئندہ زمانہ میں اس کمپنی کے منیجر کو اس لڑکے کی خوشامد کرنی پڑیگی پردۂ غیب اٹھ جانے کے بعد عالم کی دلچسپیاں باقی نہیں رہیں اس لئے خداوند تعالٰے نے یہ انتظام کیا ہے بچے نے کچھ لکھنے کی طرف ان کی توجہ مبذول ہوئی۔ نثر کی نسبت نظم کا لکھنا زیادہ مشکل ہوتا ہے مگر اکثر لوگ ابتدا میں اسی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور سوڈا واٹر کے جوش کی طرح جنہی روز میں اکثروں کا یہ جوش کم ہو جاتا ہے شاذ و نادر ہی کسی میں یہ جوش ترقی پذیر ہوتا ہے گو کہ ان ہی نادر الوجود ہستیوں میں سے تھے نظم کا ابتدائی مصرعہ کب کہاں اور کس طرح دل نشین ہوا اس کا پتا نا ان کے لئے محال تھا اور ہر شاعر کے لئے محال ہے شاعری کو عشق سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ جبتک اسکی جڑیں دل کی گہرائی میں دور تک نہ پہونچیں اس وقت تک اس کے موجود ہونے کا پتہ نہیں چلتا جب اس کے موجود ہونے کا پتہ چلتا ہے دل اس کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ عشق کی طرح شاعری کو بھی آنکھ مچولی ... کھیلنا بہت پسند ہے

جہاں آنکھیں بند ہوئیں اور یہ دلہن بھاگی کبھی دکھائی دیتی ہے کبھی پتہ چلتا ہے کبھی ہاتھ آنے کی امید ہوتی ہے اور کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے ٹیگور کو بھی اسی طرح شاعری نے کئی بار دھوکہ دیا مگر آخر ان کے دل میں گھر کیا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں ٹیگور نے بغرض تعلیم یورپ میں بودوباش اختیار کی اس وقت ان کی عمر پندرہ سال کی تھی تھوڑے عرصہ کے بعد امنگوں کا ہجوم ہونے لگا ناممکن کو ممکن کر دکھانے کی خواہش پیدا ہونے لگی جوانی کے عالم کی وجہ سے اس قسم کے خیالات موجزن ہونے لگے کہ پہاڑ پر سے گرنے والے آبشار کی ہمت کو میں پست کر دکھاؤں گا آسمان میں اڑنے والے عقاب کو پس پشت ڈال دوں گا اور زمین کو جلا دینے والی برق کو نیچا دکھاؤں گا۔ یہ زمانہ کلی کھلنے کا ہوتا ہے۔ اگر کلی کسی ہرے بھرے خوشنما درخت کی ہو یا کسی پژمردہ اور ناتوان پودے کی کلی پھول بن کر کسی شہزادی کے گلے کا ہار بن سکتی ہے اور قسمت برگشتہ ہو تو ایک ہرے بھرے خوشنما درخت کی کلی ویرانے میں یوں ہی خشک بھی ہو سکتی ہے مگر زمانہ آئندہ کی حالت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہ دونوں کلیاں باد آغوش میں کھل کھلاتی ہیں۔ پندرہ سال کی چھوٹی عمر میں ہی انہیں بہت کچھ تجربہ ہو چکا تھا۔ بادِ مخالف نے انہیں بہت گھمایا تھا۔ مفلسی کی آگ نے پریشان کر رکھا تھا مگر انہوں نے اپنی گذر اوقات کے لئے یکے بعد دیگرے۔ اس چھوٹی سی عمر میں بھی کئی پیشے اختیار کئے قلم سے آبحیات ٹپکانے والے کو دودھ بیچنا پڑا شاعری کے چمن میں رہنے والے بلبل کو خشک لکڑیاں بیچنی پڑیں زبان کے درخت پر خوشنما پھول کھلانے والے شاعر کو سبزی کی خرید و فروخت میں وقت گزارنا پڑا وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جو جو پیشے میں نے اختیار کئے اس کی فہرست بنانے کی نسبت جو جو پیشے اختیار نہیں کئے اس کی فہرست بنانا آسان ہے۔

(باقی آئندہ)

کنھیا

(از مولانا کیفی چریا کوٹی)

کنھیا پیا بسنے آ دین بجاوت بینا
شبد سنت چت شور کرت نا ہیں۔ نہ جانوں کا کیتا!
نیہہ روگ کا پوچھت آئے۔ انگ انگ میں بینا!
آس مرت کیفی پیا سے بست ہیں۔ جس مندری میں نگینا!

بدو۔ یا ابن الامیر! ہم سب تقریباً دس ہزار عرب بالکل تیار بیٹھے ہیں۔ شیخ کرامت شیخ مبارک، شیخ فیضان وادی السوس اور وادی الحمرا کے تمام شیوخ اور جبل شمار تک کے تمام قبائل بس آپ کے ایک اشارہ کے منتظر ہیں۔ فرنگی افسر بھی جدہ پہنچ چکے ہیں اور اپنے ساتھ عجیب قسم کی فولادی گاڑیاں اور بہت سے ذخائر لائے ہیں۔ جو بندرگاہ ینبوع پر جہاز سے اتارے جا رہے ہیں۔ تار بھی کاٹے جا چکے ہیں۔ اور مدینہ طیبہ کی قلعہ بند فوج کے راستے اب ہر طرف سے بند ہو چکے ہیں۔"

شیخ حسن بمشکل اپنی مسرت و فرحت کو ضبط کر سکا۔ اور خندہ زن ہو کر بولا "یا اللہ! یا اللہ! یہ تجویز تو پہلے ہی سے بالکل مکمل ہے۔ واہ واہ! یہ کلدار تو ہیں بھی کیا وقت پر ہاتھ لگی ہیں۔ چلو اچھا ہوا۔ بعد میں کام آئیں گی۔"

(۴)

دوسرے دن علی الصباح میجر حسن بلغاری فوج کے ایک دستہ کو ساتھ لے کر کیمپ سے صحرا کی طرف روانہ ہوا۔ اور دوپہر سے پہلے پہلے اس نے اپنی فوج کو ایک برساتی نالہ کے کنارے ٹھہرا کر اس بدو ایلچی کو عربوں کی ٹوہ لینے جاسوس بنا کر بھیجا۔ اب شیخ حسن کی تدابیر بار آور ہو رہی تھیں۔ چنانچہ شام ہوتے ہوتے وہ ایک لمبی پہاڑی کی اونٹ جیسی کوہان والی چوٹی کی طرف روانہ ہوئے اور اس کے دامن میں خیمہ زن ہو گئے۔ آدھی رات کے قریب پہاڑی پر کچھ آدمیوں کے چلنے پھرنے کی آواز سے یہ لشکر بیدار ہوا۔ اور صبح کی دھندلی دھندلی روشنی میں کچھ عرب سپاہی نظر آئے جو خیموں کی طرف تاک لگائے دیکھ رہے تھے۔ ایک عرب سفید جھنڈی ہلاتا پہاڑی بکرے جیسی پھرتی اور سرعت سے نشیب کی طرف آیا اور سنتریوں کے قریب پہنچ گیا۔ اسے فوراً کمانڈر کے ڈیرہ پر پہنچا دیا گیا جہاں اس نے چھوٹا سا پیکٹ میجر حسن کے حوالہ کیا۔ جب اس عرب نے باغی شیخ کو پہچانا اور اسے تین ہمراہی ادنیٰ عہدیداروں کو بلاتے دیکھا تو وہ مسکرانے لگا۔ حسن نے پیکٹ کھولا تو اس میں سے ایک پتھر برآمد ہوا جس پر ایک تاریخ تحریر تھی۔ یہ تاریخ "بغاوت کی نشانی" تھی۔ میجر حسن نے پیکٹ لانے والے سے استدعا کی کہ وہ اپنے تمام مسلح عربوں کو آگے بڑھ آنے کی ہدایت کر دیں۔ تینوں ادنیٰ افسر اور دستہ کے تمام سپاہی

اس عجیب وغریب دعوت کا نتیجہ دیکھنے کے لئے بیتابانہ منتظر تھے اور جونہی کہ عرب قبائل زد میں آگئے میجر حسن نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جلدی سے نووارد قبائل کا سردار بنکر کھڑا ہوگیا تینوں ترک افسر اس کے پیچھے پیچھے تھے مگر حسن کی طرف بے اطمینانی سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے ان افسروں اور اپنی یلغاری فوج کو ہتھیار ڈالدینے اور ایک طرف ہٹ جانے کا حکم دیا۔ ان افسروں میں جو شخص عہدہ اور زمانۂ ملازمت کے اعتبار سے باقی دو سے بڑا تھا اب صورت حالات کو بخوبی سمجھ گیا۔ اس نے فوراً اپنے ساتھیوں کو للکارا کہ خبردار ہتھیار ہرگز نہ ڈالنا بلکہ لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر اس نے پستول میجر حسن کی طرف سر کیا۔ اور اسے خائن، مردود، بے فدیہ عرب کتے" کے لقب سے خطاب کیا۔ نشانہ نے خطا کی مگر گولی ایک اور شیخ کے جو حسن کے پاس ہی کھڑا تھا جا لگی اور وہ وہیں ٹھنڈا ہوگیا۔ شیخ حسن نے اب عرب قبائل کو ان آمادۂ پیکار ترکوں پر دھاوا بولدینے کا حکم دیدیا۔ اور ان تین افسروں میں سے دو تو فوراً گولی کا نشانہ بنا لئے گئے لیکن تیسرا ترک افسر عرابوں کی مسلسل گولہ باری کے باوجود گھوڑا دوڑاتا اپنے دستہ کی طرف واپس آیا اور اس نے کمان اپنے ہاتھ میں لیکر عربوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کرادی۔ جس کے سبب بہت سے عرب وہیں کھیت ہوئے اس نے کلدار توپوں کا رخ باغیوں کی طرف پھیر کر پہاڑی پر بھی پیہم گولے برسانے شروع کردئے جس سے عربوں کے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ شیخ حسن کا ارادہ تھا کہ اس دستہ کو چاروں طرف سے گھیر کر ان سے ہتھیار رکھوالے اور سب کو وہیں تہ تیغ کردے۔ لیکن جب اس نے لڑائی کا یہ رنگ دیکھا تو مجبوراً اپنے ارادہ سے درگذرا۔ اور فوراً اپنا گھوڑا موڑ کر بے ترتیب پراگندہ حال قبائل کو ہمراہ لے، سرپٹ گھوڑا دوڑاتا پہاڑی کی دوسری جانب بھاگ نکلا۔ ترکوں نے اپنے زخمی ساتھیوں کو سنبھالا اور اندیشہ ناک مقام سے فوراً کوچ کرکے بہت جلد اپنے مستقر واپس پہنچ گئے۔

(۵)

جنگ عظیم بدستور جاری رہی اور ترکوں کو جنوبی فلسطین چھوڑنا پڑا۔ لارنس حریت شکری

پاشا نے جو مدینہ طیبہ کی قلعہ بند فوج کا کمانڈر تھا قلعہ کو اچھی مضبوط قلعوں کی مانند بیرونی حملوں سے محفوظ کر رکھا تھا اور بغاوت و غدر الٰہی کے طوفان خیز صحرا میں محض تنہا مدافعت کرتا رہا ۔ لیکن اکیلا چنا بھاڑ کیوں کر پھوڑتا ۔ اور اکیلا شکری پاشا اور اس کی فوج قلیل کب تک مدافعت کرتی ۔ نتیجہ جو اکثر ایک محاصرہ قریب سے قریب تر ہونے لگا ۔ اور ایک دن وہ بھی آ گیا کہ جب ایک عرب ایلچی یہ پیغام لیکر قلعہ میں آیا کہ "مقدس تبرکات حوالہ کر دو تو تمہاری جان بخشی ہو سکتی ہے" یہ تھے وہ الفاظ جو اس بے پناہ دھمکی آمیز پیام میں تحریر تھے ۔

دلیر، جانباز، محمد شکری پاشا نے یہ بے باکانہ بے ادب تحریر فوراً چاک کر دی اور سفیر حامل اور اس کے ماتحت تمام قبائل کو کہلا بھیجا کہ تم سے جو کچھ ہو سکے کر دیکھو ۔ تبرکات تو ہرگز نہیں دئے جا سکتے بقیۃ السیف سپاہی، تمام سولین اور ان کے اہل و عیال جو سب کے سب ترک نژاد تھے اب بھوک پیاس کی شدت اور تکلیف سے جاں بلب ہو گئے تھے ۔ لیکن ابھی تک ان کی ہمتیں قوی تھیں اور ان کے ارادے مضبوط تھے وہ ہر طرف سے گھرے ہوئے تھے اور بیرونی دنیا سے ان کا تعلق اللہ لہذا صرف محض لاسلکی پیغامات کے ذریعہ تھا ۔ ایک دن وہ برقی پیام اس قلعہ بند فوج کو ملا کہ "برطانوی افواج بیلر شیبا کی طرف سے یورش کر رہی ہیں ۔ سقوط یروشلم اب یقینی ہے" یہ پیام گویا یہ ہدایت تھا کہ جس طرح بن پڑے مقدس تبرکات کو محفوظ رکھو ۔

فوجیوں نے ایک جنگی کونسل منعقد کی ۔ شکری پاشا نے تجویز پیش کی کہ محصورین یکبارگی حملہ کر دیں ۔ جسے سب افسروں نے بطیب خاطر پسند کیا ۔ مقدس تبرکات ایک جگہ جمع کئے گئے اور تمام جانباز سپاہیوں میں تقسیم کر دئے گئے ۔ جنہوں نے تبرکات کو اپنی اپنی زرہوں میں سی لیا ۔ اور بدوؤں کا بھیس بدل کر قلعہ سے نکل بھاگے ۔ دن کو پہاڑی قلعوں میں پناہ لیتے اور راتوں کو سفر کرتے کرتے یہ سپاہی بالآخر ترکی افواج کے مستقر تک پہنچ گئے ۔ جہاں شہر بالکل خالی کر دینے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اسی اثنا میں شکری کو ایک اور لاسلکی پیام ملا کہ "جو لوگ فلسطین اور شام میں ہمارے پاس نظر بند ہیں ان کے بدلے میں اپنی فوج کی جان بخشی کرا لو" شیخ کامل نے اس تجویز کو منظور کر لیا ۔ لیکن یہ شرط اور تھا

لگا دی کہ اگر سپاہی محض اپنی جانیں لیکر چلے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن مقدس شہر کی ایک چیز بھی ساتھ نہ لیجائی جائے۔ شکری پاشا نے یہ شرط قبول کر لی اور تین دن بعد یہ قلیل التعداد فوج فلسطین جانے کے لئے مدینہ طیبہ سے حجاز ریلوے کے تیسرے اسٹیشن سے سوار ہو گئی۔ لیکن ابھی شکری پاشا کی تمام فوج قلعہ سے نہ نکلی تھی اور پیدل فوج کی ایک رجمنٹ بدین غرض پیچھے رہ گئی تھی کہ بعد میں عورتوں اور بچوں کو ساتھ لیتی آئے۔ یہ پہلے ہی طے پاچکا تھا کہ فوج کا بیشتر حصہ چلے جانے کے بعد عرب قبائل (غیر حریف و غیر ہنرد آزما) پسماندگان کو نہ ستائیں گے۔ اور جسقدر جلد ان کے واپس جانے کے لئے سہولتیں پیدا ہو سکیں گی ان سب کو بحفاظت تمام ترکی چلے جانے کی اجازت دیدیں گے۔

(۶)

شیخ فاضل نے ترک افواج کے چلے جانیکے فوراً بعد مدینہ طیبہ میں داخل ہونیسے پرہیز کیا۔ کیونکہ اُسے پسماندہ ترکوں اور کئی عدد توپوں سے جنہیں شکری پاشا سے چھوڑ گیا تھا، بیحد خوف لاحق تھا۔ اُسنے اپنی منتشر فوجوں کو جمع کیا۔ اور دو عدد توپیں، جو اس تمام فوج کا کل سرمایہ تھیں، ہمرکاب لیکر بہت احتیاط اور ہوشیاری سے شہر کی حدود میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے اُسکی توجہ مقدس تبرکات کی طرف مبذول ہوئی۔ لیکن جونہی مسجد نبوی ؐ کے ضعیف و مسن نگہبان نے اُسے یہ بتایا کہ تبرکات تو قلعہ کے تخلیہ کی تجویز ہونے سے پہلے ہی ترکوں نے اپنے قبضہ میں کر لئے تھے، تو شیخ موصوف کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُسنے حکم دیدیا کہ باقیماندہ ترک سپاہیوں اور مدینہ حرم ؓ کے خدمتگاروں کا قتل عام کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سے فراغت پاکر اُس نے تمام مستورات اور بچوں کو جمع کیا اور شہر کی سب سے بڑی سرائے، موسومہ تاتاری مسافرخانہ میں قید کر دیا۔ فاقہ زدہ، نحیف و نزار عورتیں، اپنے ننھے ننھے، بھوکے پیاسے، بدحال، بیتاب بچوں کو سینوں سے لگائے گلی گلی کوچہ درکوچہ گھسٹتی پھریں اور آخرکار اس ہیبت آفریں، بے آرائش و تزئین سرائے کے بھیانک، تاریک اور تکلیف دہ کمروں میں قید کر دی گئیں۔ سنگدل، جفاجو، خون آشام بدو ان زندہ درگور قیدیوں کی حراست اور نگہبانی پر مقرر کئے گئے، اور [illegible] صفت اور بے رحم تھے کہ بیچاری ستم رسیدہ عورتوں اور آفت زدہ، تشنہ لب بچوں کی ننھی زبانیں جب تک پیاس کی شدت سے

باہر نکلی پڑتی تھیں۔ اور جبکہ دم بالکل لبوں پر ہی آ گیا تھا، صدا ہائے العطش العطش پر بھی مطلق کان نہ دھرتے تھے دن بھر یہ مصیبت کے مارے قیدی پانی پانی چلاتے رہتے لیکن ظالم فاضل نے اسعد جبہ شقاوت پر کمر باندھی تھی کہ وہ بالکل پتھر ہو گیا اور پروا بھی نہ کی کہ کون کیا کہتا ہے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اس کی یہ دلی خواہش کہ وہ متبرک تبرکات پر قبضہ کرلے پوری نہ ہو سکی تھی کیونکہ ترک اس سے بھی پہلے یہ تبرکات لیکر چلدئے تھے۔ اور اسی لئے اس نے تصفیہ کر لیا تھا کہ اپنی اس خفت کا بدلہ انہیں لاچار و مجبور لیسماندگاں سے لے گا۔

شیخ فاضل کے انتہائی غیض و غضب کے ان لاچار و بے بس شکاروں نے تین دن اور اسی طرح بے آب و دانہ اس ارضی جہنم میں بسر کئے۔ لیکن چوتھے دن بالآخر نجات کے فرشتے انہیں آتے دکھائی دئے۔ مصیبت زدوں کی گریہ وزاری موقوف ہو چکی تھی اور یہ زندہ گورستان شہر خموشاں کا سچا منظر بن گیا تھا مفسدہ پردازوں کی طرح سنتریوں نے سرائے کے بھاری دروازے کھولے اور اندر کی دیوار کے پاس ایک کونہ میں مرتعش، بھوکے پیاسے، بے جان لاشوں کا ایک ڈھیر پڑا دیکھا ایک بدو آگے بڑھ کر ان بے حرکت بے جان لاشوں کے پاس پہنچا۔ ایک مسن ضعیف نے جس کا رنگ ہلدی سے زیادہ زرد ہو گیا تھا۔ جانکنی کی آخری رمق میں ان خونخوار قاتلوں کی طرف اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے نہایت خشک پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں سے "سنگدل فاضل" نہایت آہستہ سے آواز نکلی اور پھر یہ جسم بھی بالکل ٹھنڈا ہو گیا.......... ....

برسات میں ماتھران کی فضا

(از مسٹر نسیلم بلگامی)

گرمی کی چیخ پکار سنکر اللہ میاں نے اتنا پانی برسایا کہ ندی نالوں میں سیلاب آگیا۔ راستوں میں دو دو فٹ پانی بہہ رہا ہے۔ مجھے وینس (Venice) کی یاد آئی جہاں راستوں کے بجائے نہریں اور کشتیاں کام دیتی ہیں۔ سب طرف پانی ہی پانی ہوگیا ہے۔ جنگل، ٹیلے، پہاڑ سب سبز مخمل کی چادریں اوڑھے اپنے پیا کی یاد میں سنورکے اپنے حسن کی نمائش کر رہے ہیں۔

ماتھران کی سربلند چوٹی پینوراما پائنٹ (Panorama Point) اور وہ پہاڑ جس سے ریل گذرتی ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ بیسیوں جگہ پانی کی بجلدار نہریں نیچے کی طرف کودتی ہوئی بہت دلاویز معلوم ہوتی ہیں۔ یہ پانی کی قطاریں ہیں یا چاندی دودھ کی نہریں انچکتی، جھومتی کودتی، ناچتی، بانکی ٹیڑھی یہ کدھر دوڑ رہی ہیں۔ جس کے جذبات مردہ ہو چکے ہیں، جس کے دل کی امنگیں سرد ہو چکی ہیں۔ جس کا تخیل بیکار ہو چکا ہو وہ ادھر آئیں اور ان پہاڑوں کو دیکھیں ان میں زندگی کی روح از سرنو پھونکی جائےگی۔ قدرت کا کتنا حسین، کتنا دلکش، کتنا پیارہ نظارہ ہے؟ میں برسات میں بھیگتا ہوا گھنٹوں بار بار پہاڑی کی طرف دیکھتا ہوں۔ اور ہر بار خوشی و مسرت کی لہروں کو اپنے سینہ میں مچلتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔

برسات کا موسم ہم لوگوں کے لئے قیامت بن کر آتا ہے۔ پژمردہ جذبات میں حرکت اسی موسم میں ہوتی ہے۔ مٹے ہوئے احساسات اسی موسم میں زندہ ہوتے ہیں، سوئی ہوئی تمنائیں اسی موسم میں مچلنا شروع کرتی ہیں۔ مجروح ارمان، ناکام آرزوئیں اسی رت میں اچھلنے لگتی ہیں۔

ہائے برسات: اب سبزہ اور ہم! کہیں جھولا لگا ہوا ہو۔ باغ و درختوں میں کوئل و مور پکار رہے ہوں۔ ایک حسین نوجوان شباب میں مست دوشیزہ کھلے ہوئے لمبے بال پشت و شانہ کے پیچھے

چھوڑے ہوئے۔ نازک کلائی کی نازک انگلیوں سے جھولے کی رسی تھامے ہوئے۔ گہرے گلابی رنگ کی ساری اپنی خفیف شکنوں کی گرفت میں اسکے جسم کو لئے ہوئے اپنے عاشق کے ہجر میں امیر خسرو یا نظیر اکبر آبادی کے گیت گاتی ہوئی جھول رہی ہو اور نیلم اس سین کو برسات کی بوندوں میں بھیگتا ہوا دیکھ دیکھ کر مست و سرشار ہوا جاتا ہو۔ بھلا یہ خیال کتنا اچھوتا اور رومانس (Romance) سے بھرا ہوا ہے۔

ساون بھادوں پر کیسی کیسی دلکش نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں، یہ گیت، یہ اشعار کیا ہیں؟ ہندوستانی عورت کے جذبات قلبی کا اظہار ہیں۔ ان اشعار میں، ان گیتوں میں جذبات و خیالات کا کتنا اچھوتا پن، کتنا البیلا پن، کتنی معصومیت، کتنی وفا بھری رہتی ہے۔ آہ! ہندوستانی عورت! تو مردوں کے ظلم و ہوس کا شکار ہوتی ہے، لیکن تیری پاکدامنی، تیری وفاداری، تیرے جذبات کی پاکیزگی، تیری قربانیاں تیرا صبر ہندوستان کے لئے مایۂ ناز ہے۔ ہندوستان کا قدیم تمدن، تہذیب انہیں عورتوں کے طفیل ابتک زندہ ہے۔ عورت کے متعلق میرا بہت ہی پاک، و اعلیٰ خیال ہے۔ عورت کے اخلاق و سیرت، اس کی تربیت طرز معاشرت، ماحول طرز تعلیم اور صحبت کے ماتحت ہے۔ عورت کی تصویر پر جدید روشنی نے اور بھی چھینٹے ڈالدے ہیں۔ لیکن میں عورت کی فطرت، عورت کے جذبات پر بحث کر رہا ہوں۔ وہ قابل احترام ہے۔ وہ دنیا کی روح ہے۔ وہ زندگی کی روشنی ہے۔ وہ محبت کی دیوی ہے۔ وہ وفا کی تصویر ہے۔ وہ قربانیوں کی مجسم مورت ہے۔ وہ صبر و تحمل کی پتلی ہے۔ عورت دنیا کے عجائبات سے ایک بہترین صنعت ہے۔ اسی عورت پر آج ہزاروں سال سے مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ ہزاروں سال سے شاعر ان کی مدح خوانی کرتے آرہے ہیں۔ اقبال کا ایک شعر یاد آگیا ہے

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا علم ٭ اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

عورت کے متعلق انگریز شاعر بائرن (Byron) نے ایک جگہ کیا خوب کہا ہے:۔

"The oldest thing on record, and yet new"

رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک جگہ عورت کو "نصف عورت اور نصف خواب" کہا ہے۔ ہومر (Homer)

کی ہیلن (Helen) شکسپیر (Shakespeare) کی مختلف ہیروئن (Heroines) دانتے کی (Beatrice) کالیداس کی شکنتلا وغیرہ میں عورت مختلف رنگوں میں جھلکتی ہے۔ اسلام میں عورت کچھ اور ہی شان سے نظر آتی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا کہ مجھے تین چیزیں پسند ہیں:- نماز - عورت - خوشبو +

جذبات پنہاں

(از جنابہ رابعہ خاتون پنہاں)

نہیں تاب شکیبائی تو پھر ضبط فغاں کب تک
گھٹے گا مجمر دل میں یہ آہوں کا دھواں کب تک

نگاہ باغباں رہ رہ کے برق آسا تڑپتی ہے
رہیگا اس طرح اپنا چمن میں آشیاں کب تک

لگیں خوں رنگ ہونے پتلیاں شہلائی کافر کی
نہ لاتی رنگ آخر خون دل کی داستاں کب تک

شب غم کی سحر ہوتے ہی سر دھننے لگی یہ بھی
شریک سوز رہ سکتی تھی شمع ضوفشاں کب تک

نویدائے دست وحشت آمد فصل بہاری ہے
وبال دوش دامن کی رہیں گی دھجیاں کب تک

شب غم چرخ بھی جلنے لگا آہ شرر زا سے
رہیگا کوئی مست نشۂ خواب گراں کب تک

نہیں ملتا نشان منزل امید مضطر کو
غبار یاس میں بھٹکیگا یارب کارواں کب تک

شرارے اڑ رہے ہیں شعلۂ آتش نوائی سے
رہیں گی میری سد رہ قفس کی تیلیاں کب تک

ہے رقص اضطراری خون بسمل میں بھی اے پنہاں
کرے گا اضطراب دل کا قائل امتحاں کب تک

حیوان

اور

اس کی شفقت

(مولانا لطافت حسین صاحب ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ)

افریقیہ کے جنگلی گاؤں میں بھونچال جب بے گناہ مخلوق کو تکلیف پہونچانا چاہتا ہے یا نہر اپنے فیض سے فیضیاب ہونا چاہتی ہے تو بیچارے مصیبت کے مارے جنگلی جانور انسان کا رخ کرتے ہیں، جانوروں کے حالات کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جانور انسان سے طبعی طور پر خائف نہیں بلکہ یہ محض حضرت انسان کے دست درازیوں کا نتیجہ ہے اور اس گمان کی اس سے تائید ہو جاتی ہے کہ جب جانور انسان سے دور بستے ہیں اور پھر ملتے ہیں تو خوف نہیں کھاتے اور اس تنفر کا سبب حضرت انسان کی مزاحمت ہے کیونکہ وہ ہر طرح سے ان جانوروں کو اپنے قبضہ میں کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں کہیں جال بچھاتے ہیں اور کہیں بندوقوں کا نشانہ بنا ڈالتے ہیں۔

ایک بڑی جنگ کا واقعہ جسے انگریزی لشکر نے بیان کیا یہ ہے کہ انہوں نے دو جنگجو فوجوں کے درمیان ایک شریف گھوڑے کو دیکھا کہ وہ زخمی تھا چل پھر نہ سکتا تھا، لوگ اس کی طرف بڑھے، رات کا وقت تھا اور وہ اپنے شہسوار آقا کے قریب کھڑا تھا جو اس کی پیٹھ سے گر گیا تھا، لشکر کا قصد تھا کہ میدان حرب سے علیحدہ کر دیا جائے۔ سو اسے یہ بھی ناگوار معلوم ہوا اور انہیں اپنے ارادے سے باز آنا پڑا کچھ دیر تک تو یونہی ہانپتے دیا لیکن ان سے رہا نہ گیا، ایک جماعت کے ساتھ آئے اور اس کی آنکھ پر پٹی باندھ کر لے چلے کچھ دور کے بعد اپنے آقا سے گھوڑا علیحدہ کر لیا گیا۔

اور ایک اہم واقعہ جس کا ہمیں انگریزی تاریخ جدید پتہ دیتی ہے یہ ہے کہ ولی عہد برطانیہ عظمیٰ کے پاس ایک کتا تھا جب وہ آخری سفر کو چلے تو ایک بزرگ خاتون کو امانت دے گئے جس نے اسے پال پوس کر امیر کو ہدیہ کیا تھا کتا چند مہینے اس کے پاس رہا، اب ولی عہد برطانیہ اپنے سفر سے واپس ہوگئے

اور فیرنگ خاتون نے کتا بھجوا دیا، کتے نے کھانا پینا چھوڑ دیا، اور متوحشانہ صورت اختیار کر لی، موت کا خوف ہوا، دلی عہد واپس کرنے پر مجبور ہوئے، اب تو اس کا رنگ ہی بدل گیا بھونکنے بھی لگا اور کھانے بھی لگا۔

لندن کے نباسی باغ میں ایک گوریلا (Gorilla) تھا، حکومت متحدہ نے ہزار گنی میں خریدا، اور کشتی میں سوار کیا گیا، اسے ان تمام دس عورتوں سے الگ علیحدہ ہونا پڑا جو اسے کھلاتی پلاتی تھیں، وحشت ٹپکنے لگی، سر جھکا لیا، حرکت سے قسم کھالی، فطرت انسی کر دکھائی، کھانے پینے سے منہ پھیر لیا، گویا اس کی تمام چہل پہل مسرت و انبساط کا خاتمہ ہو چکا تھا، اب کچھ اور ہونے والا تھا، جب ساحل پر پہنچا اس کی حالت بدتر ہو چکی تھی حکومت نے مالکہ کو بذریعہ تار مطلع کیا کہ جلد سے جلد حاضر ہو، لیکن قبل ملاقات ہی اس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

لندن میں ایک شخص سانپ اور کچھوے سے محبت رکھتا تھا، اور پالتا تھا، تب انہیں آزادی سے چھوڑ بھی دیتا ہوگا، اب پڑوسی حرف شکایت زبان پر لانے لگے، جب کبھی پتے یا کپڑے کی کھڑکھڑاہٹ کانوں تک پہونچتی سمجھ جاتے کہ اب خیر نہیں، سانپ آگیا اور بے ڈسے چھوڑنے کا نہیں، اتفاق سے مالک بیمار ہوگیا اور بس چارپائی چھوڑنا اب اس کی قدرت سے باہر تھا، ایک سانپ جو "وزہ" نامی غائب ہوگیا تلاش شروع ہوئی، اس کی چارپائی تک پہونچے معلوم ہوا کہ پہلو کے پاس مرا پڑا ہے۔

تو کیا اس موت کی علت اسی فرط جزع کو قرار دیں جو اسے اپنے آقا کو بے دست دیا، ساکت و ساکن دیکھ کر حاصل ہوا تھا، تب حیوان بھی موت اور اس کے مقصد کو سمجھ لیتے ہیں؟

مصر میں جو شخص کوے کا شکار کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے اسے خوب معلوم ہے کہ شکاری کے قریب اور کوے کیونکر شور و غل مچاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک بڑا حادثہ سمجھتے ہیں، اسی طرح اور تمام جانور بیل وغیرہ وغیرہ جب ذبح کئے جاتے ہیں تو اور بیل اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے ہیں گویا انتظار سا معلوم ہوتا ہے۔ یورپ کی حکومت نے ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح کئے جانے سے منع کیا ہے۔

ایک مشہور سیاح مسٹر نورلیس اپنی سیاحت کا واقعہ یوں بیان کرتا ہے کہ افریقیہ کے جنگل میں ایک مرتبہ وہ بندر کا شکار کر کے خیمہ میں لائے، کچھ دیر تک خیمہ کے گرد شور ہوتا رہا باہر نکلنے سے معلوم ہوا کہ بندروں کی ایک جماعت نے خیمہ کو سر پر اٹھا رکھا ہے، معلوم ہوتا تھا کہ بے نقط کی سنا رہے ہیں اس نے اس کی کچھ پروا بھی نہ کی آخر شور کچھ کم ہوا اور ایک بندر خیمہ میں داخل ہوا اب شور نہ تھا بلکہ عاجزی تھی اور اظہار عجز وہ رحم کا خواہاں تھا اب حضرت نورلیس کچھ پسیجے گئے، مطلب حاصل تھا آزاد کر دیا گیا، اور تمام بندر شور و غوغا کے ساتھ جنگل کی طرف لے گئے، مسٹر نورلیس نے قسم کھالی کہ اب بندر کا شکار ہرگز نہ کریں گے، لیکن بندروں میں دوسری ایک چیز تکبر و غیرت بھی ہے ڈاکٹر لوال انگلستان کے باغ میں جب سیر کو جایا کرتے تو بابون سے ضرور کچھ مذاق کر لیتے، اب تو بابون مانوس ہو چکا تھا کسی دن اتفاق سے ایک زائر باغ میں آیا ڈاکٹر لوال اس کے ہمراہ تھے بابون کے پاس سے گذرے ایک قصور ہوا کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکے، دوسرے دن جب اس کے پاس سے گذرے کٹہرے کے ایک گوشہ میں غمگین و غضبناک کچھ اداس سا پایا جو نہ کسی سوال کا جواب دیتا اور نہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس ہوتا، اب اس کے دل میں کھوٹ پیدا ہو چکا تھا، کینہ بڑھتا گیا اس کی حالت روز افزوں بد سے بدتر ہوتی گئی، کھانا چھوڑا، کود پھاند چھوڑی، اب موت کی گھڑی آپہونچی، سانس اور رہا تھی ڈاکٹر لوال کٹہرے قدیم دوست کی آخری گھڑی کا نظارہ کر رہے تھے یکایک ایسا معلوم ہوا کہ اس نے تکبر و غضب کی چادر اتار کر پھینک دی، اور دوست سے مصالحت کی غرض سے اپنا ہاتھ بڑھایا، دو دوست مل رہے ہیں، نہیں، نہیں جدا ہو رہے ہیں ان کی اندرونی حالت مت پوچھو آخر جدا ہونا تھا جدا ہوئے، موت کی دیوار نے ایک دوسرے پر اخفا کا پردہ ڈال دیا۔

یہ شفقتیں ہیں حیوان لایعقل کی، شفقت، پھر کھوٹ کینہ اور مخاصمت پھر مصالحت تو کیا انسانی شفقتیں اس لائق نہیں کہ حیوان کے ساتھ برتی جاسکیں۔

جذبات فخر

(از فخر الدین فخر ایچ لوی۔ بارہ بنکی۔ صدر مدرس دالکیشور میونسپل اردو اسکول بمبئی)

خموشی سے ہماری فائدہ اپنا عدو کر لے
جو چاہے وہ بدو کہہ لے جو چاہے روبرو کر لے

رہے گا تا بکے مرہون منت چشم ساقی کا
رگوں میں اپنی پیدا کچھ حمیت کا لہو کر لے

نوائے دردسے عہد خزاں میں بلبل رنگیں
چمن کی لاج رکھ لے باغباں کو سرخرو کر لے

زمیں شق ہو فلک کانپے یہ سب نقشہ بدل جائے
اگر تو اے دل شوریدہ ترک آرزو کر لے

کرے گا چارہ گر اس قوم کی کیا فاتحہ خوانی
کہ جو طوق غلامی خود بخود زیب گلو کر لے

مرے چاک گریباں پر تجھے آئے ہنسی اچھا
مگر اپنے پھٹے دامن کو تو پہلے رفو کر لے

حیات جاوداں ہے قطرۂ اشک ندامت میں
عبث ہے فخر گر تو آب حیواں سے وضو کر لے

پردے پر ایک نظر

(از مولانا یوسف انصاری صاحب اعظم گڈھی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

مذکورہ بالا مضمون سے مجھے صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ دنیا کے آسمانی، غیر آسمانی، تمام مذاہب اور ادیان میں مختلف صورتوں اور مختلف عنوانوں سے، اشارۃً یا صراحۃً، پردہ کا حکم موجود ہے۔ حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت کے تاریک دور میں بھی جبکہ بڑے بڑے شرمناک رسوم، اچھے سمجھے جاتے تھے معائب کا شمار محاسن میں ہوتا تھا اور جو دنیا کے سامنے "وحشی" کے لقب سے ملقب تھے۔ پردہ کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے لیکن جس طرح باوجود اس بدذات، وجہالت، کے ان کی شجاعت جسارت، فصاحت وبلاغت شعر گوئی، اور زبان دانی وغیرہ وغیرہ ضرب المثل اور زبان زد خاص وعام ہیں، تاریخوں میں ان کے بہادری کے کارنامے جلی حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں اور آج سیکڑوں صدیاں گذر جانے کے بعد بھی ہم سے خراج تحسین وصول ہی کر لیتے ہیں اور ہم بغیر داد دئے ان کو نہیں رہتے۔ اسی طرح ان تمام معائب، اور نقائص کے ساتھ ساتھ جو ان میں موجود تھے اس عہد کے شرفاء کے پاکیزہ خیالات، بہتر جذبات، قابل قدر اور لائق ستائش ہیں میں نے مثالاً شعراء عرب کے صرف چند اشعار جن سے تائید مدعی مقصود ہے نہ اثبات مطلوب) بخوف طوالت پیش کئے تھے ورنہ "دوادین عرب" اس قسم کے اشعار سے مملو ومشحون ہیں۔

یہ کوئی تعجب خیز، اور حیرت انگیز امر نہیں ہے۔ ممکن ہے آپ کو فلسفہ کے اس مسئلہ سے کہ "لاتشکیک فی الماھیات" (ماہیتوں میں تشکیک اور تفاوت نہیں ہوتا) شبہات پیدا ہوں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ ماہیات، اور طبائع مختلف ہوتے ہیں۔ اور اپنی جگہ پر نہایت وضاحت اور بسط کے ساتھ ثابت کر دیا گیا ہے۔ چونکہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے اس سے ہم یہاں بحث نہیں کرنا چاہتے۔

ہمارے گذشتہ برہان سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ عہد جاہلیت میں بھی پردہ کا رواج یا عمل درآمد تھا۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے خیالات اور جذبات اور چیز ہیں، اور عمل اور چیز۔ فتامل لئلا تمساک ظنون۔ آپ غور کریں ایسا نہ ہو کہ آپ کو ظنون (ادراوہام) چھولیں۔

میں آپ کو آغاز مضمون میں بتا چکا ہوں کہ "پردہ" کا تعلق مذہب، اور شریعت سے ہے۔ اور بصورت اختلاف، صداقت، ورجالت، حقانیت، وضلالت میں فرق کرنے والی، اور ہمارے ہر مختلف فیہ مسائل کی حکم اور فیصلہ کن چیز، کلام الٰہی، اور احادیث نبوی ہیں۔ اس لئے ہم کو اسی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ گو واقعات، مشاہدات اور تجربات زندگی سے بھی استدلال کیا جا سکے۔ اور موقع سے ہم زمانہ حاضرہ کی ایک مصری خاتون کی رائے کا بھی اظہار کریں گے۔ تاکہ مسئلہ کی حقیقت بے نقاب ہو جائے۔ اور ایک سیاہ پردہ جو "پردہ" پر پڑا ہوا ہے دور ہو جائے۔ مصر کی ایک جدید کتاب بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کا ترجمہ بھی ہم آپ کے سامنے پیش کریں گے اور کوشش کریں گے کہ اس مسئلہ پر ایک دلچسپ اور کارآمد مختصر کتاب تیار ہو جائے۔

پردہ پر اگر منطقی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جس طرح انسان ایک نوع ہے، اور مرد و زن، زید، عمرو، بکر۔ اس کے مختلف افراد ہیں اسی طرح "پردہ" ایک نوع ہے اور اس کے مختلف اقسام اور مختلف افراد اور مختلف مدارج ہیں میرے اس بیان سے آپ کہیں منطق کے اس مسئلہ سے کہ "نوع واحد کے افراد پر مختلف احکام نہیں لگائے جا سکتے" استنباط کرنے لگیں کہ مرد و عورت جب انسان (نوع) کے دو افراد ہیں تو ان پر بھی احکام شادی اور یکساں لگنے چاہئیں۔ اس لئے کہ محققین مناطقہ نے اس رائے کی نہایت زبردست دلائل اور مضبوط براہین سے تردید کر دی ہے۔ اور بتایا ہے کہ "نوع واحد کے افراد پر مختلف احکام نہیں لگائے جاتے"۔

اس مسئلہ کا مفہوم یہ ہے کہ نوعیت کی حیثیت سے جو حکم ایک فرد پر ہوگا وہی دوسرے پر لیکن بقیہ احکام کہیں مختلف اور کہیں متفق ہوں گے۔ مثلاً سمجھئے کہ مرد و عورت، زید، عمر، و بکر سب نوع واحد (انسان) کے افراد ہیں اور ان سب پر بحیثیت نوع واحد کے افراد ہونے کے انسان (حیوان ناطق) کا اطلاق ہوگا حیوان صاہل، یا حیوان منقرس یا اس کے علاوہ دوسرے دو متضاد احکام نہیں لگ سکتے اور اگر اس نظریہ کو صحیح مان لیا جائے اور تسلیم کر لیا جائے کہ نوع واحد کے افراد پر تمام احکام یکساں ہوتے ہیں تو لازم آئیگا کہ مردوں پر عورت ہونے، یا عورتوں پر مرد ہونے کا حکم لگایا جائے۔ کیونکہ نوع واحد کے افراد پر یکساں، غیر متضاد احکام لگائے جاتے ہیں۔ کیا کوئی اسے ماننے کے لئے طیار ہوگا؟ اگر اس کا جواب نہیں ہے تو پھر استدلال بھی نہیں ہو سکتا۔

میرے ناقص خیال میں پردہ کی پہلی قسم یا پردہ کا اصلی مقصد جو سب سے اہم ہے اور جسے پہلا درجہ حاصل ہے عفاف ہے جسے (chastity) کہتے ہیں دوسری قسم حجاب منزلی ہے جسے بزبان عربی خدر یعنی To Keep (a girl) in door. کہتے ہیں تیسری قسم حجاب جسمانی ہے جسے تنقب (a man) To veil her Face کہتے ہیں۔ قرآن حکیم، اور احادیث نبی کریمؐ میں ان تمام افراد اور اقسام کے تمام احکام الگ الگ اور بالتفصیل مندرج ہیں اور ہم اسی ترتیب سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے اور اگر توفیق ایزدی شامل حال ہوئی تو ہم آیات قرآنی، اور احادیث نبوی کے ساتھ ساتھ مفسرین اور محدثین کے اقوال بھی نقل کریں گے تاکہ بحث دلچسپ اور مکمل ہو جائے۔

(باقی آئندہ)

سید منیر الحسن

۱

۷۸۶

رجسٹر نمبر ---------- بی - ۲۱۵۰

انجمن معین الادب کا علمی و ادبی

جلد ۱ رسالہ نمبر

بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء

ادبستان

مرتب

رشید صدیقی

معاون

منیر الہ آبادی

معاون

خلیل احمد سکروی

قیمت فی پرچہ [illegible]

بزمِ ادب

پچھلے دنوں گورنر بمبئی نے پونہ کی زنانہ یونیورسٹی کی نئی عمارت کا افتتاح کیا۔ اور اپنی تقریر میں یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو گورنمنٹ سے امداد حاصل کرنے کے ذرائع بتائے۔ تاکہ یہ کام اعلیٰ پیمانہ پر زیادہ بہتر صورت میں انجام دیا جائے۔ یہ یونیورسٹی جو اسوقت ہندوستان کی ممتاز اور معروف ترین یونیورسٹیوں میں سے ہے۔ دس سال قبل محض ایک معمولی مدرسہ تھی جسکی بنیاد پروفیسر کاروے نے رکھی تھی۔ اور انہی کا علمی شوق و انہماک اس کی ترقی اور فلاح کا کفیل رہا ہے۔ ہمارے خیال میں مسلمانوں میں تعلیم نسواں اب اختلافی مسئلہ نہیں سمجھا جاتا غالباً ہر فرد کو اس امر سے اتفاق کلی ہے کہ عورتوں کو تعلیم دی جائے اور ضرور دی جائے۔ البتہ نصاب اور طریقۂ تعلیم جیسی چند ضروری شقیں غور و فیصلہ کی محتاج ہیں۔ لیکن یہ کوئی زیادہ مشکل امر نہیں ہے۔ اسلئے کہ موجودہ تمدن اور زمانہ کی ہوا نے اچھی طرح یہ سبق ہمارے ذہن نشیں کر دیا ہے کہ ترقی کی بادیہ گردی میں جب تک ہم عورتوں کو شریک و سہیم ہونے کے قابل نہ بنائیں گے کامیابی یقینی نہیں۔ اب سوال یہ نہیں کہ وہ خود مردِ میدان بنکر عرصۂ عمل میں آئیں۔ بلکہ ضرورت یہ ہے کہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ ہر پیش نظر معاملے کی نزاکت و اہمیت کا صحیح اندازہ لگا سکیں تاکہ میدانِ عمل میں سرگرم کار ہونے کے لئے وہ ہماری سہارا ہوں۔ اور ہمیں اس مقصد کے لئے بالکل موقعہ اور آزادی دیں۔ ظاہر ہے کہ اس غرض کے لئے انکی تعلیم کوئی دشوار چیز نہیں ہے۔ اور نہ اس کے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ عام علوم و فنون کی تعلیم جو اسوقت مدارس میں رائج ہے ان کے لئے شمع ہدایت بن سکتی ہے۔ البتہ بشرط ضرورت اس میں کسی قدر ترمیم و تنسیخ کر لی جائے۔ بہرحال یہ امر تو قطعی ہے کہ مسلمان خواتین کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام جلد از جلد شروع کر دینا چاہیئے۔

بمبئی جیسے کاروباری شہر میں اس کام کی ابتدا زیادہ دشوار نہیں اگرچہ میونسپل

مدارس میں مسلمان بچیوں کی تعلیم کا خاصا انتظام ہے لیکن یہ تعلیم محض ابتدائی ہے۔ اور کسی طرح قومی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتی۔ اگر دوسری اقوام سے اس باب میں اشتراک عمل ممکن ہے تو غنیمت ورنہ مسلمانوں کو ملد علیحدہ اور بہتر انتظام کرنے کی سعی بلیغ کرنی چاہئے۔

ملک میں اسوقت بکثرت مغربی دارالعلوم موجود ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل وطن کو نادان بھیڑوں کے گلہ کی طرح اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔ جس طرف ایک کا منہ اٹھ گیا سب اسیطرف کو ہو لئے۔ اس بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان یونیورسیٹیوں کی سندوں کی نہ کوئی قدر ہے نہ وقعت۔ ان نوجوانوں کو جو ان سندوں کے حصول میں عمر عزیز کا ایک حصہ نذر کر دیتے ہیں کاروباری دنیا میں فکر معاش کے لئے ہنوز روز اول ہی کا نقشہ نظر آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ مسلمانوں کی حیثیت اس نقطۂ نگاہ سے ابھی بہت پست ہے اور ان کے لئے کافی موقع ہے کہ وہ یونیورسیٹیوں میں داخل ہوں۔ لیکن کیا ہی بہتر ہو کہ ہم ابھی سے مآل پر نظر رکھیں اور قبل اس کے کہ .... سب کے سب ایک ہی تعلیم حاصل کرکے بیکار اور عضو معطل ہو جائیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہم مختلف شعبہائے حیات سے متعلق مختلف علوم و فنون کی طرف راغب ہوں۔ صنعت و حرفت زراعت و تجارت وغیرہ کا میدان تنگ نہیں۔ تمدن کے ساتھ ساتھ یہ تمام چیزیں ترقی پذیر ہیں۔ لیکن لائق و تجربہ کار آدمیوں کا ہر طرف کال ہے۔ موجودہ یونیورسٹیوں میں یہ تمام چیزیں بھی داخل کی جائیں اور ان کے لئے علیحدہ علیحدہ بھی یونیورسٹیاں قایم کی جائیں۔ ورنہ بغیر اس کے قومی تعلیم ناکارہ رہے گی۔

پنڈت وی۔ اس۔ آر۔ شاستری نے اسی موضوع پر ایک دلچسپ مضمون Educational Review میں لکھا ہے جس میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جب ہم یونیورسیٹیوں کی تعداد میں اضافہ کی آواز سنتے ہیں تو چشم دماغ کے سامنے اس کا ایک غیر مطمئن سا نقشہ پھر جاتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

یہ غیر مطمئن حالت کیوں ہے کس وجہ سے ہے اور کیوں کر ہے۔ کارلائل کے الفاظ میں ان یونیورسٹیوں کی تعریف "پالش کئے ہوئے بھڑکیلے پتھر اور معمولی ہیرے" ہے جس میں سے ہر سال بہت سے بھڑکیلے اور چکنے چپڑے پتھر نکلتے ہیں جو صرف ایک ہی کام کے ہوتے ہیں یعنی سرکاری ملازمتوں میں داخل ہو کر اپنی قوت تحریر صرف کریں۔ اگر رابنسن کروسو کی طرح وہ کسی ویران جزیرہ میں چھوڑ دئے جائیں تو بھوکوں مر جائیں۔ یہ گریجویٹ جب یونیورسٹی سے باہر نکلتے ہیں تو آزاد مغربی اصولوں پر اپنی تعلیمی زندگی اور کاروباری دنیا کی محنت طلب زندگی میں زمین وآسمان کا فرق پاتے ہیں۔ یونیورسٹی کی ڈگریاں اور ڈپلومے اتنے عام ہوگئے ہیں کہ اب ان کی کوئی عزت و وقعت باقی نہیں رہی۔ پھر کون ہے جو عرصہ دراز تک صبر وشکر کے ساتھ محنت کرنے پر اس قلیل نفع کا متمنی ہوگا۔"

اور واقعہ بھی یہی ہے۔ یونیورسٹیوں میں یا تو ان ضروری اجزا کا اضافہ کر دیا جائے جو قوم کی تعمیر کے لئے ضروری ہیں۔ یا ان کے علاوہ مدرسے قائم کئے جائیں۔ لارڈ سنہانے بھی حال ہی میں Bihar & Orissa Co-operative federation Gazette (بہار اینڈ اڑیسہ کواپریٹیو فیڈریشن گزٹ) کے نمائندہ سے کسیقدر اختلاف کے ساتھ اپنی خیالات کا اظہار کیا ہے جس کا اعادہ غالباً سود مند ہوگا۔ نامہ نگار مذکور لکھتا ہے کہ :-

" یونیورسٹی کی تعلیم کے سوال پر انہوں (لارڈ سنہا) نے کہا کہ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یونیورسٹی کی تعلیم کی ہم نے جس طرح مخالفت کی ہے وہ بالکل درست ہے۔ لیکن اس باب میں ہمارا طرز عمل نادرست اور غیر موثر رہا۔ کیونکہ اس مخالفت کی تائید میں جو قومی مدارس کھولے گئے وہ انہی یونیورسٹیوں کے نمونے تھے اور اسی لئے ناکام رہے۔ لارڈ موصوف نے کہا کہ ہزاروں نوجوانوں کی ضرورت ہے جو یونیورسٹی کی ڈگریوں والے نوجوان نہیں بلکہ وہ جو زراعت، اصول صحت وصفائی میں دیہاتوں

کے "گرو" کا درجہ رکھتے ہوں۔ انہیں تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور زبان کی عام معلومات ہوں تاکہ وہ دیہاتوں میں گھر گھر ابتدائی تعلیم دیں۔ اپنے اس قول کی تصدیق دثبوت میں۔ صاحب موصوف نے بیان کیا کہ میں نے اپنے گاؤں کے پاٹھ شالہ میں جتنی ریاضی لکھی تھی وہ میری زندگی کے لئے کافی ثابت ہوئی۔ بڑی سے بڑی پبلک خدمت کی انجام دہی میں بھی۔ مجھے کبھی اس سے زیادہ ریاضی کی ضرورت نہیں پیش آئی اور ہائی کورٹ میں طول طویل حسابوں کی جانچ پڑتال میں بھی مجھے کبھی اس سے زیادہ کچھ نہ کرنا پڑا۔ لارڈ موصوف نے یہ بھی لکھا کہ اس تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا اضافہ کردیا جائے پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں باقی رہتی۔ اور تعلیم کے عام کرنے کا جو مقصد ہے وہ بلاجبری تعلیم کے حاصل ہوجاتا ہے۔ موصوف نے اس طریقۂ تعلیم کے متعلق اپنے کامل یقین اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں اس خیال کی تبلیغ میں سرگرم ہوں۔ چنانچہ اپنے عزا میں سے تمام ان نوجوانوں کی جو یونیورسٹی میں داخل ہونا چاہتے تھے میں نے یہی یہ صلاح دی ہے اور اس خیال سے روکنے کی کوشش کی ہے۔"

لارڈ سنہا نے جن قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے وہ حقایق ہیں جنکا کم وبیش تجربہ ہر شخص کو ہوتا رہتا ہے۔ پھر کیا یہ مسئلہ ہماری غور اور توجہ کا محتاج نہیں؟ (مرتب)

ہندوستان میں تیل کی تجارت

(از خلیل احمد سیکرودی)

ہندوستان تجارتی حیثیت سے دنیا کے دوسرے ملکوں کی بہ نسبت زیادہ اقسام کے oil seeds (تیل پیدا کرنے والے بیج) پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ جہانتک تیل پیدا کرنے کے ذرائع کا سوال ہے اس کی حیثیت دنیا میں نہایت اہم ہے oil seeds (تیل پیدا کرنے والے بیج) ملک کے لئے بہت بڑا ذریعۂ آمدنی ہیں کیونکہ ان کی مقدار تقریباً پانچ ملین اور قیمت تقریباً پچاس ملین سالانہ ہوتی ہے۔ فی الحال ہندوستان میں تل تیل اور گھی کی مجموعی برآمد کی قیمت قریب قریب اٹھارہ ملین زر نقد ہے اور بہت ممکن ہے کہ ان اعداد و شمار میں ابھی اور اضافہ ہو۔ لیکن اس بدنصیبی کا ماتم کس سرزمین میں جا کر کیا جائے کہ تیل پیدا کرنے والے بیجوں کی اس بڑی تجارت اور عظیم نفع سے ہندوستان کو بہت ہی تھوڑا حصہ ملتا ہے۔

تجارتی (oil seeds) کا زیادہ حصہ تیل یا روغن کے حاصل کرنے میں صرف کیا جاتا ہے جو کھانے اور دوسرے روزمرہ کے کاموں میں استعمال ہوتا ہے۔ دنیا کی آبادی کے اضافہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تیل اور روغن کی مانگ روز بروز بڑھ رہی ہے۔

کھانے کی ضرورتوں میں تیل مختلف طور پر استعمال کیا جاتا ہے مثلاً معمولی طور پر۔ طرح طرح سے صاف کرکے پکا کر۔ مصنوعی مسکہ بنا کر۔ مصنوعی گھی بنا کر وغیرہ غذا کے علاوہ روغن اور بہت سے تیل صنعتی کاموں میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں جن میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ روغن اور تیل کا ایک اہم استعمال صابون اور موم بتی کی تجارت ہے جس سے گلیسرین بھی حاصل کی جاتی ہے۔ تیل اور روغن کی ایک بڑی مقدار چکنائی بنانے میں صرف ہوتی ہے۔ اس سلسلہ

میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رینڈی کے تیل سے سائنس کے اصولوں پر جو چکنائی بنائی جاتی ہے اس سے تمام اعلیٰ قسم کی چکناہٹ والی اشیاء طیار کی جاتی ہیں جو طیاروں اور موٹروں وغیرہ میں استعمال ہوتی ہیں - رنگ - وارنش - روشنائی - مصنوعی ربر - اور مصنوعی چمڑے وغیرہ کی تجارت میں بھی تیل اور خصوصاً خشک ہونے والے تیل مثلاً روغن چوب چینی و روغن خشخاش وغیرہ بہت بڑی مقدار میں صرف ہوتے ہیں -

تیل کی تجارت میں سب سے آخری چیز کھلی ہے - خواہ تیل کولھو میں پیل کر نکالا جائے یا اور ترکیب سے کھلی کا بچ رہنا ضروری ہے - لیکن یہ کوئی غیر ضروری چیز نہیں - مویشیوں کی بہترین غذا اور کھیتوں کے لئے اعلیٰ درجہ کی کھاد ہے - اس کی ضرورت اور مانگ اس وقت دنیا کے ہر حصہ میں ہے ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں کھلی جیسی عمدہ اور سستی کھاد کی اہمیت کسی بیان کی محتاج نہیں

ہندوستان میں صدہا قسم کے تیل پیدا کرنے والے بیج پیدا ہوتے ہیں جن میں سے خاص حسب ذیل ہیں :-

کھوپرہ - مہوہ - بنولے - سرسوں - السی - رینڈی - تل اور خشخاش وغیرہ

تیل کی تجارت کے متعلق ہندوستان میں جو ایک اور قابل افسوس غلطی کی جاتی ہے وہ تیل پیدا کرنے والے بیجوں کا ناجائز استعمال ہے - مثال کے طور پر ایک معمولی واقعہ لے لیجئے کہ ملک کے بعض حصوں میں جانوروں کو بیج ہی کھلا دئے جاتے ہیں - حالانکہ تیل نکالنے کے بعد صرف کھلی کھلانے میں دو قسم کے فائدے ہیں - ہندوستان دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ تیل پیدا کرنے والے بیج باہر بھیجتا ہے - وہ خاص ممالک جو یہاں سے (oilseeds) خریدتے ہیں یہ ہیں - برطانیہ - جرمنی آسٹریا - فرانس - اٹلی - بلجیم اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ - ان ممالک میں بیجوں سے تیل نکالا جاتا ہے اور پھر وہ مختلف صورتوں میں تبدیل ہوتا ہے جس کا ایک حصہ پھر ہندوستان ہی میں واپس آ کر بکتا ہے - کھلی وہ اپنے مویشیوں کو کھلاتے ہیں اور زمین کو زیادہ زرخیز بنانے میں صرف کرتے ہیں ہندوستان سے oilseeds کی بہ نسبت تیل بہت کم باہر جاتا ہے

...رح ہندوستان اپنے ملک کی ایک بہت بڑی دولت سے فیضیاب نہیں ہو سکتا۔ تیل
...ئے تیل پیدا کرنے والے بیج ممالک غیر میں بھیجکر ہندوستان نہ صرف تجارتی حیثیت سے
...ہ میں رہتا ہے بلکہ کھلی کے ضائع کر دینے کی وجہ سے فربہ مویشی اور زرخیز زمین سے بھی
...م رہتا ہے جو ایک بڑا زراعتی نقصان ہے مندرجہ ذیل نقشہ سے Oil seeds
...داوار اور تجارت کے لحاظ سے دنیا میں ہندوستان کی اہمیت بخوبی واضح ہو جائیگی۔

نقشہ نمبر ۱

...یج کا نام	تمام دنیا کی برآمد ۱۳-۱۹۱۲ء میں (تخمینہ) ٹن	ہندوستان کی برآمد ۱۴-۱۹۱۳ء ٹن	ہندوستان[؟] دنیا کی برآمد کا اوسط (فی صدی)
...پرہ ۔	۵۳۷۰۰۰	۳۸۰۰۰	۷
...ہ ۔	ناپید	۳۲۰۰۰	۱۰۰
...لا ۔	۹۰۰۰۰۰	۲۸۴۰۰۰	۳۱
...) ۔	۲۶۴۰۰۰	۱۱۲۰۰۰	۴۲
...یڈی ۔	۱۳۷۰۰۰	۱۳۵۰۰۰	۹۸
...رسوں ۔	۲۸۵۰۰۰	۲۴۹۰۰۰	۶۵
...ی ۔	۲۱۵۰۰۰۰	۴۱۴۰۰۰	۲۰
...اش ۔	۲۵۰۰۰	۱۹۰۰۰	۷۶

نقشہ نمبر ۲

...ہندوستان میں Oil seeds اور ان کے دوسرے لوازمات کی پیداوار
...برآمد ۱۹۱۳ء :-

اشیاء	پیداوار کا تخمینہ	برآمد
السی (ٹن)	۳۸۶۰۰۰	۴۱۴۰۰۰
السی کا تیل (گیلن)	نامعلوم	۱۰۲۴۰۰
سرسوں اور رائی	۱۰۸۷۰۰۰	۲۵۴۰۰۰
سرسوں اور رائی کا تیل (گیلن)	..	۴۰۷۰۰۰
تِل (ٹن)	۴۰۳۰۰۰	۱۱۲۰۰۰
تِل کا تیل (گیلن)	۲۱۱۰۰۰۰	۲۰۸۰۰۰
بنولا (ٹن)	..	۲۸۴۰۰۰
بنولے کی کھلی (ٹن)	..	۱۰۴۰۰
بنولے کا تیل (گیلن)	..	۲۵۰۰
رینڈی (ٹن)	..	۱۳۵۰۰۰
رینڈی کی کھلی (ٹن)	..	۴۹۰۰
رینڈی کا تیل (گیلن)	..	۱۰۰۷۰۰۰
کھوپرا (ٹن)	..	۳۸۰۰۰
کھوپرے کی کھلی (ٹن)	..	۴۲۰۰
کھوپرے کا تیل (گیلن)	..	۱۰۹۱۵۰۰
مہوہ (ٹن)	۳۰۰۰۰	۳۳۰۰۰
خشخاش (ٹن)	..	۱۹۰۰۰
دوسرے بیج (ٹن)	..	۹۰۰
دوسرے بیجوں کی کھلی (ٹن)	..	۴۲۰۰
دوسرے بیجوں کا تیل (گیلن)	..	۱۳۵۰۰۰

اس میں سال گذشتہ کی پیداوار کا بھی کچھ حصہ شامل ہے - ہندوستان کے تیل پیدا کرنے والے بیجوں کی پیداوار اور برآمد کا نقشہ (وزن بمقدار ٹن - اور قیمت بحساب پونڈ)

سنہ ۱۵-۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۷-۱۹۱۶ء تک

بیج کا نام		سنہ ۱۵-۱۹۱۴ء	سنہ ۱۶-۱۹۱۵ء	سنہ ۱۷-۱۹۱۶ء
السی	پیداوار	۳۹۷۰۰۰	۴۷۶۰۰۰	۵۲۰۰۰۰
	برآمد	۳۲۱۵۷۶	۱۹۲۹۸۷	۳۹۴۱۰۳
	قیمت	۳۵۰۲۴۱۱	۱۹۸۲۷۸۲	۴۷۵۹۹۰۶
رائی اور سرسوں	پیداوار	۱۲۱۹۲۰۰	۱۱۰۲۱۰۰	۱۱۸۱۲۰۰
	برآمد	۹۹۴۶۳	۹۱۳۹۱	۱۲۷۸۲۲
	قیمت	۱۱۲۴۱۱۹	۹۹۴۳۵۴	۱۹۹۷۰۸۵
تل	پیداوار	۵۵۱۰۰۰	۴۸۲۰۰۰	۴۹۳۰۰۰
	برآمد	۴۶۷۰۵	۱۳۷۷۶	۸۳۶۶۵
	قیمت	۷۱۱۸۸۵	۱۶۴۱۷۰	۱۰۸۳۷۲۳
بنولا	پیداوار	۲۱۷۰۴۰۰	۱۵۵۷۳۰۰	۱۷۰۸۴۰۰
	برآمد	۲۰۷۷۸۸	۹۵۶۶۳	۳۹۶۳۰
	قیمت	۱۰۰۴۵۲۴	۴۴۵۰۷۷	۲۰۳۹۴۰
رینڈی	پیداوار	..	..	..
	برآمد	۸۲۸۱۴	۸۷۹۴۸	۹۲۴۴۷
	قیمت	۷۷۳۲۸۹	۸۰۲۱۸۵	۹۵۷۲۰۱
مہوہ	پیداوار	..	..	..

بیج کا نام		سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء	سنہ ۱۹۱۵-۱۶ء	سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء
	برآمد	۷۴۳۷	۴۲۱۵	۴۲۳۹
	قیمت	۵۰۶۷۴	۲۴۳۲۷	۲۶۴۸۰
کھوپرا	پیداوار	۰۰	۰۰	۰۰
	برآمد	۳۱۸۴۵	۱۵۶۷۷	۲۶۵۵۶
	قیمت	۸۲۱۹۲۳	۳۸۱۸۵۹	۶۶۵۰۵۸
خشخاش	پیداوار	۰۰	۰۰	۰۰
	برآمد	۶۹۹۲	۶۸۷۱	۵۵۲۴
	قیمت	۹۵۶۱۰	۸۲۰۱۲	۶۳۰۸۵
چائے کا بیج	پیداوار	۰۰	۰۰	۰۰
	برآمد	۲۱۹	۱۳۷	۱۳۷
	قیمت	۳۶۴۴۲	۲۸۶۶۰	۲۸۳۷۶
دوسرے قسم کے بیج	پیداوار	۰۰	۰۰	۰۰
	برآمد	۱۲۳۱	۲۸۰	۱۹۳۱
	قیمت	۱۱۲۵۸	۲۸۱۰	۱۷۶۸۶
جملہ	پیداوار	۰۰	۰۰	۰۰
	برآمد	۹۴۶۷۲۷	۶۹۱۹۸۳	۹۲۰۱۴۳
	قیمت	۹۶۶۹۸۹۷	۶۵۸۶۰۱۷	۱۰۷۷۲۶۱۶

رینڈی - مہوہ - پوستہ - کھوپرا اور چائے کے بیجوں کے اعداد و شمار نہیں معلوم ہیں
جہانتک نوعیت (Quality) کا تعلق ہے ہندوستان کے تیل پیدا کرنے والے بیج

عموماً دوسرے ممالک کے بیجوں سے گھٹیا نہیں ہیں۔ بلکہ مقدار اور اقسام کے لحاظ سے ہندوستان کو دوسرے ممالک پر ایک خصوصی ترجیح ہے۔ اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ہندوستان کو اس نقصان عظیم سے بچانے کے لئے اگر کوئی کارآمد تدبیر ہے تو یہی کہ لوگوں کو بیج پیلنے اور تیل حاصل کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔ اس صورت میں ہندوستان کا تمام نفع ہندوستان ہی میں رہیگا۔ اور کھلی سے مویشیوں اور زمینوں کو زیادہ بہتر بنایا جاسکے گا۔ کم مزدوری اور زیادہ کھپت کی وجہ سے مال ہندوستانی تاجروں کو کبھی گراں نہ پڑیگا اور اس لئے انہیں ممالک غیر کے تجار سے مقابلہ کا خوف بھی نہ ہونا چاہئے ہندوستان ہی میں بیجوں سے تیل نکال لینے میں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اعلےٰ قسم کے تمام تیل جو دوسرے ملکوں سے یہاں آتے ہیں یہیں بننے لگیں گے اور اس طرح جہاز وغیرہ کا جو صرفہ بیج بھیجنے اور پھر تیل منگانے پر ہوتا ہے بچ رہیگا۔

ہندوستان میں تیل نکالنے کے اس وقت جو طریقے رائج ہیں وہ بہت قدیم اور نقصان دہ ہیں۔ بالکل حال میں ملک کے بعض حصوں میں جدید مشین استعمال ہونے لگی ہیں۔ کولھو یا گھنی اب بھی ملک کے ہر حصہ میں موجود ہے۔ کولھو میں تیل نکالنے سے کھلی میں دس فیصدی سے لیکر تیس فیصدی تک تیل باقی رہ جاتا ہے۔ سائنٹفک تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ رائی کی کھلی میں دس فیصدی سے سولہ فیصدی تک تیل رہ جاتا ہے۔ مہوہ کی کھلی میں پندرہ فیصدی سے بیس فیصدی تک اور رینڈی کی کھلی میں بیس فیصدی سے تیس فیصدی تک ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑا نقصان ہے جیسا کہ اوپر بتلایا جاچکا ہے وہ کھلی جس میں تیل رہ جاتا ہے نہ مویشیوں کے کھلانے کے لئے زیادہ موزوں ہے اور نہ کھاد کے لئے۔

یورپ اور امریکہ میں اس وقت مختلف اقسام کی مشینیں اس کام میں مستعمل ہیں۔ یہی ہندوستان کے لئے بھی کارآمد ہوسکتی ہیں۔ یا اگر ضرورت ہو تو ان میں موقعہ و مقام کے لحاظ سے تھوڑا بہت تغیر و تبدل کرلیا جائے۔ ان مشینوں سے نقصان بالکل برائے نام رہ جائیگا

گورنمنٹ اور خصوصاً محکمۂ صنعت وحرفت کو ہندوستان میں یہ جدید ترین شینیں رائج کرنی چاہئیں۔ تاکہ کولھو کے استعمال سے جو نقصان عظیم اس وقت ہو رہا ہے وہ ختم ہو جائے۔ کولھو اور ان جدید شینوں کی قیمت اور اخراجات کا بغور مطالعہ کرنے سے فوراً معلوم ہو جائیگا کہ شینیں صرف نفع اور آرام کے لحاظ سے ہی بہتر نہیں ہیں بلکہ ان کی قیمت اور اخراجات بھی قریب قریب ہی ہیں جو کولھو کے۔

ان تمام امور کو دیکھتے ہوئے جن کا ذکر بالتفصیل اوپر ہو چکا ہے یہ بات قطعی ظاہر ہے کہ ہندوستان میں تیل کی تجارت کا مستقبل یقیناً شاندار ہے البتہ حکومت اور محکمۂ صنعت وحرفت کو اس جانب پوری توجہ کرنی چاہئے۔

(ماخوذ)

قیامت تھی یہ پیمانہ اگر لبریز ہو جاتا

(از حضرت جگر مرادآبادی)

جنونِ عشق میں احساس اتنا تیز ہو جاتا
جو چھو جاتی ہوا، دل درد سے لبریز ہو جاتا

یہ ساری لذتیں ہیں میرے شوق ناکمل تک
قیامت تھی یہ پیمانہ اگر لبریز ہو جاتا

نہ رکھا دل کو احساسِ گنہ نے مستقل ورنہ
یہی ظلمت کدہ اک دن تجلّی خیز ہو جاتا

(جناب فطرت کا شکریہ)

فقیر عزیز الدّین

(از مولانا عبدالستار فاروقی)

یہ باور کیا جاتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کے شوق تحصیل علم وفضل میں بھی کمی آگئی تھی۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلامی حکومت کے زوال کے بعد اسلامی تاریخ کسی ایسی ہستی کے پیش کرنے سے عاجز ہے جسے فضلاء زمانہ میں شمار کیا جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے سلطنت مغلیہ کے زوال کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت ہے اس کا اقرار کرے گا کہ اس تباہی اور بربادی کے زمانہ میں بھی مسلمانوں میں ایسی باکمال ہستیاں موجود تھیں جن کے کارنامے علمی دنیا میں کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ ان باکمال ہستیوں میں بعض "مغلیہ تمدن کے مزار" یعنی دہلی میں موجود تھیں۔ اور بعض راجاؤں اور نوابوں کے درباروں میں ممتاز عہدوں پر فائز تھیں۔ چنانچہ اس پر آشوب زمانہ میں جبکہ سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا فقیر عزیز الدین پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں اپنی اسلامی خصوصیات (علم وفضل وکمال) کے ساتھ ایک ممتاز عہدہ پر متمکن تھے۔ آپ کا تعلق بخارا کے ایک شریف خاندان سے تھا۔ آپ کے والد غلام محی الدین جو وسط ایشیا سے آکر لاہور میں مقیم ہوئے تھے۔ ایک ماہر طبیب تھے۔ قیام لاہور کے زمانہ میں غلام محی الدین صاحب نے اپنے فرزند عزیز الدین کو وہاں کے ایک مشہور حکیم کی نگرانی میں دیدیا تھا جن کی وساطت سے ۱۷۹۹ء میں میاں عزیز الدین صاحب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری حکماء میں شامل ہو گئے تھے۔

فتح لاہور کے بعد مہاراجہ صاحب مرض آشوب چشم میں مبتلا ہوئے تو نوجوان حکیم کو اپنا کمال طبابت دکھانے کا موقعہ ملا۔ کہتے ہیں کہ حکیم عزیز الدین نے نہایت خوش اسلوبی اور انہماک سے علاج کیا۔ اور چند ہی دنوں میں مہاراجہ صاحب حکیم عزیز الدین کی اس خدمت سے بہت

ہی خوش ہوئے۔ اور اس کے صلہ میں حکیم صاحب کو جاگیر عطا ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد سے حکیم صاحب مہاراجہ کی خاص عنایت کے مرکز ہو گئے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ صاحب کی وسعت ریاست کے ساتھ ساتھ آپ کی جاگیر اور دولت بھی بڑھتی رہی ۔ ۱۸۰۸ء میں فقیر عزیزالدین کو اپنی علمی لیاقت اور تدبر و فراست کے اظہار کا موقع ملا جبکہ سکھوں اور انگریزوں میں کشیدگی واقع ہو گئی تھی۔ آپ نے کمال دانشمندی سے فریقین میں مصالحت کرادی۔ اس طرح مہاراجہ صاحب نہ صرف آپ کی طبابت و حکمت کا بلکہ تدبر و فراست کے بھی مداح ہو گئے تھے۔ مہاراجہ اہم ترین امورات سلطنت میں آپ سے مشورہ لیتا اور ہر معاملہ میں آپ کی رائے کو مقدم رکھتا تھا۔ یہاں یہ بتلانا بیجا نہ ہوگا کہ وہ آپ ہی کی شخصیت تھی جس کی وجہ سے مہاراجہ اور انگریزوں میں رشتۂ دوستی قائم رہا۔ کیونکہ آپ کے انتقال کے بعد ہی صلح و آشتی کا زمانہ تباہی و خونریزی سے بدل گیا تھا۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ اسی وقت سے مہاراجہ کی سلطنت کو گھن لگنا شروع ہوا۔

آپ نے بڑی دیانت داری سے اپنے فرائض منصبی کو ادا کیا۔ مہاراجہ کو بھی آپ پر پورا اعتماد تھا۔ وہ اکثر اوقات سلطنت کو آپ کے سپرد کر کے جنگی مہموں میں شریک ہوتا تھا یا کبھی خود فقیر عزیزالدین کے زیر کمان فوج روانہ ہوتی تھی۔ آپ کئی مرتبہ ایلچی بنا کر بھی بھیجے گئے۔ ۱۸۳۱ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ اور اسی سال امیر دوست محمد خان والیٔ افغانستان کے پاس آپ بطور ایلچی کے بھیجے گئے تھے۔

آپ عادات و خصائل میں یگانۂ روزگار اور فرائض منصبی کی انجام دہی میں بڑے مستعد تھے۔ بے تعصبی اور آزاد خیالی آپ کا خاصہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مسلمان وزیر کی ایک کٹر سکھ راجہ کے دربار میں یہاں تک عزت افزائی ہوئی کہ خود اس کے ہم مذہب بھی انگشت حیرت بدنداں ہو گئے بلکہ اکثر دلوں میں آتش رشک و حسد مشتعل ہو گئی تھی۔

آپ سنی تھے یا شیعہ ؟ اس کا پتہ نہ چل سکا۔ لیکن ذیل کی حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ فقیر منش اور صوفی مزاج تھے۔ ایک مرتبہ راجہ نے دریافت کیا کہ آپ کو ان دو

ہیں کونسا مذہب پسند ہے۔ مسلمانوں کا مذہب پسند ہے یا ہندوؤں کا۔ آپ نے جواباً عرض کیا کہ "میں منجدھار میں بہ رہا ہوں اور خشکی کی طرف نظر کرتا ہوں تو دونوں ساحل برابر فاصلہ پر نظر آتے ہیں" مہاراجہ اس بات کو سن کر بہت خوش ہوا اور پھر کبھی آپ سے مذہبی گفتگو نہ کی۔

فقیر عزیز الدین اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے تقریر و تحریر میں ملکۂ خداداد حاصل تھا۔ سرکاری کاغذات اور یادداشتوں کو دیکھنے سے آپ کی علمیت کا پتہ چلتا ہے۔ سر لیپل گریفن کا قول ہے کہ "فقیر عزیز الدین علوم مشرقیہ کے زبردست ماہر تھے"

آپ ایک عمدہ شاعر تھے زبان صاف و شستہ تھی۔ اشعار با محاورہ اور دلنشین ہوتے تھے۔ آپ کا علم صرف لٹریچر تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آپ ایک بڑے فلاسفر ماہر سیاست اور دبیر مملکت تھے۔ بیرن چارلس ہیوگل صاحب نے جو ۳۶-۱۸۳۵ء میں پنجاب کی سیاحت کر چکے ہیں فقیر عزیز الدین صاحب کی اعلیٰ قابلیت پر متحیرانہ ریمارک لکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایسے زمانہ میں جبکہ درس و تدریس کی طرف کسی کو کوئی خاص توجہ نہ تھی اور خونریز ہنگامہ آرائیوں سے ملک میں ایک قیامت برپا تھی فقیر عزیز الدین ایسی جامع علوم و فنون ہستی کا مہاراجہ کے دربار میں پایا جانا سخت حیرت ناک تھا"

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ آپ سکھوں کی جانب سے سفارت کا کام بھی انجام دیتے تھے ۱۸۴۲ء میں آپ لارڈ آکلینڈ کے پاس فیروزپور میں ایلچی ہو کر گئے۔ اور سکھ قوم کی اعلیٰ ترین نمائندگی کی جو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ اسی موقعہ پر لارڈ مذکور نے بھی آپ کی تعریف کی اور حسن سفارت کے صلہ میں آپ کو "محافظ اتحاد برطانیہ اور سکھ" کا خطاب عطا کیا۔ اور لارڈ آکلینڈ نے اپنی خاص طلائی گھڑی انعاماً عطا فرمائی۔ سر لیپل گریفن اپنی کتاب "رنجیت سنگھ" میں لکھتے ہیں کہ "میں اس گھڑی کو ان کے صاحبزادہ کے پاس مدت تک دیکھتا رہا۔ جو میرے لاہور میں سکریٹری تھے" آپ نے اس دار فانی سے سکھوں کی پہلی لڑائی سے قبل ۱۸۴۵ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کے دو بھائی امام الدین اور نورالدین بھی مہاراجہ کے درباریوں میں تھے۔ اور بڑے شریف متقی و پرہیزگار تھے لیکن زمانہ ان کے ناموں سے بھی واقف نہیں ہے۔

افسانہ

پریم کی بانسری

(از جناب سرخوش زاہدی)

(ذیل کے فسانہ کا ایک خاص طرز بیان ہے خ۔س)

(۱)

سیوک اپنے پانچوں بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ باپ آخر دم تک اس کو سینے سے لگائے رہا۔ اور چلتے چلاتے بڑے بھائیوں کو سونپ گیا۔ سب کے سب سیدھے سادے بھلے مانس تھے۔ سیوک کی بڑی محنت اور محبت سے سیوا کی۔ برادری کے دستور کے موافق ۹ برس کی عمر میں پاس کے ایک گاؤں میں اس کا بیاہ کر دیا۔ اور ہر فکر سے گھومنے اور کھیلنے کے لئے اسے آزاد کر دیا۔

سیوک کو بچپن سے گانے کا بڑا شوق تھا۔ پیلے بانس کی ایک خوبصورت بانسری اس نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی۔ اسے وہ گاؤں کے کنارے کھیتوں میں بجاتا پھرتا۔ کوئی گانے والا سادھو گاؤں میں ستار لیکر آ جاتا تو سیوک اس کی خدمت گذاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ اسے اپنے گھر لیجاتا کھلاتا پلاتا آرام پہونچاتا۔ خدمت کرتا اور بھجن۔ ٹھمری دادرا گوا کر سنتا۔ اس کے بھائی اور بھاوج اس کی حرکت کو محبت کی نظر سے دیکھتے اور ڈر کے مارے کبھی کچھ نہ کہتے۔ جب سادھو جانے لگتا تو سیوک اسے بہت دور تک پہونچانے جاتا۔ ایک دفعہ ایک بہت بڈھا سادھو آیا۔ گاؤں کے لوگوں نے اس کی بڑی عزت کی اور سیوک سے اس کے گانے کی بہت تعریف کی۔ سیوک نے اسے ایک پکھواڑے تک اپنے یہاں مہمان رکھا۔ رات رات بھر چلم چڑھا چڑھا کر پلائی پاؤں دبائے اور بہت خدمت کی۔ لوگ اس کی محنت کو حیرت سے دیکھتے۔ پڑوس کی نوعمر لڑکیاں اس کا مذاق اڑاتیں اور کہتیں سیوک! اس بڈھے فقیر کی سیوا سے تمہیں کیا مل جائیگا؟" لیکن سیوک

مسکرا کر چپ ہو جاتا اور ان کے طعنوں کی کچھ پرواہ نہ کرتا۔

سادھو جانے لگا تو سیوک نے اپنی بانسری اٹھائی اور اسے پہونچانے کے لئے چلا۔ گاؤں کے لوگوں نے شام کے وقت اسے گاؤں کے باہر جاتے دیکھا۔ لیکن پھر لوٹ کر نہ آیا۔ بہتیرا ڈھونڈا گیا لیکن اس کا کچھ کھوج نہ ملا۔ آس پاس کے گاؤں والے جو اسے پہچانتے تھے بس اتنا جانتے تھے کہ وہ سادھو کے ساتھ ادھر آیا تھا۔ لیکن پھر وہ کہاں گیا یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا اس کی سسرال والوں نے اسے جاتے دیکھا تھا۔ پوچھنے پر اس نے ہاتھ کے اشارے سے لوٹ کر آنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پھر اس کی بانسری کی آواز نہ سنائی دی اور نہ وہ لوٹ کر آیا۔

سیوک کے چلے جانے سے گاؤں سونا سا ہو گیا تھا۔ ہر جگہ لوگ یہی چرچا کرتے تھے۔ ہر شخص کو اس کے غائب ہو جانے کا رنج تھا۔ گاؤں کے کنوئیں پر جب گاؤں کی ہر عمر کی عورتیں اور لڑکیاں پانی بھرنے کے لئے جمع ہوتیں تو سیوک کا ذکر کرتیں۔ اس کی بانسری کو یاد کرتیں اور بہت تعریفیں کرتیں۔

سیوک کے بھائیوں نے رنج کے مارے کھیتی باڑی چھوڑ دی تھی اور کسی دوسری جگہ چلے جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس کی سسرال کے لوگوں کو بھی اس کے گم ہو جانے کا بیحد غم تھا لیکن سیوک کی کم عمر دھرم پتنی اپارنا ان تمام واقعات سے بالکل بے خبر تھی۔ اپارنا نہایت بھولی لڑکی تھی۔ وہ اپنی بڈھی ماں کو چاچی اور چھوٹے بھائی نارائن کو نارو کہتی۔ اور گاؤں کے سب لوگ اسے آپو کہتے تھے۔ نارو آپو کی زندگی کا سہارا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کھیل کود کر ہنسی خوشی زندگی بسر کرتی۔ دنیا کی فکروں سے اسے کوئی غرض نہ تھی۔

(۲)

سات برس بیت گئے۔ سیوک کا کچھ پتہ نہ چلا۔ لوگوں کے دلوں سے اس کی یاد فراموش ہوتی جاتی تھی۔ سب کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس دنیا میں زندہ اور سلامت نہیں ہے۔ بھائیوں نے اپنے دھرم کے مطابق اس کا دان پن بھی کر دیا۔ رشتے ناتے کے لوگ رو دھو کر صبر کر کے

بیٹھ رہے۔ سسرال والوں نے بھی اس کے کریا کرم میں کوئی کمی نہ کی۔ لیکن اپارنا جوان ہو چکی تھی۔ ماں باپ کو دوسرے کام کی فکر ہوئی۔ سیوک کے بھائیوں نے پہلے تو خاموشی اختیار کی۔ لیکن اپارنا کی اٹھتی جوانی دیکھ کر انہوں نے اسے زیادہ دن تک بٹھا رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اور چار و ناچار کہلا بھیجا بھائی! ایشور کی مرضی میں کسی کا اجارہ نہیں ہماری قسمت ہی ایسی پھوٹی تھی۔ نہیں تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔ آخر آپ کو بٹھا رکھنے سے کیا فائدہ۔ اپارنا کو ایک ایک بات کی خبر پہونچتی رہتی تھی۔ آئندہ زندگی کا خیال کر کے اس کا جی بھر آتا تھا۔ سیوک کے علاوہ کسی دوسرے کی ہو رہنے کے خیال سے وہ کانپ اٹھتی۔ وہ اسے ایک بہت بڑا گناہ سمجھتی تھی کیونکہ اسے سیوک کے مرنے کا یقین نہیں ہوتا تھا۔ جب نارو بچپن کے انداز میں بھولے پن سے سیوک کی موت کا ذکر کرتا۔ تو آپو فوراً بول اٹھتی " نہیں نارو! وہ سرگ باسی نہیں ہیں۔ وہ روز رات کو ان کھیتوں میں ٹہلنے آتے ہیں۔ میں ان کی بانسری کی سریلی آواز برابر سنتی ہوں"! نارو اپنی بہن کی یہ عجیب باتیں سنکر چپ ہو جاتا۔

کام کی بات چیت شروع ہو گئی۔ رشتہ کا ایک لڑکا تلاش کیا گیا اور بیاہ کی طیاریاں ہونے لگیں۔ آپو سے نہ رہا گیا۔ دوپہر کے وقت ماں کے پاس گئی اور بیاہ سے انکار کر دیا۔ سب نے سمجھایا مگر وہ راضی نہ ہوئی برابر کہے جاتی "میں تو ان کی بانسری کی آواز سنتی ہوں" برہمنوں نے اس کا روگ پہچانا اور اسے "تربینی" میں اشنان کے لئے جانے کی صلاح دی۔ آپو کے ماں باپ بیٹی کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ برہمنوں کی رائے پر عمل کرنے کو طیار ہو گئے۔

(۳)

الہ آباد میں جمنا ندی کے ساتھ ساتھ ایک پرانی اور سنسان سڑک بھی چلی گئی ہے۔ کسی زمانہ میں اس پر مسافروں کا تانتا بندھا رہتا تھا اب بھی اکا دکا آدمی پورببا بھیس میں کمبل یا کپڑے کی چھوٹی موٹی گٹھری بانس کی لمبی لاٹھی کے سرے پر لٹکائے کندھے پر

رکھے آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن دور دور کے پردیسی سرکنڈوں کے چھپر سے چھائی ہوئی بیل گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے۔ چلم پر دم لگاتے یا برہا۔ پچبڑا۔ کجلی وغیرہ کے تان لگاتے ہوئے بہت کم گذرتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی تیرتھیوں اور جاتریوں کا کوئی جھنڈ پیدل یا گاڑیوں پر گذرتا ہے تو دھول دھکڑ اور شور وغل سے تھوڑی دیر کے لئے سماں بدل جاتا ہے۔

ہرے بھرے کھیتوں کے بیچ میں سفید سفید سڑک ایسی معلوم ہو رہی ہے جیسے بالوں کے درمیان مانگ۔ جیٹھ کی چلچلاتی دھوپ میں ایک گھوڑا گاڑی گرد و غبار اڑاتی چلی جا رہی ہے اس کی کھڑکھڑاہٹ سے آس پاس کے جانور بھڑک جاتے ہیں۔ گاڑی کے اندر ایک بچہ اور پانچ چھ عورتیں ہیں۔ کوچوان کے برابر ایک بڈھا آدمی بیٹھا ہوا ہے اور ایک ہندوستانی رہبر چھت پر ہے۔ یہ رہبر تمام راستہ ہندی اور بنگالی ملی جلی زبان میں ادھر ادھر کی باتیں چھیڑے رہا۔ لیکن بڈھا اس کی طرف بہت کم کان دھرتا ہے۔ گاڑی کے اندر کی عورتیں کبھی چپ نہیں رہتیں۔

"کیوں بیٹی! کیسی سندر جگہ ہے؟ تیرا من کیا کہتا ہے؟" "ہاں چاچی! بہت سندر ہے مجھے سب سندر معلوم ہوتا ہے جی چاہتا ہے کہ ان کھیتوں میں دھیرے دھیرے ٹہلوں"۔

"ارے بو کھل! کیسی باتیں کرتی ہے اس انجان جگہ میں یہ بھی کوئی آرزو ہے؟"۔

"ہاں چاچی! سچ ہے۔ لوگ اپنی کرتوں کا دھیان رکھتے ہیں۔ لیکن اچھاؤں (آرزوؤں) کی پرواہ نہیں کرتے۔ لیکن کیا اس وقت تمہارا جی نہیں چاہتا کہ اس گاڑی سے اتر کر تھوڑی دیر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ"۔

"آہ بیٹی! اس بڑھاپے میں یہ امنگ کہاں"۔

آپارنا کی ماں چپ ہو رہی تھوڑی دیر آپو اور نار د بھی خاموش رہے۔ پھر آپس میں باتیں شروع کر دیں۔ آپارنا کی ماں ان کی باتوں سے عاجز آ گئی تھی اسنے کہا۔

"اچھا ناروَ اب چپ رہو! تم دونوں بھائی بہن ایک جیسے ہو کبھی ایک منٹ نچلے نہیں بیٹھتے"۔ آپو نے ہنسکر جواب دیا۔

"دیکھو اسی لئے میں پہلے سے کہتی تھی کہ تم الگ جاؤ اشنان کرآؤ پھر ہم لوگ جائینگے" بڈھی ماں نے منہ بگاڑ کر کہا۔

"ہاں! کیوں نہ کہوگی؟ دولت پانی میں پھینکنے کے لئے نہیں ہوتی بیٹیا! دو مرتبہ گاڑی کا کرایہ دینے سے کیا فائدہ تھا"۔

اپارنا چپ ہو گئی۔ لیکن نارو کی زبان کون بند کرسکتا تھا؟ اتنے میں گاڑی بالکل رک گئی اور اپارنا نے آہستہ کہا "معلوم ہوتا ہے ہم پہونچ گئے"۔

بڈھا رہنما گاڑی کی چھت سے جلد جلد اترا اور دروازہ کھول کر اندر کے لوگوں سے جلد اترنے کی تاکید کرنے لگا۔ نارو اپنی شرارت سے کب باز آنیوالا تھا۔ جلدی میں کودا تو پیر دھوتی میں اٹک گیا اور وہ زمین پر آرہا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہاں کا خاموش سماں اس کی چیخ اور بوڑھی ماں کی جھڑکیوں سے ہنگامہ میں تبدیل ہو گیا۔ آخر بڈھے رہنما نے انہیں سمجھا بجھا کر چپ کیا۔

دریا کے کنارے پہونچنے کے لئے راستہ کسی قدر ڈھالو تھا۔ اپارنا نے نارو کا ہاتھ پکڑ کر کہا اب تمہیں کودنے پھاندنے کی ضرورت نہیں میرا ہاتھ پکڑ کر سیدھے چلے چلو اب لڑھکوگے تو پانی میں جاؤگے۔

نارو کو کافی سزا مل چکی تھی۔ اس لئے اب وہ بالکل خاموش تھا۔ بڈھی ماں کے ایک ہاتھ میں پیتل کا ایک چمکدار برتن تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنی سلک کی ساری کی شکنوں کو پکڑے ہوئے تھی اس طرح وہ نہایت سنبھل سنبھل کر پیر رکھتی ہوئی چلی۔ اپارنا نے اپنی سنہری کنارے کی ساری کے آنچل کو منہ پر گھونگھٹ بنا کر ڈال لیا تھا۔ اور وہ اپنی ماں سے چند قدم آگے آگے تھی۔ بقیہ عورتیں اپنی اپنی ساری پکڑے اور اپنے اپنے برتن

لئے ہوئے آرہی تھیں۔

دریا کے کنارے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اپارنا کو بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں ایک چھوٹا خوبصورت مندر تھا۔ رہنما نے مندر کی طرف اشارہ کر کے کہا "بائی جی! یہ اچھاؤں (آرزوؤں) کے دیوتا کا مندر ہے۔ بہت طاقت والے دیوتا ہیں۔ تم یہاں جو کچھ مانگو ضرور ملے گا۔"

اپارنا یہ سنکر تھوڑی دیر حیران کھڑی رہی پھر آہستہ مندر میں داخل ہوئی۔ دیوتا کے سامنے تھوڑی دیر کچھ پڑھ کر چپکے سے واپس چلی آئی اتنے میں اس کی بوڑھی ماں جو کسی قدر پیچھے تھی پہونچی اور نہایت شوق سے مندر میں داخل ہوئی۔ دیوتا کے سامنے سجدہ کیا اور بہت گڑگڑا کر کہا "مہاراج! میری بیٹی شادی کرنے کو راضی ہو جائے تو میں آپ کی سیوا کرونگی" باقی عورتوں نے بھی اسی طرح دعائیں کیں۔

اپارنا اس عرصہ میں پیپل کے سایہ میں کھڑی رہی۔ مندر سے نکل کر یہ پوری پارٹی گھاٹ کی طرف بڑھی۔ کشتی تک پہونچنے کے لئے تھوڑی دور کیچڑ میں چلنا چاہئے تھا۔ نارو نے چلا کر کہا "میں اپنے جوتے اتار دیتا ہوں! لیکن اتار کر کہاں رکھوں" اس کی بہن نے جواب دیا "ارے نالائق! تب تو نے گاڑی ہی میں کیوں نہ رکھدیا تھا"۔ بڈھی ماں یہ سنکر بولی! "ہاں کیوں نہیں؟ تاکہ وہ چوری جاتے! اپارنا تجھ میں نارو سے زیادہ لڑکپن ہے بھلا گاڑی والے کا کیا اعتبار؟"

گاڑی والے کو کرایہ نہیں ادا کیا گیا تھا وہ اس کے بدلے میں نارو کے پرانے ٹوٹے ہوئے جوتے لیکر کیا کرتا؟ لیکن اپارنا نے ماں کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور صرف یہ کہا "اچھا اتار دو! میں لیتی چلتی ہوں"۔

بڈھے رہنما نے ایک کشتی ٹھیک کر لی تھی ایک ایک کر کے سب اس پر سوار ہوئے ملاح نے ان کو بیٹھنے وغیرہ کے متعلق چند ضروری ہدایات دیں اور روانہ ہوا۔ دریا کے

بیچ میں پہونچکر گرمی کا اثر بالکل زائل ہو گیا۔ ہر شخص اطمینان کا سانس لینے لگا۔ اپارنا کے سر سے آنچل سرک گیا۔ لیکن اسے اس کی کوئی اطلاع نہیں ہوئی۔ اس کی نگاہیں پانی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ لہروں کا راگ سننے میں محو تھی۔ دریا میں ہزاروں کشتیاں ادھر اُدھر آجا رہی تھیں ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ موجود تھے۔ کسی کشتی سے لڑنے جھگڑنے کی آواز آرہی تھی۔ کسی سے گانے بجانے کی اور کسی سے ہنسی مذاق کی۔ اپارنا کو یہ سب چیزیں بہت انوکھی معلوم ہوتی تھیں۔

تھوڑی دیر میں کشتی تربینی پر پہونچی۔ جہاں گنگا۔ جمنا اور سرسوتی کا سنگم ہے یہاں جاتریوں کی اتنی کثرت تھی کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ کنارے کے پاس پانی بالکل گدلا ہو گیا تھا لیکن لوگ اسی میں نہا رہے تھے۔ گویا وہ دریا کی وسعت سے بالکل بے خبر ہیں۔ لوگ دریا میں پھول اور دودھ لا لا کر ڈالتے تھے۔

سب عورتیں اشنان کے لئے اتریں لیکن اپارنا نے پہلے ہی سے نہ نہانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ باوجود اصرار کے وہ نارو کے ساتھ کشتی ہی میں بیٹھی رہی نارو پانی سے کھیلنے میں مشغول تھا اور اپارنا گھاٹ کے تماشے دیکھ رہی تھی۔ نہانے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی جن میں اکثر بوڑھی عورتیں تھیں۔ کچھ جوان عورتیں بھی نہا رہی تھیں جنہیں تمام لوگ گھور رہے تھے۔ پنڈے منتر جنتر پڑھنے اور دولت کمانے میں مشغول تھے۔ کچھ نائی بیٹھے ہوئے نہایت تیزی سے اپنا کام کر رہے تھے۔

اتنے میں ایک سنیاسی ایک کشتی میں کالی کی مورت رکھے ہوئے گھنٹی بجاتا ہوا آیا نارو نے کہا "بہن دیکھو! کتنی اچھی مورت ہے؟" اپارنا کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ایک شخص گیروا بستر پہنے بانسری بجاتا ہوا آیا اور مورت کے گرد چکر لگانے لگا۔ بانسری کی سریلی آواز کے ساتھ اپارنا کھو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اس ترنم کے نشیب

و فراز کے ساتھ اس کی روح گھوم رہی ہے۔
ایارنا نے جلد وارفتگی میں مورت کی طرف اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے قریب تھا کہ بے دم ہو کر وہ پانی میں گر جائے کہ بانسری والے نے اسے پکڑ لیا۔ نارو زور سے چیخا لوگ جمع ہو گئے............ ایارنا ہوش میں آئی تو سیتوک کی گود میں تھی۔ دوسرے روز پوری پارٹی سیتوک کو ساتھ لیکر واپس ہوئی۔

جذبات فخر

(جناب فخر)

خزاں سے پہلے ہی گلشن کی ہوگی پامالی جو مات کھا گیا گلچیں سے باغ کا مالی

کوئی طلسم تھا جادو تھا چشم ساقی میں کہ اک نگاہ میں دامانِ ہوش تھے خالی

چمن اُجاڑ ہوا بلبلیں تباہ ہوئیں سسک رہا ہے کہیں غم سے باغ کا مالی

نہ پوچھ عہد خزاں میں چمن کی آرائش کہ رنگ لائی ہے بلبل کے خون کی لالی

جنہیں تھی طاقتِ پرواز بام پر پہونچے شکست دیگئی فخر اپنی بے پرو بالی

جلوہ نظر آتا ہے

جناب اصغر گونڈوی کی غزل اس زمین میں مشہور ہوئی۔ اس پر لکھنؤ میں مشاعرہ ہوا اور اسی طرح میں لکھنؤ اور لکھنؤ سے باہر کے شعرا نے طبع آزمائی کی۔ لکھنؤ کے مشاعرہ کی غزلیں رسالہ "مرقع" (لکھنؤ) کے کئی نمبروں میں شائع ہوئی ہیں۔ ۶ر نومبر کو اسی طرح میں ایک مشاعرہ حیدر آباد میں ہوا۔ میں اپنی غزل کے کچھ اشعار جو اس مشاعرہ کے لئے لکھے گئے تھے آپ کے رسالہ کیلئے بھیجتا ہوں۔ (وحید الدین سلیم۔ حیدر آباد دکن)

کس سمتِ تجلی کا جلوہ نظر آتا ہے ! جو نقش خودی کا ہے دھندلا نظر آتا ہے

اس در پہ جبیں سائی بے سود ہوئی اے دل اب نقش تمنا بھی مٹتا نظر آتا ہے !

یہ کس کو ڈبویا ہے چڑھتی ہوئی موجوں نے گرداب کا چہرہ بھی اترا نظر آتا ہے !

جب دیکھتا ہوں دل کی افسردہ امنگوں کو اجڑی ہوئی دنیا کا نقشہ نظر آتا ہے

وہ نور جو دیکھا تھا پیشانیٔ آدم نے پردے سے مرے دل کے چھنتا نظر آتا ہے

دل جس کو تمنائیں رکھتی تھیں کبھی ٹھنڈا شعلوں کے تلاطم میں ڈوبا نظر آتا ہے

جو مہر درخشاں ہے عالم کی نگاہوں میں اس حسن کے پہلو میں سایہ نظر آتا ہے

تخییل مری بچکر تجھ سے نہیں جا سکتی ناکوں پہ مرے دل کے پہرا نظر آتا ہے

اب دل کے سفینے کو گرداب مبارک ہو پھر جوشن کا وہ دریا امڈا نظر آتا ہے

شوخی ہے کن آنکھوں کی یہ جسکے سبب ہر دم بدلا ہوا دنیا کا نقشہ نظر آتا ہے

آنچل ہے الٹنے کو کس شوخ کی رعنائی گلشن کا ورق سارا الٹا نظر آتا ہے

ڈالا تھا کبھی پرتو جو تو نے تغافل سے اب طور کے سانچے میں ڈھلتا نظر آتا ہے

تھی خاک میں ملنے کو سب نشو و نما جس کی وہ تخم تمنا پھر اگتا نظر آتا ہے !

ہر دانہ کو میں حسن کے پلکوں سے اٹھاتا تھا
پھولوں کو ہے جا پکڑا اے دزدِ خزاں تو نے
اے تیغِ حوادث میں صدقے تری چوٹوں کے
ساحل سے مرے ہٹ جا اے ظلمت بینائی
اے کاوش بیتابی ست چھیڑ مرے دل کو
میں خاک میں ملتا ہوں دیکھو تو مگر مجھ کو
جو صنعتیں اس کی تھیں سب اُس نے مٹا ڈالیں
یہ حسن کی زیبائی واللہ عجب شے ہے
فانوس مرے دل کا تھا رشکِ چمن جس سے
موتی نہیں مل سکتے۔ تہ تاشا اگر پہونچے
دامن تری الفت کا دل تھام سکے کیونکر
در کا رہے اک میداں جولانی وحشت کو

وہ خرمنِ ایماں اب جلتا نظر آتا ہے!
اب قافلہ رنگوں کا لٹتا نظر آتا ہے
ہر زخم مرے دل کا ہنستا نظر آتا ہے
سیلاب تجلّی اب بڑھتا نظر آتا ہے
قطرہ میں مجھے دریا سوتا نظر آتا ہے
بربادئ عالم کا خاکا نظر آتا ہے!
اب صانعِ عالم خود تنہا نظر آتا ہے
ملبوس خدائی میں بندہ نظر آتا ہے
وہ شعلۂ رنگیں اب بجھتا نظر آتا ہے
دریائے حیات اے دل گہرا نظر آتا ہے
ہاتھوں میں تمنا کے رعشہ نظر آتا ہے
انجم سے پرے مجھ کو صحرا نظر آتا ہے

میں کسی سے شادی نہیں کرونگی

(فطرت - اقبال)

اس مجمع میں بہت سے آدمی تھے - ان میں کسی نے مجھ سے شادی کی درخواست نہ کی میری بعض بہنیں شاید یہ رائے قائم کرنے میں جلد بازی سے کام لینگی کہ "میری اس میں سبکی ہوئی" لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے - ہمیں اس قدر تنگ خیال نہیں ہونا چاہئے - بات دراصل یہ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی مجھ سے شادی کی درخواست کرتا بھی تو میں اسے منظور نہ کرتی -

میری ایک دوست کا ذکر ہے اس کے خاندانی حالات اسے زیادہ میل جول اور سوسائٹی میں آنے کا موقعہ نہیں دیسکتے تھے - لیکن شوہر یا انتخاب رفیق کے موقع کو اس نے استعمال تو کیا لیکن چونکہ وہ عام حالات اور مردوں کے فوری جذبات میں سے پختہ اور خام کی تمیز نہیں کرسکتی تھی اس لئے اس نے بہت جلدی کی اور محض معمولی اظہار خلوص اور اقرار وفا کے وعدوں پر اپنے دل کی پوری کائنات کو بیچ بیٹھی - چند دنوں کے بعد مجھے اس سے ملنے کا موقعہ ملا - وہ بظاہر تو بڑی خوش اور اپنے آپ کو مطمئن ظاہر کرتی تھی مگر مجھے فوراً معلوم ہوگیا کہ اس کو رفیق زندگی کے انتخاب میں غلطی ہوئی اور اب وہ اپنی جلد بازی اور ناتجربہ کاری کے مارے نہایت تکلیف دہ حالات کا مقابلہ کر رہی ہے -

میں اس کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتی کیونکہ میرے پاس ٹھوس اور مفید باتوں کی کمی نہیں ہے - اگر مجھے وقت ہوتا تو میں اس کی تفصیل کو دلچسپ الفاظ میں ادا کرتی اور نادار یا غریب ہوتی تو اس کے ذریعہ کسی پبلشر کمپنی سے کچھ معاوضہ بھی حاصل کرلیتی - مگر میں خوش ہوں کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے اور میں کھانے پینے اور ضروریات زندگی بھر کا خود کما لیتی ہوں - اس لئے صرف ضرورت بھر واقعہ کی طرف اشارہ کردینا کافی سمجھتی ہوں -

میں اپنی بہنوں سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ وہ شادی کے معاملہ میں جلدی نہ کیا کریں شادی

کوئی ایسا معمولی کام نہیں ہے کہ سوچ بچار کئے بغیر کی جائے۔ شادی اگر سوچ سمجھ کر کی
جائے تو دائمی خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ اور یہی شادی اگر بے سوچے سمجھے کی جائے تو
عمر بھر تکلیف اور بدمزگی کا سامنا رہتا ہے۔ میرے خیال میں شادی کرتے وقت حسب ذیل
امور کو مدنظر رکھنا میری بہت سی بہنوں کو تکلیف سے بچا سکتا ہے :۔

۱۔ میں فضول خرچ آدمی کو پسند نہیں کرتی۔ اس لئے کہ فضول خرچ آدمی آزادی اور فیاضی کو بدنام کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ وقت اور ضرورت پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اور اس کی عادت بھی اس کو اس قابل نہیں ہونے دیتی کہ وہ طرح طرح کی ضروریات میں سے ضروری اور غیر ضروری کی تمیز کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی آمدنی معمولی اور غیر ضروری رسموں اور چیزوں میں پانی کی طرح بہا دیتا ہے اور بڑے بڑے کاموں کے لئے دوسروں کا منہ تکتا ہے۔

۲۔ کنجوس آدمی سے بھی مجھے سخت نفرت ہے۔ کنجوس آدمی کس طرح پہچانا جاتا ہے؟ یہ بہت ضروری سوال ہے۔ کنجوس آدمی اول تو اپنی حیثیت ظاہر کرنے کے لئے ہر وقت تجارتی گفتگو کرتا ہے۔ اور آپ اس سے سوال کریں یا نہیں، کوئی تذکرہ ہو یا نہ ہو، وہ خود بخود ایک بحث پیدا کر کے اس میں توجیہہ اور تاویل کرنے لگتا ہے۔ اسے اپنی گفتگو پر اس درجہ معقولیت اور ضروری ہونے کا یقین ہوتا ہے کہ اُسے مخاطب کے اکتا جانے کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ وہ بلا ضرورت اپنی آمدنی کے ذرائع بتانے لگتا ہے جس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کی امارت میں شک نہ کریں۔ اسے اس گفتگو اور اپنی تعریف پر مخاطب کی بدظنی کا بھی خیال ہوتا ہے کہ وہ بدظن نہ ہو جائے۔ لیکن پھر بھی وہ اس طرح شیخی مارتا ہے کہ اس میں کسر نفسی کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ گویا آپ کو اچھا خاصہ کودن سمجھتا ہے۔

غریب اور مستحق امداد لوگ تو ایک طرف رہے وہ اپنی خادمہ کو بھی کبھی کبھار ایک دمڑی تک دینے کی غلطی نہیں کرتا۔ برسات کے موسم میں، جبکہ ایک محدود آمدنی کے میاں

بیوی بھی، اور کچھ نہیں تو کرایہ ہی کی گاڑی پر آتے جاتے ہیں، وہ ایک آدھ میل نہیں، بلکہ دو دو تین تین میل تک آپ کو پیدل لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ پیدل چلنا وقت ضائع کرنا اور پتلون اور بوٹ کو خراب کر کے دھوبی اور خادموں کی مشکلات میں اضافہ کرنے میں نہیں جھجکتا، لیکن اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ چند آنے خرچ کر کے آرام سے اور وقت پر اپنا کاروبار انجام دے!

غالباً میری بہنوں کو، ایسے شخص کو بدترین رفیق حیات قرار دیدینے میں کوئی تکلف نہ ہوگا۔ جو ہر وقت اپنی بیکار دولت اور غیر مفید کاروبار کا تذکرہ کرتا رہے۔ اور اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی موضوع گفتگو ہی نہ ہو۔ لطف اور مسرت تو برطرف، ایسا شخص اپنے کاروبار کی مشکلات اور تجارتی نقصانات کا ذکر چھیڑ چھیڑ کر آپ کے تمام خیالات کو پراگندہ کر دیگا!

یہ ضرور ہے کہ جس شخص کو اپنے کاروبار کا اندیشہ لگا رہتا ہے، وہ ہمدردی کا مستحق ہے۔ لیکن ہمدردی کے معنی اس قدر وسیع کیوں لئے جائیں کہ اس کی خاطر کوئی اور شخص اپنا تمام وقت غم، فکر، اور بے چینی کی نذر کر دے؟ ایسا شخص اگر غربت اور ناداری کی مشکلات کا مقابلہ کرتے کرتے موجودہ خوش حالی تک پہونچا ہے تو اس صورت میں اس کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ پھر غریب اور نادار نہ ہو جائے۔

۴۔ وہمی اور شکی مزاج کے انسان سے بھی خدا بچائے۔ وہمی آدمی گاڑی کے اصل وقت سے ایک آدھ گھنٹہ پیشتر ہی سے آپ کو اسٹیشن پر گھسیٹ لے جاتا ہے۔ اور پھر بھی اسے ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں دیر نہ ہو گئی ہو۔ اگر اتفاق سے آپ کے ہاتھ یا پاؤں پر کوئی پھوڑا پھنسی نکل آئے تو وہمی آدمی اس کو مرض الموت سے کم نہیں سمجھتا۔ وہ اس کے علاج کے لئے بلا ضرورت اس درجہ بے چین اور متفکر ہوتا ہے کہ تمام کاروبار کا پروگرام بدل جاتا ہے۔ اس کی بے جا فکر اور ضرورت سے زیادہ، غلط ہمدردی سے اس قدر کوفت

ہونے لگتی ہے کہ اصل تکلیف کا برداشت کر لینا اس کے مقابل آسان ہوتا ہے۔ اور پھوڑے پھنسی کی تکلیف سے اس کی پروا اور توجہ، زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے!

اگر اتفاق سے آپ کو کہیں چوٹ آگئی تو وہ سمجھتا ہے کہ اب آپ کا سلامت بچ رہنا مشکل ہے۔ اس چوٹ کو وہ ایک مہلک اور خطرناک بیماری سے کم نہیں سمجھتا۔ اور ہر وقت اس ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے کہ آپ جس بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں اس سے کسی طرح نجات حاصل کی جائے!۔

فرض کیجئے، وہمی آدمی کو کمرے میں ایک تصویر لٹکانی ہے تو اس کام کے لئے وہ اس قدر اہتمام کرتا ہے کہ دوسرے شخص کو اس کام پر واقعی عظیم الشان ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اس کام کی خاطر تمام محلہ والوں کو بلاتا ہے اور پھر بلا تمیز اہلیت ہر ایک سے تصویر لگانے کے متعلق سوال کرتا ہے۔

کسی سے کہتا ہے کہ یہ کتنی اونچی ہونی چاہئے؟ دوسرے سے کہتا ہے کہ یہ کہاں لگانی چاہئے؟ تیسرے سے پوچھتا ہے کہ یہ کس قدر جھکی ہوئی ہونی چاہئے؟ چوتھے سے نہایت منت سے کہتا ہے کہ تم ہتھوڑا پکڑے رہو۔ پانچویں سے کہتا ہے کہ آپ کو تکلیف تو ہو گی، معاف کرنا، ذرا اس تصویر کو اس طرح تھامے رہئے! چھٹے سے کہتا ہے کہ آپ اس کا خیال رکھئے گا کہ اس کی کیلیں ٹھیک ٹھیک اور مناسب فاصلہ پر ٹھکتی ہیں کہ نہیں! جب تصویر ان تمام تمام نہاد اور طبع زاد مراحل کے بعد لٹک چکتی ہے تو پھر سب سے دریافت کرتا ہے کہ کہئے تصویر ٹھیک لگی۔

۴۔ مغرور آدمی سے بھی میری جان جاتی ہے۔ ایسے شخص کو اپنی شکل و صورت پر اس درجہ گھمنڈ ہوتا ہے کہ معمولی پروا سے اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ ہر وقت اس کی پرستش کرتی رہیں، اور اپنی تعریف کے علاوہ کسی امر کا تذکرہ کرنا تو درکنار، سننا بھی نہیں چاہتا۔ اس کو اس بات سے تکلیف ہوتی ہے کہ اس کے سامنے

کسی اور شخص کے کمالات کی تعریف کی جائے ۔ ایسا شخص جب آپ سے شادی کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو آپکا ممنون نہیں ، بلکہ آپ کو اپنا ممنون سمجھتا ہے ۔ وہ شادی نہیں کرتا گویا آپ پر احسان کرتا ہے ! اس ساخت کے دماغ والا انسان بھی نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے ۔ اس قسم کے لوگوں سے میں بچتی ہوں اور اپنی بہنوں کو بچنے کی ہدایت کرتی ہوں ۔

غزل

(مولانا کیفی چریاکوٹی)

سر بسر مشکل تمنا ہے یہ اچھا درد ہے
میں سراپا دل ہوں، دل میرا سراپا درد ہے

دل گئے الفت میں مجھکو دونوں عالم کے مزے
تم مری آنکھوں میں ہو دل میں تمہارا درد ہے

ہجر میں اک اک قدم کا نام ہے بیچارگی
تھام کر دل بیٹھ جاتا ہوں جو اٹھتا درد ہے

کیا بتاؤں چارہ گر میں آہ کس کا نام لوں
یہ دلِ بیتاب جس کا ہے یہ اس کا درد ہے

دم بخود اہل مداوا ہیں کریں تو کیا کریں
دل ٹھہرتا ہی نہیں دم بھر یہ کیسا درد ہے

بار میرے دل پہ ناصح صبر و تسکیں کا نہ رکھ
جسکو تو دانا سمجھتا ہے مداوا درد ہے

کس لئے بیٹھے ہوئے ہیں میری بالیں پر طبیب
میں ترا بیمار ہوں مجھکو انوکھا درد ہے

دم بخود رہنے نہیں پاتا کوئی پہلو مرا
سچ جو پوچھو زندگانی کا سہارا درد ہے

فتنۂ محشر بپا ہے کوئی سنتا ہی نہیں
ورنہ ہر نالے سے کیفیؔ میرے پیدا درد ہے

کلامِ امیر

(از حضرت امیر بدایونی)

جنوں نالاں ہے جس یاس بیٔ ظلمت فراواں کا
وہ اک دھندلا سا خاکہ ہے ہماری شامِ ہجراں کا

تسلی دام مانگے برقِ آتش دستِ بیتابی
اثر اتنا تو ہے داغِ جگر میں سوزِ پنہاں کا

امیدِ وصل سے حاصل نہیں جز ہجرِ ناکامی
تمتع اب مرادف بن گیا ہے لفظِ نقصاں کا

نہ کیوں ہر در و دیوار کو امیدِ ویرانی
ہے چارہ سیلِ طوفاں ریز پر ہے چشمِ گریاں کا

ہے جور و ظلم بے پایاں ہے نقدِ جان و دل حاضر
و فلسفے مسئلہ حل کر دیا ہے جبر و نقصاں کا

دفورِ بیدلی سے پوچھ اس ناکام دہقاں سے
شرر تشنہ جلی کشت پر حاصل ہو باراں کا

کیا ہے جادۂ پیما مجھکو اس شادی میں وحشت نے
کہ جس میں ضبطِ خاموشی طریقہ ہے ہد نجوار کا

نہ ہو کیوں اس نگاہِ تلخ سے لب کو شکر رنجی
شہیدِ خنجرِ مژگاں پہ دکھا بارِ احساں کا

امیر اس تیغِ بیدرماں سے ہیں جو پائی غمخواری
لب یاس آفریں پر تذکرہ ہے جس کے درماں کا

فرشتہ کا پیغام

(انور رشید صدیقی)

دنیا میں تلون بیحد ہے۔ کچھ بڑھتا گھٹتا رہتا ہے
ناچیز یہ تو وہ مٹی کا۔ ہر آن پلٹتا رہتا ہے!
جب باگ فلک نے ڈھیلی کی۔ اک جنگ یہاں چھڑ جاتی ہے
پھر خیر سے شر لڑ جاتا ہے۔ نیکی سے بدی بھڑ جاتی ہے
ایمان میں لغزش ہوتی ہے۔ اخلاق بگڑتے جاتے ہیں!
میدانِ عمل سے انسانوں کے۔ پاؤں اکھڑتے جاتے ہیں!
دنیا کے مسافر پاپوں کے اندھیرے میں کھو جاتے ہیں
اس تاریکی میں نیکوں کے اوسان بھی گم ہو جاتے ہیں
جب حد سے گذر جاتی ہے بدی اور بڑھتی ہے سر سے طغیانی!
دھرتی پہ چمکتا ہے آکر تب ایک ستارہ نورانی!
اللہ کی رحمت ہوتی ہے بخشش کا فرشتہ آتا ہے!
پیغام سناتا ہے اپنا اور اک اک کو سمجھاتا ہے!

اللہ کے او غافل بندے! تو مست ہے کھانے پینے میں
یہ جینا موت سے بدتر ہے۔ کیا لطف ہے ایسے جینے میں
دنیا کے تماشے جادو ہیں! تو بھید نہیں کچھ پاتا ہے
جو آتا ہے گھبراتا ہے۔ جو جاتا ہے پچھتاتا ہے!
کیوں حسن جہاں پر مرتا ہے۔ کیوں رو رو کر جاں کھوتا ہے
دنیا میں کوئی امید نہ رکھ۔ یاں کون کسی کا ہوتا ہے
یہ چار گھڑی کے دن ہیں سارے۔ ایک پہر کی راتیں ہیں
آنکھوں کو سجھائی دیتا ہے جو سپنے کی سب باتیں ہیں!
چپ چاپ زمانہ دیکھے جا۔ تو اچھے برے کا دھیان نہ کر
یہ رنج و خوشی ہنگامے ہیں۔ ان ہنگاموں پر کان نہ دھر
نفسوں میں لڑائی جاری ہے۔ روحوں کو لڑایا جاتا ہے!
ہر آن تماشہ ہوتا ہے۔ اک کھوتا ہے۔ اک پاتا ہے
سن لے! کہ سنائے دیتا ہوں میں چین نہیں ہے عالم میں
جو چھوٹا ہے وہ غم میں ہے۔ جو موٹا ہے وہ ماتم میں
بس چین یہاں ہے بھگتی میں۔ یہ جیون مت برباد کرو
بھگوان کا ہردم نام جپو۔ اور موت کو اپنی یاد کرو

نازنین جاسوس

ایک مسلسل ناول

(از مولانا فطرت انصاری ندوی)

باب اوّل

(گذشتہ سے پیوستہ)

"۔۔۔ اس کا انجام بہت بُرا ہوگا۔ میں نے اس چور کو پہچان لیا ہے جو تمہارے سامنے دور کھڑا ہے۔"

چارلس:۔ مجھے اس واقعہ کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ مجھے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بات پہلے ہی سے طے شدہ تھی۔ اور تم ایک شکار کی طرح اس کے ہاتھ لگ گئے ہو۔

افسر:۔ ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔

چارلس:۔ یعنی!

افسر:۔ جو کچھ آپ کے سامنے ہوا وہ تو آپنے دیکھ ہی لیا۔ بات یہ ہے کہ میں امیر البحر شرووڈر کے بیڑہ میں کپتان کے عہدہ پر ملازم ہوں۔ مجھے لندن اس لئے بھیجا گیا ہے کہ میں مسٹر ماڈن اور مسٹر مکترا افسران اعلےٰ افواج اتحادی سے ملوں اور مذکورہ بالا افسروں کو لاسلکی تلغرات کے جدید طریقوں اور چند مخصوص اشارات (codewords) سے مطلع کروں۔ میں اس سے زیادہ آپ کو بتا بھی نہیں سکتا۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ جدید طرز کے جو اصطلاحات اس آلہ کے متعلق ایجاد ہوئے ہیں وہ سب لیکر میں یہاں آیا تھا اور ان میں بہت سے نقشے وغیرہ بھی شامل تھے۔

چارلس:۔ میں سمجھ گیا ۔۔۔ تو گویا آپنے انہیں کاغذات کو کھو دیا ہے!

افسر:۔ کھو دینے کا لفظ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک عجیب غریب طریقہ سے اڑا لئے گئے۔

ہیں ۔ اور مجھے بالکل معلوم نہیں ہوا ۔
چارلس :۔ آپ اس رات کہاں گئے ؟
افسر :۔ شام کا کھانا کھانے کے لئے میں ایک ہوٹل میں گیا ۔ کھانا کھایا ۔ کھانا کھانے کے بعد ڈانس ہال میں چلا گیا اور لوگوں کو دیکھتا رہا ۔ وہاں فرانسیسی صلیب احمر کے لئے چندہ کی کارروائی بھی ہو رہی تھی ۔ میں اس کو دیکھتا رہا ۔ وہ کاغذات میرے ساتھ تھے ۔ مجھے خیال گذرا کہ خدانخواستہ کہیں یہ کاغذات گم نہ جائیں ۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ان کاغذات اور نقشہ جات کو نصف نصف کر لیا ۔ ان کا ایک ایک حصّہ تو میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا اور باقی نصف ہوٹل ہی کے ایک آہنی صندوق میں بند کر کے رکھدئے ۔
چارلس ۔ کاغذات کو نصف نصف کاٹنے سے آپ کی کیا غرض تھی ؟
افسر :۔ یہ کاغذات کچھ اس ترکیب سے طیّار کئے گئے تھے کہ اگر ان کا ایک حصّہ نہ ہو تو دوسرا حصّہ بھی بیکار ہو جاتا ہے ۔
چارلس :۔ اچھا تو دوسرا حصّہ آپ کی جیب میں تھا ؟
افسر :۔ ہاں ، جیب میں ۔ میں جب ڈانس ہال میں داخل ہوا ہوں مجھے یاد ہے کہ اس وقت وہ کاغذات میرے جیب میں موجود تھے ——— میں ڈانس دیکھتا رہا ۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ کاغذات غیر محسوس طریقہ سے میری جیب میں سے نکال لئے گئے ہیں ——— ،
چارلس :۔ آپ ڈانس میں شریک ہوئے تھے ؟
افسر :۔ ہاں ، ہاں ڈانس میں میں دو ایک مرتبہ شریک ضرور ہوا ۔ لیکن میں لڑکیوں کے ساتھ میں شریک رقص ہوا ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس پر اس کا شک کیا جائے ——— ،

چارلس :۔ تو آخر وہ کاغذات کس نے چرائے ؟
افسر :۔ یہی تو ایک راز ہے ۔میں بھی تو اس فکر میں ہوں کہ اس کا پتہ لگایا جائے
ایک شخص میرے پیچھے پھرتا ہے ۔جہاں میں جاتا وہ بھی وہیں پہونچتا ہے ۔ اس سے مجھے شک ہوا کہ مخالفین نے وہ کاغذات کسی نہ کسی طرح میری جیب سے نکال لئے ہیں اور اب وہ اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح وہ ان کے نقشے کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ــــ ،
اس خیال کی تکذیب یا تصدیق کے لئے میں نے یہ کیا کہ اسی طرح کا ایک بنڈل باندھ کر جیب میں رکھ لیا کہ اگر یہ میرے پیچھے پھرنے والا شخص واقعی چور ہے اور کاغذات کو یہی لے گیا ہے تو ان کے نقشے کے دھوکے میں وہ اس بنڈل کو حاصل کرنے کی کوشش ضرور کریگا ۔ اور اس طرح مجھے اس کے تعاقب اور پہلے کا غذات کی تفتیش کا موقع مل سکے گا ۔
چنانچہ آج ۔ یہ شخص میرے پیچھے لگا ۔ آدھی رات تک تو میں جاگتا رہا اور اس کو موقع نہیں مل سکا ۔جب ۱۲ بج گئے تو میں اس کی آنکھ بچا کر ادھر دریا کے کنارے آگیا.........
افسر :۔ (چارلس کا ہاتھ پکڑ کر) دیکھو ، دیکھو ، وہ دیکھو ۔ وہ شخص پھر کھڑا ہو گیا ہے ـــــ اور کسی طرف جانا چاہتا ہے ! مہربانی فرما کر آپ مجھے اسی کے تعاقب میں مدد دیں ۔ ہو نہو ، بھائی کوئی اور آدمی بھی اس کے ساتھ ضرور ہوگا ۔ میں اس کے پیچھے جاتا ہوں ـــــ اور آپ یہ دیکھتے رہئے کہ دوسرا آدمی کدھر سے آتا ہے ؟
چارلس ! آپ یقین کیجئے کہ اس طرح آپ صرف میری مدد نہیں کر رہے ہیں بلکہ وطن عزیز کے اہم ترین خدمت ادا کر رہے ہیں ۔
چارلس :۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ شخص کسی غیر حکومت کا جاسوس ہے ۔ اور نہایت اہتمام اور احتیاط سے اس کام کو انجام دیگا ۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے سراغ

نکالنے کے لئے ہم کو یہ شہر چھوڑنا پڑے۔ میں اس میں ہر ممکن امداد دینے کو طیار ہوں، لیکن یہ سوچ لیجئے کہ یہ حوصلہ خالی از دقت نہیں ہے!

افسر:۔ اس کے سراغ لگانے کے سلسلے میں اگر مجھے دور دراز ملکوں میں بھی جانا پڑے تو میں اس کی پروا نہیں کروں گا۔ معاملہ کی نوعیت کو آپ سمجھ چکے ہیں اور میں مصیبت کا سامنا کرنے کے لئے بالکل طیار ہوں کیونکہ میرے لئے ان مخفی کاغذات کا حاصل کرنا ازحد ضروری ہے! بہر حال، اس وقت اس بحث کو بڑھانا مطلب کو فوت کرنا ہے وقت بہت تنگ ہے اور مخالف ہمارے ہاتھ سے نکل جانا چاہتا ہے ـــــ وہ دیکھئے، اب وہ چلدیا ـــ اچھا تو آپ اب ویسٹ منسٹر کی طرف سے جایئے اور وہاں سے شمال کی طرف جانیوالی سڑک لے لیجئے ـــ اور میں اسی کا تعاقب کرتا ہوں۔ جاتے وقت افسر نے چارلس کو ہدایت کی کہ:۔

"مسٹر چارلس! میں آپ کی ہمدردی اور احسان کا مشکور ہوں" لیکن اسی کا خیال رہے کہ اگر میں اور آپ راستہ میں" کسی ایسی جگہ ایک دوسرے سے ملیں جہاں یہ چور یا اور کوئی" آدمی بھی قریب ہو، تو آپ مجھ سے بات چیت نہ کیجئے گا" اور نہ ہی کوئی اور اسی قسم کی حرکت کیجئے گا جس سے میرے اور" آپ کے درمیان کوئی آشنا سائی معلوم ہو بلکہ اجنبیوں کی طرح" "مجھ سے الگ تھلگ رہئے گا! اس اثنا میں اگر آپ کو کسی" اور شخص کا یہ سراغ ملجائے یا وہ خودبخود آپکے سامنے" سے گذرے تو آپ اس چور کا تعاقب چھوڑ دیجئے گا" اسے میں دیکھ لوں گا۔ آپ اس نئے آدمی کے پیچھے" ہو لیجئے گا۔ اور اس امر کا سراغ لگانے میں مصروف" ہو جائے گا ــــ"

باب (۲)

تعاقب

چارلس نے افسر کی ہر ایک ہدایت کو نہایت غور سے سنا اور ایک رضا کارانہ انداز سے سر تسلیم

ختم کر دیا۔ دونوں تعاقب کے لئے روانہ ہوئے۔ چور بھی کچھ فاصلہ پر ان آگے آگے جا رہا تھا ابھی یہ دونوں فلیر روڈ پر ہی پہونچے تھے کہ چور بیٹھ گیا اور دیاسلائی سے سگار سلگایا۔۔۔۔۔۔۔

دیا سلائی کا سلگانا۔ جلتی ہوئی دیا سلائی کو پھینکنا۔ اور سگار کا ایک کش لیکر اس کا دھواں نکالنا۔ یہ تمام کام کچھ اس طرح اور ایسے انداز میں ہوئے کہ چارلس کو ان تمام حرکات پر اشارات کا شبہہ ہوا۔

چارلس کا شبہہ یقین سے بدل گیا کہ وہاں اس چور کے علاوہ بھی کوئی شخص موجود ہے جس کو اس نے اشارہ کیا ہے! اور بہت اغلب ہے کہ یہ اشارات ان میں پہلے ہی سے طے شدہ ہوں۔

نازنین جاسوس

چارلس نے دیکھا کہ سگار کے سلگتے ہی سڑک کے سامنے والے ہوٹل کا دروازہ کھلا۔ اور اس میں سے ایک عورت باہر نکلی جو سبز رنگ کی ریشمی چادر اوڑھے ہوئی تھی۔ خاتون کا لباس شاندار تھا اور اس کی ٹوپی نہایت قیمتی بیل بوٹوں سے سجی ہوئی تھی۔ کندھوں پر ایک مشہور اور اعلےٰ قسم کی چادر ڈالے ہوئے تھی جس کو عام طور پر ڈینلے (Danley) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ رات کو خواتین عموماً یہی چادر استعمال کرتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔

یہ عورت ہوٹل سے نکلی اور تھوڑی دیر تک دروازہ کے سامنے ہی ٹھیری رہی۔ پہلے اس نے دائیں بائیں طرف دیکھا اس سے معلوم ہوا کہ وہ موٹر یا کسی ٹیکسی کو دیکھتی ہے۔ ایک منٹ کے بعد وہ سامنے کی سڑک کو طے کرکے اس چور کے پاس سے، چپ چاپ، نہایت تیزی سے گذر گئی کوئی بات چیت نہیں کی ـــــــــ،

اگرچہ بظاہر ان دونوں میں کسی قسم کی گفتگو نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے پاس سے گذرتے وقت چارلس نے ایک ہاتھ کی حرکت کو ضرور محسوس کیا جیسیں کوئی سفید سفید چیز، ہو بہو اس سفید بنڈل کی طرح، ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی ہوئی ضرور دکھائی دی جس کو اس نے دریا کے کنارے افسر کے جیب سے نکلتے دیکھا تھا۔

یہ سب کچھ نہایت پھرتی سے عمل میں آیا اور چارلس کو اب پورا پورا یقین ہو گیا کہ اس چور
اور ساتھی بھی یہاں موجود ہیں ۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا تھا کہ سگار کا سلگانا بھی ایک
تم کا پہلے سے طے شدہ اشارہ تھا۔ اور اب چارلس کو فوراً یہ خیال آیا کہ افسر کو ان واقعات
اطلاع دے ۔ اس خیال کے آتے ہی وہ واپس جانے اور افسر کو تلاش کر کے اس سے یہ
م ماجرا کہنے کے لئے پچھلے پاؤں الٹ جانے ہی کو تھا کہ اسے پھر افسر کی ہدایت یاد آئی جو چلتے
قت اس نے دی تھی ۔

چارلس پھر انہی کے تاڑنے میں مصروف ہو گیا اور اس کو خلاف مصلحت سمجھا کہ ان
وآدمیوں کو چھوڑ کر افسر کی طرف جائے ۔ افسر نے چلتے وقت چارلس سے یہ بھی کہا تھا کہ
بب کوئی دوسرا آدمی اس سلسلہ میں نظر پڑے چور کو چھوڑ کر اسی کا تعاقب کیا جائے ۔
ناچہ اس نازنین جاسوس کے تعاقب کا فیصلہ کیا اور اس کے پیچھے ہو لیا ۔

اب چارلس کو کسی قدر کامیابی کی جھلک جو نظر آئی تو اس کا دل بڑھ گیا اور پہلے سے بڑی
ستعدی کے ساتھ اس اتفاقیہ مگر پراسرار کام میں دلچسپی لینے لگا ۔

چور کا تو کہیں پتہ نہ ملتا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاغذات کا بنڈل اس خاتون کے حوالہ
رتے ہی ان سے علیحدہ ہو گیا ۔ خاتون نہایت تیزی سے راستہ طے کرنے لگی ۔ چارلس بھی اس کے
یچھے ہو لیا ۔ خاتون کا رُخ بیگاڈے کی سمت کو تھا ۔ اور وہ نہایت پھرتی سے جا رہی تھی
بھی یہ سڑک ، کبھی وہ ، ادھر اُدھر کے چکر ختم ہی نہیں ہوتے تھے ۔ چارلس بھی اس کی آنکھ
چا بچا کر اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا ۔

چارلس کو سب سے زیادہ اس امر کا اندیشہ تھا کہ یہ برق رفتار خاتون کہیں اس سے
پہلے کسی ہوٹل یا مکان میں نہ گھس جائے اور پھر اس کا پتہ لگانا ہی دشوار ہو جائے ۔ یا خدا
نخواستہ وہ کسی ہجوم میں غائب ہو جائے اور اس کی یہ تمام دوڑ دھوپ بیکار ثابت ہو ۔
چارلس کا یہ خدشہ اس وقت سے اور بھی بڑھ گیا جب سے خاتون نے دو ایک دفعہ جاتے جاتے

پیچھے مڑکر دیکھا ۔ اس سے چارلس کو یقین ہوگیا کہ خاتون نے اسے دیکھ لیا ہے اور اس کے تعاقب کا اسے علم ہوگیا ہے ۔ اب چارلس نے اس خاتون کے اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جاتے جاتے سڑک کے کنارے کسی دروازہ کی آڑ لے کر چھپ جاتا تھا ۔ اور چلتے چلتے جب اسے موقعہ ملتا کسی دیوار کے پیچھے تھوڑی دیر کے لئے چھپ رہتا تھا اس سے وہ اپنی بے تعلقی ظاہر کرتا جاتا تھا ۔

چارلس کئی دفعہ چھپ چھپ گیا اور تیز رفتار خاتون نے اپنے شک کے مطابق پھر اسے پلٹ کر دیکھا تو چارلس اسے نظر نہ آیا اس سے وہ سمجھی کہ "میرا خیال غلط ہے، یہ شخص کہیں اور جا رہا تھا" الغرض خاتون کے دل سے اب چارلس کے تعاقب کا خیال جاتا رہا ۔ لیکن واقعہ یہ نہیں تھا ۔ ایک دفعہ، چارلس اسی طرح ایک دیوار کی آڑ میں چھپ رہا ۔ آڑ سے نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ جاتے جاتے رک گئی ہے ——،

(باقی باقی)

وارداتِ قلب

(از محمد صدیق مسلم مالیگانوی)

سب مجھے تکتے ہیں میرا دردِ پنہاں دیکھ کر
یعنی آنکھوں میں مری اشکوں کا طوفاں دیکھ کر

ہوتے ہوتے ہوگئے ہم اسقدر راہِ طلب
تلوے کھجلاتے ہیں اب خارِ مغیلاں دیکھ کر

یہ حیاتِ مختصر اور اس پہ اتنا ہے غرور
اسلئے روتی ہے شبنم گل کو خنداں دیکھ کر

المدد لے لذتِ غم ۔ المدد اے صبر و ضبط!
کانپ اٹھتا ہوں میں رنگِ شامِ ہجراں دیکھ کر

دل کی دنیا مختصر کس کس کو دے کوئی جگہ
تنگ ہوں میں اب ہجومِ شوق واماں دیکھ کر

کس کو آتا تھا اے مسلم! میری توبہ کا یقیں
اب تو کچھ مجھ کو بھی شک ہے ابرِ باراں دیکھ کر

کیشوسوت

کرشنا جی کیشو واسٹے نام۔ تخلص کیشوسوت۔ وطن اصلی کوکن لیکن تعلیم کے سلسلہ میں ان کے جدامجد پونہ آئے اور وہیں بس گئے۔ رام گینش گڈکری شاعری میں انھیں کو اپنا گرو مانتے تھے مرہٹی شاعری میں انہوں نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ انگریزی شاعری کے اصولوں کو مرہٹی زبان میں انہیں نے پہلے پہل رائج کیا۔ ان کے کلام میں بلند پروازی اور سوز و گداز ہوتا ہے۔ زبان بھی کسیقدر مشکل ہوتی تھی اور وطن کے متعلق مرہٹی میں انہیں نے سب سے پہلے اشعار کہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کی شاعری تمام و کمال نیچرل ہے۔ گڈکری کی طرح یہ بھی کم عمری ہی میں انتقال کرگئے۔ تمام زندگی تنگدستی اور مصیبت میں گذاری جیتے جی ان کے علم و کمال کی کوئی وقعت نہیں کی گئی لیکن مرنے کے بعد جو عروج ان کے کلام کو حاصل ہوا غالباً بہت کم شاعروں کو میسر آتا ہے۔ ان کے ذخیرۂ شاعری میں تقریباً ۱۵۰ مختصر سونگ (قطعات) ہیں۔

ذیل میں ان کی جو نظم درج کی جاتی ہے اس میں اگرچہ کوئی خاص بات نہیں ہے تاہم سادہ بندش اور آسان و عام تشبیہات جو نیچرل شاعری کی جان ہیں خصوصیت سے قابل غور ہیں۔ یہ نظم شاعر کی تعریف میں ہے:-

ہم کیا ہیں؟

(کیشوسوت کی نظم کا لفظی ترجمہ)

ہم کیا ہیں؟ کیا بتائیں مخلوق خوب تر ہیں
ہم سب کے کھیلنے کو دنیا کے بحر و بر ہیں

جذبات شاعری سے ہم شعبدے دکھائیں
بے خوف جسطرف کو چاہیں قدم اٹھائیں
پست و بلند کے ہم اسرار جانتے ہیں
دولت کی سب نمائش بے کار جانتے ہیں
پانی بغیر اپنی ہم تشنگی بجھائیں
اور حسن کی کشش کا آنکھوں سے لطف اٹھائیں
گندم کو بھس بنائیں بھس کو بنائیں گندم
جادوگری سے اپنی ہوش و حواس ہوں گم
ناچیز شے کو کس نے جنس گراں بنایا
دوزخ نما جہاں کو جنت نشاں بنایا
اپنا ہر اک اشارہ کرتا ہے اک نگارش
بے چارہ مجرموں کی کرتے ہیں ہم سفارش
سن لو کہ ہیں غنیمت دنیا میں دم ہمارے
ہیں آسماں کی زینت جسطرح سے ستارے

"پن پرچھاؤ"

مرہٹی لٹریچر کا مایۂ ناز ڈرامہ مصنفۂ رام گنیش گڈکری

(ترجمۂ جناب اسلامی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

الیشور :- وسندرا! میری توقعات بیجا نہیں تھیں۔ واقعات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں نے ان امیدوں کو دل میں جگہ دی تھی۔ کچھ مجھ ہی پر کیا منحصر ہے۔ ہر شخص اپنی کسی نہ کسی بھروسہ پر رکھتا ہے ہاں! نوعمری کے زمانہ کی آرزوئیں کسی قدر شوخ ہوتی ہیں جو زمانہ کی طوالت کے ساتھ پھیکی پڑتی جاتی ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی دن پوری ضرور ہو کر رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے دنیا بر امید قائم۔ اور اس میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ نظر فریب دنیا تارک الدنیا سنیاسیوں کا مسکن ہوتی۔ یا اس میں انسانوں کے بجائے حیوان بستے میں نے جو کچھ کہا یہ ایک عام اصول ہے میرے حالات کا اس سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ میرے مناسب حال تو یہ مصرع ہے۔

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

سچ بھی یہی ہے کہ تمناؤں کو دل میں جگہ دیتے وقت ہم خدا کے نامعلوم بھیدوں کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ہمیں ناکامی ہوتی ہے۔ خدا کی مرضی جب ہمارے ارادوں کے خلاف ہوتی ہے تو یا تو ہمارے عزائم ملیامیٹ ہو جاتے ہیں یا ان سے غلط نتائج نکلتے ہیں۔ بالکل اسی طرح گردش ایام نے میرے نوشتۂ تقدیر کو برعکس واقعات سے تبدیل کر دیا ہے۔ اچھا وسندرا! اس ذکر کو جانے دو اس سے کچھ حاصل نہیں۔ میں نے ان معاملات پر اپنی مختصر سی زندگی میں اس قدر غور کیا ہے کہ اب میں ذرا سا ذکر بھی چھیڑتا نہیں تو وہ اس قدر پریشان کن ہو جاتا ہے کہ سننے والے اکتا جاتے ہیں جسطرح ایک دیوانہ کی

دیوانگی اس کی بدنصیبی کا ثبوت ہے۔ اسی طرح میری یہ آشفتہ بیانی میری کاسہ بختی کی دلیل ہے میں نہیں چاہتا کہ ان باتوں کی تمہارے سامنے زیادہ تفصیل کروں۔

وسندرا :۔ آہ الیشور! تمہاری باتوں سے میرا دل خون ہوا جاتا ہے۔ دیکھو میں پھر کہتی ہوں۔ الیشور! ذرا خیال کرو۔ آخر ورنداون کا پیغام بھی تو میرے باپ نے نامنظور کیا؟ اس میں شک نہیں کہ انہیں اس کا رنج ہوا لیکن پھر انہوں نے دوسری جگہ شادی کر لی۔

الیشور :۔ کیا؟ ورنداون نے شادی کی؟ اگر یہ سچ ہے۔ تو وہ حقیقت میں تمہارے لائق نہیں تھا۔ وسندرا! تمہارا یہی مطلب ہے نا؟ کہ ورنداون نے شادی کی اور اب وہ ایک کامیاب زندگی بسر کر رہا ہے؟۔

وسندرا :۔ مجھے کالندی (ورنداون کی بیوی) اور اس کے میکے کے حالات سے واقفیت نہیں ہے۔ ہاں ظاہری حالت نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ ورنداون آرندھتی میں ایک زمانہ سے رہتا ہے اور "ان" سے (میرے شوہر سے) اس سے بہت دوستی بھی ہے اس کا لشکر "انہیں" کے زیرِ نگرانی ہے اس وقت آرندھتی کے سرداروں میں ورنداون ایک مشہور سردار ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں خوب یاد آیا! ان کا بچہ بھی ہمارے دینار کا ہم عمر ہے۔

(دائینی کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں دائینی! ہمارا دینار اور کیتن (ورنداون کا لڑکا) ہم عمر نہ ہوں گے۔

دائینی :۔ ہاں بائی جی! بالکل ملتے جلتے ہیں۔ اور دونوں ابھی ایکسال کے نہیں ہوئے

الیشور (دینار کو دیکھ کر) یہ تمہارا "ننھا" ہے؟ اس کا نام کیا دینار نہیں؟ ۔۔۔۔۔ ہو بہو اپنی ماں کا نقشہ ہے حرکات و سکنات بھی ویسے ہی معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔ دیکھو نا! نظر ملتے ہی ہنسنے لگتا ہے۔ بڑا شریر ہے۔ دینار! یہ کب کی دوستی ہے؟ ۔۔ وسو! (وسندرا کا مخفف) اگر تمہارے باپ زندہ ہوتے تو تمہارے بچے کی صورت میں تمہارے لڑکپن کی تصویر بھی دیکھتے۔ تم دونوں میں کس درجہ

مشابہت ہے۔ تمہارے باپ کی یہ دلی آرزو تھی کہ تمہاری اولاد دیکھیں۔
وسندرا :۔ گذری ہوئی باتوں کا ذکر کیا؟ میرے باپ تو تمہیں بھی بہت مانتے تھے
بچپن میں تمہیں نہایت شوق سے کھلاتے تھے۔
آج دینار کو دیکھ کر انہیں جتنی مسرت ہوتی اتنا ہی تمہاری حالت دیکھ کر ملال ہوتا۔
الیشور (خود بخود) آہ! اس بچہ کو دیکھکر میرے دماغ میں اتنے خیالات پیدا ہوتے
ہیں کہ میں کھو جاتا ہوں۔ یقیناً اگر میں اسے گود میں لینے کی کوشش کروں گا تو وہ میرے
ہاتھوں سے گر جائے گا ——— (وسندرا سے) وسندرا!
درنداون کے متعلق بس اتنا ہی کہہ کر چپ ہو رہیں ۔
وسندرا :۔ مجھے اتنا ہی کہنا تھا ۔ اچھا اب مستقبل کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟
الیشور :۔ بہت موقع سے پوچھا! اسی سوال کے جواب سے تمہیں میری اس ملاقات کا
مقصد معلوم ہو جائے گا۔ وسندرا! اس زندگی کی مسافت میں عالم کائنات کی
رنگا رنگی نے مجھے کچھ عرصہ کے لئے محو تماشہ کر لیا تھا لیکن اب تو قدرت کی صناعیوں میں بھی
اتنی قوت نہیں معلوم ہوتی کہ وہ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی متوجہ کر سکیں ۔ پہاڑوں کی سر بفلک
چوٹیاں اب مجھے گھر کی چوکھٹ معلوم ہوتی ہیں ۔ پر فضا چمنستان مجھے اب سنسان مقام دکھائی
دیتے ہیں اور عالم تنہائی میں کسی کی دردبھری آواز مجھے ایک ہنگامہ سے بھی زیادہ ناگوار
گذرتی ہے جس دل نے اپنی تمام آرزوؤں کو صرف ایک مقصد پر نچھاور کر دیا ہو اس کے
لئے اس مقصد کے انتظار کی مصیبتوں کا واحد علاج خانہ بدوشی ہے اور یہی وجہ ہے
کہ میں یہاں آیا ہوں ۔

(باقی آئندہ)

سروشِ مستقبل

اے اسیرِ آرزو اے نامرادِ زندگی!
اب تجھے آتی نہیں بھولے سے یادِ زندگی

ایک دن وہ تھا کہ تو نا واقفِ افتاد تھا
تیرے دل کا گوشہ گوشہ اک سکون آباد تھا

تیرا دل جوشِ نشاط و عیش سے معمور تھا
آہ ان ایام میں تو کس قدر مسرور تھا!

آج تو ہے اور آغوشِ مزارِ بےکسی
تیری تربت پر برستا ہے غبارِ بےکسی

ذرّہ ذرّہ تیرے مرقد کا بنا دلگیر ہے
اور تو ناکامِ وصلِ یار کی تصویر ہے

ہائے وہ تیری جوانی وہ ترا عہدِ شباب
آج تو ہے قبر کی آغوش میں مصروفِ خواب

وہ دوشیزہ جو نہ لیتی تھی کبھی تیری خبر
اور تو روتا تھا جس کی یاد میں شام و سحر

آج وہ ہے تیری فرقت میں پریشان اور خوار
یاد تیری کر چکی ہے ان کو برباد و فگار

اب جفاؤں سے وہ اپنی خود پشیماں ہے بہت
تجھ سے ملنے کے لئے بیتاب و نالاں ہے بہت

عشق کے آثار اس پر ہو چکے ہیں آشکار
اس کے اجزائے جوانی بن چکے ہیں سوگوار

اب وہ خود جوگن بنی پھرتی ہے تیرے سوگ میں
ہو گئی ہے مبتلا رنج و الم کے روگ میں

کاش تو اس وقت اس کا حسن حیراں دیکھتا
اس کی رگ رگ میں وفا کا جزو پنہاں دیکھتا

روح تیری ہجر میں اس کے تڑپتی ہے بہت
حسرتِ واماندہ گو اب تک مچلتی ہے بہت

لیکن اک دن آئے گا پھر عشقِ رفتہ جوش میں
اس کا حسنِ جانفزا ہوگا تری آغوش میں

وہ تری بربادیاں اور وہ تری واماندگی
آہ افسانہ ترا دنیا نہ بھولے گی کبھی!

واہ رے ہمت تری پی ہی لیا جامِ وفا
جان دے کر اس کی الفت میں کیا نامِ وفا

لے ترے مستقبلِ رنگیں کا نغمہ گا چکا!!
کون؟ میں آشفتۂ غم طالبؔ قدسی نوا

عرشِ نیرنگی جھلکتا ہے تری افتاد میں
پھر بہار آئے گی تیرے گلشنِ برباد میں

(مرزا عبد المجید طالبؔ سیمابی جہلمی)

الشمس

"آفتاب کا تاریک مستقبل"

(از محمد صدیق مالیگانوی)

زمانۂ جدید کے علمائے فلکیات آئے دن جو انکشافات کرتے رہتے ہیں وہ اگر عوام کے لئے نہیں تو کم از کم علمی دنیا والوں کے لئے ہیجان کا باعث ضرور ہوتے ہیں۔ اجرام فلکی کے دور اوّلین کے حالات یعنی قصہ ہائے ماضی اب اسقدر عام ہو چکے ہیں کہ اگر کسی اسکول کے طالبعلم سے بھی دریافت کئے جائیں تو وہ فوراً جواب دیگا کہ "زمین پہلے اس حالت میں تھی۔ سورج ایسا تھا۔ چاند ویسا تھا" وغیرہ وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ اب یہ قصے ایک تعلیم یافتہ شخص کی نظر میں "پھیکی داستان" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ لیکن اب انہیں گوش بر آواز ہو جانا چاہئے کہ ماہرین فلکیات نے ان کی دلچسپی کے لئے اجرام فلکی کے قصہ ہائے ماضی کے کہنہ راگ کو ختم کر کے داستان مستقبل کا دلکش ترانہ چھیڑ دیا ہے۔ چنانچہ نیرنگ خیال لاہور میں "القمر" کے عنوان سے جو میرا مضمون شائع ہوا ہے اسے پڑھکر ارباب علم نے ماہتاب کے دور آخری کا کافی اندازہ کر لیا ہوگا۔ اس مضمون کو پڑھ کر جہاں دنیا سے دلچسپی رکھنے والوں کو صدمہ ہوا۔ وہاں ہمارے شعراء حضرات نے خوب بغلیں بجائیں اور زبان حال سے یہ کہا کہ "اچھا ہوا ہمارے خیالی معشوق کے دو منھ چڑھانے والوں (آفتاب و ماہتاب) میں سے ایک معدوم ہوا جاتا ہے"۔ لیکن ان شعراء حضرات کے لئے مزید خوشخبری یہ ہے کہ ماہتاب کی طرح آفتاب کا بھی مستقبل تاریک ہی نظر آتا ہے ان کے لئے وہ ایک بہترین موقعہ ہوگا جبکہ سارا عالم تاریک ہو جائیگا۔ اور وہ دنیا کی ہر شے کو شمع روئے یار کی روشنی میں دیکھیں گے۔

آفتاب کے متعلق علمائے فلکیات نے جو پیشنگوئی کی ہے یقیناً وہ دلچسپی سے خالی نہیں سطحی نظر سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب ہی ایک ایسا آتشیں کرہ ہے جو جوّ سماء کے تمام اجرام سے بڑا ہے مگر حقیقت امر اس کے برعکس ہے۔ فضائے آسمانی میں ایسے ہزاروں ستارے ہیں جو آفتاب سے بزرگ و روشن تر ہیں۔ لیکن وہ ہم سے اتنی دور واقع ہوئے ہیں کہ انسانی نظر کا تو کیا ذکر ہے علمائے ہیئت کی انتہا رس دوربینیں بھی ان کے مشاہدہ کے وقت اپنی ضعف بصارت کا اقرار کر لیتی ہیں۔ ان کی بزرگی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم ایک موٹر کار میں سوار ہو کر فی ساعت ۶۰ میل کی رفتار سے شبانہ روز سفر کرتے رہیں تو ۱۷ دن ۸ گھنٹے میں کرۂ زمین کا چکر لگا سکتے ہیں اور اسی رفتار سے اگر ہم آفتاب کا ایک طواف کریں تو پورے پانچ سال صرف ہوں گے۔ لیکن انطارس نامی ستارہ کے گرد ایک چکر لگانا چاہیں تو مدت کا ہندسہ ۱۳۷۰ سال پر آکر ٹھہرتا ہے۔ اس ستارہ کا قطر ۲۷ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے یعنی یہ کرۂ آفتاب سے ۳۰۰ گنا بڑا ہے۔ اس قسم کے بیانات پڑھ کر قارئین کرام یقیناً الجھن میں پڑ جائیں گے کہ آخر ستاروں کی بزرگی کی بھی کوئی حد ہے یا نہیں؟

ایڈنگٹن نامی ایک ماہر فلکیات نے اس حقیقت کو دریافت کیا ہے کہ جو ستارہ جسامت میں آفتاب سے ۵۰ گنا بڑا ہے وہ بزرگی کی انتہائی حد کو پہنچا ہوا ہے۔ اور یہی وہ حد ہے جس سے متجاوز کوئی ستارہ ہو نہیں سکتا کیونکہ اگر ایسا ہوا تو وہ شق ہو جائیگا۔ اور اس کے ٹکڑے فضا میں منتشر ہو جائیں گے۔ کسی ستارہ کی جسامت کا دار و مدار اس کے اجزاء ترکیبی کے وزن پر ہوتا ہے۔ یہ جسامت، شکل سے مختلف ہوتی ہے۔ شکل خواہ کتنی ہی بزرگی کا اظہار کرے لیکن جسامت حد معینہ سے زائد نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ شکل کے لحاظ سے اگرچہ انطارس آفتاب سے سینکڑوں گنا بڑا ہے تاہم اس کی جسامت آفتاب کے ۵۰ گنا سے زیادہ نہیں ہے۔

جسطرح ستاروں کی بزرگی محدود ہے اسیطرح ان کے چھوٹے ہونے کی بھی ایک حد معین ہے۔ جن ستاروں کی جسامت آفتاب کے ½ سے کم ہے وہ ہرگز روشن نہیں رہ سکتے۔

کیونکہ ان کی سطح پر ۵۰۰۰ فارن ہیٹ حرارت بہم نہیں پہنچ سکتی اور حرارت کی اتنی ہی مقدار کسی ستارہ کے روشن و مرئی ہونے کے لئے درکار ہے۔ چنانچہ فضا میں ایسے ہزاروں غیر روشن اجرام نظام شمسی کی جکڑ بندیوں سے گردش کرتے رہتے ہیں۔ مگر ہماری نظریں ان کو دیکھنے سے معذور ہیں۔

مذکورہ بالا اصولوں کو ذہن میں لا کر ہم آفتاب کے متعلق بھی کوئی نہ کوئی فیصلہ ضرور کر سکتے ہیں۔ سطح آفتاب کی حرارت بیش از بیش ۱۶۲۰۰ فارن ہیٹ تھی۔ اب یہ حرارت ۱۰۸۰۰ فارن ہیٹ رہ گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آفتاب کی حرارت روز بروز رو بانحطاط ہے۔ اور ایک دن ایسا ضرور آنے والا ہے جبکہ یہ حرارت روشنی کی مقدار معینہ سے گھٹ جائیگی۔ اور آفتاب محض ایک غیر روشن جرم ہو کر رہ جائیگا۔ تاہم اس حالت کو پہنچنے کے لئے ابھی لاکھوں برس کا عرصہ چاہیئے۔ کیونکہ سطح آفتاب پر جو حرارت بہم پہنچتی رہتی ہے وہ کوئلہ کی حرارت کی طرح نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ وہ آفتاب کے اندرونی اجزاء کے پھٹنے اور تغیر پانے سے پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کے گھٹنے کی مقدار بہت ہی ہلکی رفتار میں ہے۔

الغرض آفتاب ابھی بہت دنوں تک افضائے عالم کو اپنے نورانی جلووں سے فیضیاب کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ہماری سینکڑوں نسلیں ہماری ہی طرح اس نورانی خوان یغما سے حصہ لیں گی اور چلی جائیں گی ؎

نہیں معلوم دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے مجلس کی

(اقتباس)

تعارف

اسلام اینڈ دی ڈیوائن یونیٹی ۔ اس کتاب میں مولانا خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے توحید کے متعلق اسلام کے صحیح عقائد کا ذکر نہایت عام فہم اور سلیس انگریزی میں کیا ہے۔ یہ کتاب خواجہ صاحب کی کم و بیش ربع صدی تک تبلیغی میدان میں علمی جد و جہد و تجربات کے بعد قابل ستائش کاوشوں کا علمی نتیجہ ہے۔ اسقدر اختصار کے ساتھ ایسی سلیس زبان میں اس مسئلہ پر کوئی مستند کتاب اردو اور انگریزی میں موجود نہیں۔ فاضل مصنف نے یہ کتاب دراصل یورپ میں تبلیغی مصرف کے لئے لکھی ہے۔ اس لئے اس مسئلہ پر دنیا کے تمام قابل ذکر مذاہب اور جماعتوں کے خیال اور ان کی غلطیوں کا ازالہ مدلل و احسن پیرایہ میں کیا ہے۔

حصہ، باب، فصل اور فقرہ کی تقسیم نیز حواشی میں ذیلی عنوان وغیرہ کے خاص اہتمام کے ساتھ طباعت و کاغذ بھی دیدہ زیب ہیں۔

تعلیقات زیریں کی بجائے کتاب کے آخری حصہ میں حوالہ جات کی فہرست کا اضافہ موزوں اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ ایک نمایاں کمی کتاب میں رہ جاتی ہے جس کی طرف آئندہ اشاعت میں توجہ ضروری ہے، جس باب میں جناب مصنف نے حضرت علیؓ و امام جعفرؒ وغیرہما کے اقوال پیش کرکے یہ تبلایا ہے کہ جناب نبوی کی تعلیم توحید سے ان کے متبعین نے کیا مطلب سمجھا؛ اسی ضمن میں۔ اکابرین صحابہؓ کم از کم باقی تین اصحابؓ کے آراء و افکار کا اظہار ضروری تھا۔ جمہور اسلام کے نزدیک ان میں سے ہر ایک رموز شناس شریعت ہے۔ بہرحال کتاب باقی تمام حیثیتوں سے اس قابل ہے کہ اسلامی و غیر اسلامی انگریزی داں طبقہ اس سے کافی استفادہ حاصل کرسکتا ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کو اس بیش بہا تصنیف سے محروم نہ رہنا چاہئے۔

تختی متوسط۔ حجم ۱۱۶ صفحہ مجلد، متن سیاہ حواشی و جدولیں سرخ۔ قیمت عہ۔ پتہ ۔۔۔

خواجہ غلام الحسنین۔ لیڈیز ٹریننگ کلاس کھانڈیا اسٹریٹ بمبئی سے طلب کیجئے۔

خدا کی ہستی:- یہ بھی جناب خواجہ صاحب کی اردو تصنیف ہے۔ اس کتاب میں خدا کی ... متعلق عقلی و نقلی دلائل ایسے بہتر طریقے سے جمع کر دئے گئے ہیں کہ بظاہر قصوں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دراصل ہر قصہ کے اختتام پر خدا کی ہستی کا ثبوت ملتا ہے۔ تمام براہین ... سے دی گئی ہیں یا نقلیات سے۔ لیکن اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ کوئی غیر واقعی چیز بیان ... اس حیثیت سے اگرچہ کتاب مختصر ہے مگر علمی معیار تحقیق سے گرنے نہیں پائی۔ زبان کی انتہائی سہولیت اور اسلوب بیان کی پاکیزگی کی بنا پر اس کتاب سے ہر شخص کچھ نہ کچھ طمانیت ... کرسکتا ہے۔ بالخصوص بچوں کے لئے بہت دلچسپ سہل الفہم اور مفید ہے۔ لکھائی چھپائی اور اچھی ہے۔ کاغذ عمدہ، پاکٹ ایڈیشن۔ قیمت ۲ ر۔ مذکورہ بالا پتہ کافی ہے۔

مثنوی اسرار ہستی:- جناب گویا جہاں آبادی نے اردو میں بالکل جدید رنگ میں یہ مثنوی ... ہے۔ نہایت مشکل چیزوں کو آسان اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ باوجود اصطلاحات ... غیرہ کے استعمال کے زبان کی ندرت و صفائی بہت خوبی کے ساتھ قائم رکھی ہے۔

اسرار ہستی میں مادیت و تصوریت وغیرہ وغیرہ کے خاص مسلک سمجھنے کے لئے توا کسی قدر منطق و فلسفہ سے مس کی ضرورت ہے۔ لیکن ان دو چار صفحوں کو چھوڑ کر ساری کتاب معمولی استعداد کا ہر شخص لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ ہر مسلک کو بلا کسی اختلاط کے بیان کرنے کے مصنف کا اپنی طرف سے استفہامیہ انداز میں ثبوت خاص چیز ہے۔

شاعر نے کتاب کی ابتدا میں بصائر اور آخر میں تبسم پر اپنے خاص رنگ میں گہرا... کی ہے۔ تبسم پر پہلا شعر یہ ہے:- زبان تبسم سمجھ میں نہ آتی
ادائیں ہوئیں ترجمان تبسم

پوری نظم اسی طرز میں ہے۔

ہم اولستان کے معاونین سے اس کے پڑھنے کی خصوصیت کے ساتھ سفارش کرتے ہیں لکھائی چھپائی اچھی کاغذ اعلیٰ مجلد قیمت ۸ ر ملنے کا پتہ :-

سید ضامن حسین کوآ
محلہ احمد زئی بیلی بھیت۔

تازہ بتازہ نو بنو

اس عنوان کے ماتحت ہم ان مقامی اہل قلم اور اہل ذوق حضرات کی نگارشیں پیش کریں گے جو "ادبستان" کی تحریک کے سلسلہ میں میدان میں آئیں گے۔ تاکہ ناظرین کرام "مقامی دلچسپیوں" سے بھی لطف اندوز ہوسکیں اور یہاں کے روز افزوں مذاق کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔

خلد آباد میں چند گھنٹے

(جناب مفتی شیخ احمد عثمان صاحب

کائنات کا ہر ذرہ اثرات سے لبریز ہے۔ لیکن میں تو ایک ایسا دل چاہتا ہوں جو اس ذکر سے بے تاب ہو جائے۔ اس تصور سے دھڑکنے لگے۔ مجھے دنیا کی کوئی چیز نہیں بھاتی۔ مجھے صحرا میں ایک جھونپڑا دیدو کہ صبح و شام گاؤں کی طرف مویشیوں کی آمد و رفت دیکھا کروں۔ اور چرواہے کی بانسری کی آواز سن کر مست ہو جایا کروں۔ مجھے ان محلات میں نہ لے جاؤ جہاں کے دولت مند بکیں زندہ ہیں۔ جہاں عیش و عشرت کی مجلسیں گرم ہیں۔ بلکہ مجھے موقع دو کہ میں ایک شکستہ و غیر آباد ایوان کی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے سایہ میں ایک گھنٹہ فرش خاک پر بیٹھ جاؤں۔ اور یہی وہ مذاق طبیعت تھا جو مجھکو کشاں کشاں خلد آباد لے گیا۔ جسکو برہان الدین اولیا کی آرامگاہ اور عالمگیر کی خوابگاہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔

بندگی آداب عرض کورنش مجرا حضور
آرزو آنے کی یاں مدت سے دامنگیر تھی

آہ نہ پوچھئے شکستہ عمارات کا ایک سلسلہ دیکھکر دل پر کیا اثر ہوا۔ حیرت ہوتی ہے کہ روز لوگ انہیں دیکھتے ہیں اور پھر بھی زندہ ہیں۔ ایک ایک اینٹ بجائے خود ایک مفصل تاریخ اور داستان ہے۔ لیکن اب نہ اس تاریخ کے دیکھنے والے ہیں اور نہ اس داستان کے سننے والے ہیں۔

اے آسودگانِ خاک! ہمیں نہیں معلوم تم کس عالم میں ہو۔ اور تمہاری زندگی جسے اب صرف ایک طویل اور خاموش رات کہنا چاہئے کسطرح گذرتی ہے۔ لیکن ہاں اسقدر ضرور جانتے ہیں کہ تم جس حالت میں بھی ہو بہتر ہو۔ اور ہماری زندگی مہمل اور بے معنی ہے۔ اور تمہاری موت ہمارے لئے سامانِ فکر و عبرت ہے۔ ہم جینے پر مرتے ہیں اور تم مرنے کے بعد بھی جیتے ہو۔ لوگ تم سے شکایت کرتے ہیں کہ تم بولتے نہیں۔ خدا جانے ہماری سنتے ہو یا نہیں۔ لیکن میں یہ شکوہ تم سے نہیں کرتا کیونکہ حقیقتاً میرے لئے اگر تم میں کوئی شے قابلِ قدر ہے تو وہ تمہاری خاموشی ہے۔ لاکھ کوئی چیخے روئے سر دھنے مگر تم اس سے متاثر ہوتے نظر نہیں آتے۔ آہ! معلوم ہوتا ہے کہ تم میں ملکوتی استغنا ہے اور تمہیں کسی کی پروا نہیں۔

یہ خیالات لئے ہوئے میں مقابر و مزارات سے گذرا اور اس مقام پر پہنچا جہاں جاتے ہوئے حقیقتاً میرا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ ایک مقدس ہستی کے حضور میں ایک بدترین وجود کا نیاز۔ نور کے سامنے ظلمت کی جسارت۔ کیسا حیرت ناک منظر تھا۔ بہرحال میں کسی نہ کسی طرح ڈرتے ڈرتے گیا اور پائیں مزار کھڑا ہوگیا۔

میں نہ صاحب مراقبہ ہوں اور نہ مجھ میں حس باطن کہ وہاں کا عالم سمجھ سکتا۔ لیکن ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ایک غیر معلوم کیفیت تھی ایک مجہول حال تھا جس سے میں متاثر ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ جہاں ایسا برگزیدہ وجود آرام کر رہا ہو۔ اور جہاں خدا معلوم اور کتنی مقدس و محترم روحوں کا نشیمن ہے۔ میں کیونکر آنے پایا۔ بے اختیار وہاں سے دبے پاؤں چلے آنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور چلا۔ لیکن چند قدم چلا ہوں گا کہ کسی نے کہا کہ یہی شہنشاہ عالمگیر کا مزار ہے

میں دفعتہً چونک پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مرحوم کے مزار پر حسرت ٹپک رہی ہے۔ اور اس غضب کی سادگی تھی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔

معلوم ہوا کہ مرحوم کی وصیت تھی کہ میری قبر آراستہ نہ کی جائے۔ پاؤں پھیلا کر داتا خاک پر سوتا ہے کیوں ؛ ہند سے لے تا دکن چلتی تری شمشیر تھی۔

ہائے افسوس! مسلمان: زندہ درگور مسلمان۔ مجھے سخت افسوس ہوا کہ ایسے جلیل القدر اور شریعت پناہ بادشاہ پر مورخین کیوں الزام لگا رہے ہیں۔ کیا انہیں حشر میں خدا کو منہ نہیں دکھلانا ہے۔ ان کا حال برا ہو گا۔

ابھی میری ناقص زبان سے یہ چند فقرے ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ جسم لرزنے لگا ایک رعب چھا گیا اور ایک ناقابل بیان کیفیت طاری ہو گئی ہر قدم پر دل دھڑکتا تھا۔ ہیبت شاہی کی ابتک اسقدر تاثیر تھی کہ فاتحہ پڑھا گستاخی اور بے ادبی کی معافی چاہی اور مکان پر واپس آیا۔ مگر ابتک وہ سماں میری نظروں کے سامنے ہے۔

ہندوستان میں کوکین کس طرح آئی

اخبار علمیہ

۱۸۷۰ء میں تعلیم کیو سے کوکین کے پودے سیلون میں لائے گئے۔ ۱۸۸۶ء میں مدراس کی ایک زراعتی کمیٹی میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ کوکا کی کاشت ہندوستان میں اچھے پیمانہ پر شروع کر دینی چاہئے کیونکہ اس چیز کی تجارت میں روز افزوں ترقی ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس کی ضرورت بھی اور بڑھے لیکن ۱۸۸۸ء تک۔ اس تجویز پر کوئی عمل درآمد نہ ہو سکا۔ اسی زمانہ میں دوا کے لئے مفید ہونے کی وجہ سے کوکین کی پتیوں کی مانگ بہت بڑھی۔ اور اس وقت اس زراعتی کمیٹی نے کلکتہ کے باغیچہ سے اس کے متعدد پودے لیکر ہندوستان کے مختلف حصوں میں کاشت کے لئے تقسیم کر دئے۔ اب گورنمنٹ نے بھی اس طرف توجہ کی۔ دوا سے کام آنے کے متعلق امر تم سے تمام معلومات بہم پہونچائیں۔

کوکین اگرچہ ہندوستان میں صرف اس غرض سے لائی گئی تھی کہ نہایت احتیاط سے ایک محدود دائرہ میں اس کی کاشت کی جائیگی اور اس کی تجارت پر حکومت کی سخت نگرانی رہیگی۔ لیکن چونکہ اس کے پودے ہندوستان کے مختلف حصوں میں شروع شروع میں تقسیم کر دئے گئے تھے تاکہ تجربہ کیا جائے کہ کس مقام کی آب و ہوا اس پودے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے اس کی کاشت اور تجارت پر پورا قبضہ نہ رہ سکا۔ اور اس کا استعمال عام ہو گیا چنانچہ آئے دن اس قسم کی گرفتاریاں اور مقدمات ہوتے رہتے ہیں جو صرف کوکین کی ناجائز تجارت سے پیدا ہوتے ہیں۔

دنیا کے قدیم ترین باشندے

اخبار علمیہ

آسٹریلیا کے اصلی باشندے دنیا کی قدیم ترین قوموں میں سے ہیں۔ خصوصاً بالکل شمالی حصہ جسے جزیرہ نمائے کیپ یارک کہتے ہیں ان لوگوں سے آباد ہے جو یہاں کے تمام باشندوں سے قدیم ہیں۔ وہ دنیا کی قدیم ترین قوم کے افراد ہیں جن کے وجود کا پتہ گذشتہ دس ہزار سالوں تک چلتا ہے۔

آسٹریلیا کے اس حصہ میں اب تک بہت کم لوگ پہونچ سکے ہیں اور اس لئے وہاں کے باشندوں کے

حالات بخوبی نہیں معلوم ہو سکے۔ حال ہی میں مسٹر میکلارن نے اس خطۂ زمین کی سیاحت کے حالات ایک کتاب کی صورت میں شائع کئے ہیں۔ یہ پہلے انگریز ہیں جنہیں اس ملک ۱۸۸۳ میں قوم میں کچھ عرصہ زندگی بسر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ یہاں کے باشندے اس درجہ وحشی ہیں کہ شروع شروع میں کچھ عرصہ تک تو مجھے ہر وقت مسلح رہنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ رات کے وقت بھی میں اپنا ریوالور ساتھ رکھ کر سوتا تھا۔

آگے چلکر وہ لکھتے ہیں کہ جنگل کی جڑی بوٹیوں کی مخفی قوتوں کی عظیم الشان اور بیشمار معلومات جو اس قوم کو ہے غالباً دنیا کے کسی اور حصہ میں نہیں ہے۔ معمولی مرض بخار سے لیکر مشکل سے مشکل مرض کا علاج یہ لوگ ان ہی خس و خاشاک سے نہایت حیرتناک کامیابی کے ساتھ کر لیتے ہیں۔ ان کی طبیعت بیحد تربیت پذیر ہے۔ کوئی بات جو ایک دفعہ دکھا یا بتا دی جائے ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کی ایک خاص زبان ہے جسمیں وہ بلا تکلف ہر قسم کے خیالات کا اظہار کر لیتے ہیں تاہم پیغام رسانی کے عجیب و غریب طریقے انہیں معلوم ہیں۔ چنانچہ دھوئیں کے ذریعہ خبر پہونچانا جو آجکل جنگلی دنیا میں ایک معمولی بات ہے پہلے پہل یہیں دیکھا گیا۔ وہ خشک لکڑیاں جمع کر کے دھواں پیدا کرتے ہیں اور اسے مختلف طریقوں پر بلند کر کے دور دراز کے مقامات پر خبریں پہونچا دیتے ہیں۔

مسٹر میکلارن لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے گورنمنٹ ریزیڈنٹ سے سفارش کر کے ان لوگوں کے لئے کچھ کمبل منگائے۔ اور سبھوں کو جمع کر کے ایک مختصر سی تقریر کی جسمیں انہیں بتایا کہ تمہیں اس گورنمنٹ کا بہت مشکور رہنا چاہئے جس نے تمہیں کمبل جیسی کارآمد اور آرام دہ شے عنایت فرمائی ہے پھر ایک ایک تقسیم کر دیا۔ اس روز تو سب کمبل لیکر چلے گئے لیکن دوسرے ہی روز آکر شکایت کی کہ وہ بدن میں چبھتا ہے اور بالکل ناقابل استعمال ہے۔ چنانچہ پھر اس روز سے کبھی کسی نے اس کمبل کو نہ بچھایا۔ بلکہ جھونپڑوں کی چھتوں پر بجائے کھپریل کے چھا دیا۔

معلومات

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ دنیا میں ہر سال چار کروڑ سے زائد بچے پیدا ہوتے ہیں ۔

ایک نئے قسم کے ریشمی موزے اس ترکیب سے بنائے گئے ہیں کہ ان پر پانی یا کیچڑ کا اثر

لندن میں ایک اتنی بڑی گھڑی بنائی جا رہی ہے کہ صرف اس کی سوئیوں کا وزن نصف ٹن ہے منٹ کی سوئی کا طول پندرہ فٹ ہے ۔

گھوڑے کی بہ نسبت ایک آدمی میں ۱/۱۰ یا ۱/۴ قوت ہوتی ہے ۔ بیل میں ۲/۳ اور ۱/۲ خچر میں

دنیا میں تقریباً ایک ہزار سے زیادہ مختلف اقسام کے سیب پیدا ہوتے ہیں لیکن ان میں سے ایک سو قسم کے تجارت کے کام آتے ہیں ۔

آسٹریلیا میں جتنا ٹیکس ادا کیا جاتا ہے اس کا اوسط ۱۳ پونڈ ۸ شلنگ ۲ پنس فی کس پڑتا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۱۳ پونڈ ۶ شلنگ ۶ پنس کناڈا میں ۱۲ پونڈ ۴ شلنگ ۲ پنس اور انگلستان میں ۱۹ پونڈ ۸ شلنگ ۲ پنس ۔

دیوار پر کاغذ لگانے کا دستور پہلے پہل چین سے شروع ہوا ۔ جسے ۲ ہزار برس گذر چکے ۔

تپ دق کے مریضوں کے لئے ڈاکٹر رچرڈ نامی سائنس داں نے ایک خاص قسم کے گراموفون ر

ایجاد کئے ہیں جو مریض کے دل کی ہر حرکت کو جذب کر لیتا ہے اور استعمال کے وقت تمام کیفیت جوں کی توں سنا دیتا ہے۔ اس ایجاد سے یہ فائدہ ہوگا کہ ایک ملک کے مریض کے صحیح حالات دوسرے ملک کے حاذق طبیبوں اور ماہر ڈاکٹروں تک بغرض معالجہ بھیجے جا سکیں گے۔

انگلستان کے ایک باشندے کا کبوتر فرانس میں گم ہو گیا۔ اور تین سال ۹ مہینے غائب رہنے کے بعد وہ پھر انگلستان پہونچ گیا ہے۔

دودھ کشادہ برتن کی بہ نسبت تنگ برتن میں جلد خراب ہو جاتا ہے۔

انگلستان میں سب سے اونچا پانی کا ٹینک (تالاب) بنایا جا رہا ہے جس کی اونچائی ۱۵۵ فٹ ہوگی اس میں ..... گیلن پانی آئیگا اور اس کا وزن ... ٹن ہوگا۔

انڈا اوزن کے بعد اگر پانی میں ڈال کر کسی ٹھنڈی جگہ رکھا جائے تو ایک روز تک خراب نہ ہوگا

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اگر لندن کا تمام کوڑا سائنس کے اصولوں پر جلایا جائے تو اس سے ہر سال ...... پونڈ برقی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔

بچپن کی شادی

ہر ملک اور ہر قوم میں کچھ ایسی خرابیاں ضرور ہوتی ہیں جو اس کے باعث ننگ خیال کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی چند ایسے بُرے رسوم و رواج ہیں جنہیں اہل ہند اپنے لئے باعث ننگ تصور کرتے ہیں۔ منجملہ ان کے "بچپن کی شادی" بھی ہے۔ اگرچہ اس خرابی کا رواج عموماً ہندوؤں میں ہے لیکن جو چیز ملک کے لئے ننگ ہے وہ ہر قوم کے لئے اور ہر شخص کے لئے ننگ ہے۔ حال ہی میں اس خرابی کے انسداد کے متعلق مہاتما گاندھی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے بچپن کی شادی کے نقصانات بتلاتے ہوئے اس قانون کا ذکر کیا ہے جو شادی کی عمر کے متعلق بننے والا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ میں ان معاملات میں "قانونی بندشوں" کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا کیونکہ اس رسم کا تعلق ہر شخص سے ہے اور جب تک کہ ملک کے ہر شخص کے خیالات اس رسم کے متعلق درست نہ ہو جائیں گے قانونی بندش بیکار ہے۔ ضرورت ہے کہ اہل ملک ان باتوں کو سمجھنے اور عمل کرنے کی کوشش کریں اور وہ تمام رسوم ترک کر دیں جو قوم و ملک کے لئے باعث ننگ ہیں۔

عقد بیوگان

بچپن کی شادی کی طرح یہ مسئلہ بھی ہندوستان کے لئے باعث شرم ہے۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی بیوہ عورتوں بلکہ لڑکیوں کو گھروں میں بٹھا رکھنا شروع کیا۔ اگرچہ اس کے انسداد کے لئے کافی جد و جہد کی جا چکی ہے لیکن نتیجہ اس وقت تک خاطر خواہ نہیں نکلا ہے۔ گھر اور گھرانوں کا ذکر چھوڑ دیجئے مسلمانوں میں بہت سے فرقے ایسے موجود ہیں جنہیں آج بھی یہ رسم اسی طرح جاری ہے حالانکہ ہندوؤں نے اس بات میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ ذیل کے اعداد و شمار جو "ودھوا ویواہ" کے سکریٹری کی رپورٹ سے لئے گئے ہیں بتلاتے ہیں کہ ان کی کوششیں ناکام نہیں رہیں۔ یہ ان بیوگان کی صوبہ وار تعداد ہے جن کی دوسری شادیاں کی گئیں۔ پنجاب - ۱۱۲۲ - سندھ ۴۰ - دہلی ۵۱ - یوپی - ۳۵۰ بنگال ۶۴ - مدراس ۷ - بمبئی ۵ - ممالک متوسط ۸ - آسام ۵ - بہار و اڑیسہ ۱۲ - جملہ ۱۶۰۹ -



دو چيز از بزم ميخواران پسند آمد مرا صائب – زپا افتادن ساقي بسر غلطيدن مينا !



اَدبستان

جلد ۱	ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء عیسوی	نمبر ۱

فہرست مضامین

بزم ادب

(آغاز)

بنام جہاندار جاں آفریں
حکیم سخن در زباں آفریں

الحمد اللہ کہ "ادبستان" کا پہلا پرچہ ناظرین کے سامنے پیش ہے۔ یہ تعبیر ہے اس "خواب پریشاں" کی جسے "دیدۂ دل" و "چشم دماغ" عرصہ سے دیکھ رہے تھے۔ یہ بسم اللہ ہے اس "طفل دل" کی جس نے "امیدوں" کی آغوش میں پرورش پائی اور "ارمانوں" کے دامن میں کھیلا یعنی یہ اس "تعبیر" کا "سنگ بنیاد" ہے جسے "ذوق سلیم" کی جولانگاہ بنانے میں ہر امکانی کوشش سرگرم کار ہے۔

اگرچہ اس "علمی وادبی رسالہ" کو صحیح معنوں میں "علمی وادبی" اور "ادبستان" کو درحقیقت "ادبستان" بنانے میں کوئی کوشش فروگذاشت نہیں کی گئی ہے تاہم ہمیں اعتراف ہے کہ اہل نظر کو اس میں بہت کچھ خامیاں نظر آئینگی اور امید ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے گرانقدر مشوروں سے سرفراز فرماتے رہیں گے۔

مقام مسرت ہے کہ ابنائے وطن اردو کی طرف خاص دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں اور اس کی ترویج واشاعت میں کوشاں ہیں۔ ملک کی موجودہ حالت کا اگر گذشتہ چند سالوں سے مقابلہ کیا جائے تو ایک نمایاں فرق نظر آئیگا۔ اس وقت ہندوستان کے تقریباً ہر گوشہ سے کوئی نہ کوئی اردو رسالہ نکل رہا ہے اور آئے دن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس حیثیت سے ملک نے جتنی ترقی کی ہے اقتصادی حیثیت سے اتنا ہی (بلکہ اس سے زیادہ) تنزل ہوا ہے جیسا بقول حضرت اکبر الہ آبادی نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہو۔۔

Munir Barodvi.

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر ہم نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

تو افکار زمانہ سے کسے فرصت جو اس طرف توجہ کرے۔ ہر شخص پریشانی روزگار کا شکار۔ تن پروری کی فکر میں مبتلا نظر آتا ہے۔ دوسری طرف اخبارات و رسائل کی تعداد اعتدال سے متجاوز ہو چکی ہے۔ قوم میں جہل و غلسی کا دور دورہ۔ پھر ان کی قدر کون کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر معاصر "راہ ادب" سے بھٹک کر "راہ عدم" کو سدھاتے ہیں۔ چنانچہ ہر نئے اخبار یا رسالہ کے متعلق اب یہ ایک عام خیال ہو گیا ہے کہ "دیکھئے! کے روز چلتا ہے" اور اس میں شک نہیں کہ اس خیال میں حقیقت کو ایک بڑی حد تک دخل ہے۔

ان حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے اس وقت ملک میں جتنے پرچے موجود ہیں نہایت غنیمت ہیں اور ان میں ہر ایک کسی نہ کسی خاص مقصد کی تکمیل کر رہا ہے۔ اب ان میں بحالات موجودہ کسی اضافہ کی گنجائش یا ضرورت نہیں معلوم ہوتی لیکن "ادبستان" کا اجرا جن واقعات اور اغراض کے ماتحت ہو رہا ہے وہ اس کے وجود کے متقاضی تھے۔

"انجمن معین الادب" جس کا یہ رسالہ ماہوار آرگن ہے ایک "علمی مجلس" کی حیثیت سے محض "اردو کی خدمت" کے لئے ظہور میں آئی۔ انجمن کو "ادبستان" کے اجرا سے کوئی فائدہ مقصود نہیں۔ بلکہ صرف "خدمت زبان" اس کا کافی صلہ ہے۔

"ادبستان" کی زندگی کا مقصد خاص یہ ہے کہ اردو کو ملک کی دوسری زبانوں سے "روشناس" کرایا جائے دیگر ہموطن زبانوں کے "کمالات" کا مشاہدہ کیا جائے۔ ان کے اہل علم حضرات کے "جذبات و تخیلات" کا اندازہ لگایا جائے۔ ان کے "سورماؤں" کے دم خم آزمائے جائیں۔ اور بجائے اس کے کہ ہم سات سمندر پار کی زبان کے "سرمایۂ ناز" کو اپنے لئے "باعث فخر" سمجھیں۔ اپنے ہی دیس کی زبانوں سے رشتۂ ارتباط قائم کریں اور ان سے مستفید ہونے کی کوشش کریں۔

علاقہ بمبئی چونکہ مرہٹی اور گجراتی زبانوں کا گہوارہ ہے اور عام طور پر یہی دو زبانیں یہاں رائج ہیں اس لئے ہم پہلے انہیں دونوں زبانوں کے "سرمایہ" کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

"ادبستان" کی پالیسی کے متعلق ہم صرف اس قدر عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ سوائے ان مضامین کے جو قابل اعتراض باتوں یا ذاتیات سے لبریز ہوں۔ اس کے صفحات ہر قسم مضامین کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ البتہ اس حد تک نہیں کہ یہ لوگوں کے تالیف قلوب کا ذریعہ بن جائے۔

ہم ان تمام حضرات کے شکر گزار ہیں جنہوں نے ہمیں "پیشگی" مضامین عنایت فرمائے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا قمر احمد صاحب مولانا وحید الدین صاحب سلیم۔ راجہ غلام حیدر خانصاحب مولانا اکبر ترمذی، مولانا محمود اسرائیلی اور مسٹر سلیم الحق صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حصۂ "نسائیات" میں ریحانہ خاتون صاحبہ عباسی اور ع۔ص۔ صاحبہ کے مضامین اعلےٰ اور مفید ہیں۔ فرمودہ بیگم صاحبہ کی لغت بھی خوب ہے۔ ہم ان بہنوں کے ممنون ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ حضرات اور ملک کے دیگر اہل علم حضرات ہماری امداد سے گریز نہ فرمائیں گے اور یہ سلسلۂ "عنایات" ہمیشہ جاری رکھیں گے۔

مجھے اپنی بے مائگی اور ہیچمدانی کا اعتراف ہے اور "ادبستان" کے اعلےٰ معیار کو دیکھتے ہوئے اپنے کو اس کے "مرتب" ہونے کا کسی طرح اہل نہیں پاتا۔ لیکن احباب کی "کرم گستری" سے یارائے "محرومی" کہاں؟

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

یاران دیرینہ کی نظر انتخاب کو کیا کہا جائے۔ کاش احباب انجمن معین الادب اس رسالہ کے لئے کسی بہتر "ایڈیٹر" کی تلاش کرتے۔

بہر حال میں اراکین انجمن کا مشکور ہوں۔ جنہوں نے "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" کی مصداق اس اہم کام کی ذمہ داری میرے کمزور ہاتھوں پر رکھی ہے۔ خدا اس کا اہل ہونے کی

توفیق بخشے ۔ آمین ۔

اس رسالہ کے نظام و ترتیب میں جناب منیر الہ آبادی اور خلیل احمد صاحب سیکروی ہمیرے شریک کار رہیں۔ ان میں سے اوّل الذکر ایک کامیاب شاعر اور ادیب ہیں اور ثانی الذکر ایک قابل نثار ۔ ناظرین ان کے مضامین میں نُدرتِ خیال و نُدرتِ زبان دونوں پائیں گے ۔

دور حاضر کی دوشیزہ

(از منیر الہ آبادی)

تم کیا ہو؟ کھلونا ہو۔ نادان سی ناری ہو
اک پیکر عصمت ہو۔ دوشیزہ ہو۔ کنواری ہو
تم حسن کی سیتا ہو۔ تم عشق کی رادھا ہو
اس پاپ کی دنیا میں معصوم سراپا ہو
اس دور پہ عالم کی برکات برستی ہیں
اس عمر کو دنیا کی عورات ترستی ہیں!

اک حال پہ کب قائم افسوس زمانہ ہے
کہتے ہیں تبھا جس کو اک غم کا فسانہ ہے!
آغاز جوانی کو انجام سے کیا نسبت؟
دوشیزۂ کمسن کو آلام سے کیا نسبت؟
تشویش ہے کیا تم کو؟ کس غم میں پڑی ہو تم؟
کیوں؟ منہ سے تو کچھ بولو! خاموش کھڑی ہو تم



دور حاضرہ کی دو شیزہ



مسٹر فالیے

یہ سرخ لبِ نازک مرجھائے ہوئے کیوں ہیں؟
یہ پھول سے رخسار کملائے ہوئے کیوں ہیں
حیرت میں شجر بھی ہیں سکتے میں صبا بھی ہے
چپ دیکھ کے یوں تم کو خاموش فضا بھی ہے
یہ ریگِ بیاباں کے ذرے جو چمکتے ہیں!
حسرت بھری آنکھوں سے صورت تری تکتے ہیں
تم میں نہیں وہ مستی تم میں نہیں الھڑپن
تم میں نہیں وہ شوخی جس میں ہو چھپا بچپن
خود بیں ہو! بناوٹ میں ممتاز ہو عورت سے
فیشن کی طلب میں تم آزاد ہو غیرت سے
ہر دل کو یہ حسرت ہے۔ بے جان کیا جاؤں
ہاتھوں سے تمہارے میں قربان کیا جاؤں
مست مئے الفت ہو۔ مخمور جوانی ہو!
سب کچھ ہو۔ مگر سن لو! اک پیکرِ فانی ہو

مغرور ہے بیڈر۔ ہے اوصاف سے خالی ہے
اس دور کی دوشیزہ۔ دنیا سے نرالی ہے

مقالات

محسن فالکے

(از خلیل احمد سیکر ودی)

یوں تو سرزمین ہند کے تعلیم یافتہ طبقے سے کبھی نہ کبھی چند اشخاص مغربی دنیا میں جا کر تکمیل علم کی ڈگریاں لیکر سائنس کے نئے کرشمہ دیکھکر منطق وفلسفہ پر عبور پا کر ہند کو لوٹے۔ بمبئی۔ کراچی۔ کلکتہ۔ مدراس کے ساحلوں پر سینکڑوں ہندیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا ترقی کی بہت سی امیدیں آنیوالوں سے وابستہ کی گئیں۔ لیکن سوائے مایوسی کے کچھ نہ ہاتھ آیا۔ کیونکہ ساحل پر اترتے ہی پیٹ پالنے کی فکر نے وہ سب جوش وخروش جو مغربی دنیا سے لیکر آئے ٹھنڈا کر دیا۔ ملازمت کی رسی کا تنگ پھندا گلے میں ڈالدیا۔

مغربی دنیا سے واپس آنیوالی ایسی بے لوث ہستیاں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں جنہوں نے ملک وقوم کو اپنی محنت وذہانت کا سبق اپنے وسیع تجربات سے دیا ہو اور بہتری وترقی کے خوش آیند راستوں میں رہبری کا کام کیا ہو۔ اس محدود تعداد کے زمرہ میں مسٹر فالکے کا جو خاموش سفر یورپ کو ہوا اور خاموش واپسی پر ہندوستان کو ایک محسن ہونے کا ثبوت دیا۔ اس کا ثبوت ہمیشہ نئے روپ میں نظر آتا ہے اور آئندہ طبع آزمائی کے نئے نئے جوہر دکھایا کریگا۔

مسٹر فالکے جب یورپ کی سیاحت کو گئے اور امریکہ جا کر فلم کی ترقیوں کے مدارج طے کئے تو ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اپنے وطن میں اس ہنر کو جاری کیا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی سیر وتفریح کو چھوڑ فلم کی فوٹو گرافی کا کام نہایت شوق ودلچسپی سے سیکھنا شروع کر دیا۔ اور بہت جلد فوٹو گرافی کا کام سیکھ کر فلم کمپنی جاری کرنے کے شوق میں ہندوستان واپس ہوئے یہاں آ کر فلم کمپنی کے لئے سامان مہیا کرنے کی دھن میں لگ گئے۔ لیکن شروع شروع بہت سی مشکلات کا سامنا ہوا۔

کیوں ؟

دنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر انسان کو کسی فعل کی ابتدا میں کم یا زیادہ
زمانہ کا سرد و گرم دیکھنا پڑتا ہے۔ اور مبتدی کے مقابل کوئی نہ
کوئی چیز مخالف ہی بن بیٹھتی ہے مگر تائید غیبی کی امداد سے کسی
نہ کسی طرح مصائب و مشکلات سے چھٹکارا مل ہی جاتا ہے۔

اوّل اوّل مسٹر فالکے کو جو مشکل درپیش ہوئی وہ کافی سرمایہ کا فقدان تھا۔ اس لئے انہوں نے اخلاص کی نگاہ کو ہر چہار طرف دوڑایا آخر کار ان کی نگاہ ملک کے اس مایۂ ناز سردار پر پڑی جو ہندوستان کا لعل بے بہا تھا۔ یعنی آپنے اپنا ارادہ تلک مہاراج سے ظاہر کیا۔ تلک مہاراج نے ان کی ہمت افزائی کی۔ اور اس کا نجک کارزمانہ کا سرمایہ جو کہ آجکل نئے گاؤں میں واقع ہے مرحمت کرنے کا وعدہ کیا لیکن یہ معلوم ہونے پر کہ مسٹر فالکے صرف فلم کی فوٹو گرافی ہی سے واقف ہیں اور اس کا وہ مصالحہ جس سے (Nagative) اور Positive طیار کیا جاتا ہے نابلد ہیں امداد کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ تلک مہاراج اس کے خلاف تھے کہ اپنے معاملات کو کبھی دوسرے کے سہارے پر شروع کیا جائے۔

مسٹر فالکے فلم کمپنی جاری کرنے کے خیال میں متوالے ہو رہے تھے۔ ہراساں نہ ہوئے بلکہ ہمت و محنت کا دامن پکڑے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار بمبئی کے متمول سوداگر مسٹر ناڈکرنی کیا اس متمول سوداگر نے ان کے خیالات سنکر نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ فوراً ایک کافی رقم فلم کمپنی جاری کرنے کے لئے عطا کی۔ مسٹر فالکے نے ہندوستان فلم کمپنی کے نام سے ایک کمپنی انشیور کا نام لیکر جاری کر دیا۔ فلم سینما کی بنیادی اینٹ بمبئی میں رکھدی گئی۔ آرزوں کی وہ دنیا جو امریکہ سے اپنے دماغ میں چھپا کر لائے تھے بسنی شروع ہو گئی۔ فلم کمپنی کے لئے ترقی کی راہیں کھلتی چلی گئیں اور خام رکاوٹیں سیل فنا کی طرح نیست و نابود ہونے لگیں۔ فلم کے متوالے نے اپنی لگاتار محنت سے پہلی فلم جو طیار کی وہ ہریشچندر فلم تھی۔ باشندگان بمبئی نے ان کی

اس محنت کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔
ہرشچندر فلم نکالنے کے بعد کالیا مردن۔ اور کرشن جنم یکے بعد دیگرے دو فلم طیار کیں ان فلموں میں مسٹر فالکے کی لڑکی نے کرشن کا پارٹ اس خوبی سے ادا کیا کہ دیکھنے والے حیرت میں رہ گئے کہ اس ذرا سی جان میں یہ بلا کی سنجیدگی۔ ان دونوں فلموں میں جو فوٹو گرافی مسٹر فالکے نے کی آج اس کی نظیر نہیں ملتی جو حیرت انگیز (Trick Scene) ان دونوں فلموں میں دکھائے آجتک یورپ حیران ہے اور اس سے زیادہ یورپ بھی نہ دکھا سکا۔
آج کل ہندوستان فلم کمپنی ناسک میں ہے۔ مسٹر فالکے فوٹو گرافی کا کام انجام دیتے ہیں۔ ان کے خیالات نہایت اعلےٰ و افضل ہیں یعنی وہ ہر اس شخص کو جو فلم کمپنی کا معمولی سے معمولی ملازم ہو فوٹو گرافی سکھانا اپنی زندگی کا بہترین مقصد خیال کرتے ہیں۔ غرضکہ مسٹر فالکے کی بے لوث زندگی یورپ کی سیر کرنے والوں کے لئے ایک سبق اور وطن کے لئے ایک محسن کا ثبوت ہے۔ فلم کمپنیوں کے اکھاڑے کے پہلے مشہور پہلوان فلم کے بانی اول ہندوستان میں مسٹر فالکے ہیں۔

ملزم (جو فریب دہی کے جرم میں ماخوذ تھا) حضور! میں تو دستخط بھی نہیں کرسکتا۔
مجسٹریٹ۔ درست۔ لیکن تم اس جرم میں ماخوذ نہیں ہو۔
طلب کرو۔ میں کچھ نہ کرسکونگا۔

عورت۔ دیکھو وہ موہن جارہا ہے۔ بڑا ہی چاپلوس آدمی ہے۔
مرد۔ کیا اس نے تمہارے حسن کی تعریف کی۔
عورت۔ نہیں۔ تمہارے حسن کی۔

کویل

(از مولانا محمود اسرائیلی رکن ادارت ہمدرد دہلی)

اے زینتِ بہار
اے جانِ کوہسار
اے حسنِ لالہ زار!
فطرت کے رازدار
اے موسمِ بہار کے قاصد کہاں ہے تو؟
اے مطربِ چمن!!
گر تو ہو نغمہ زن!!
ہر شاخِ گلبدن
چومے ترا دہن!!
اے موسمِ بہار کے قاصد کہاں ہے تو؟
ہر برگِ جاں فزا
ہو جھومتا ہوا!!
ہو رقص میں صبا!!
سن کر تری صدا!
اے موسمِ بہار کے قاصد کہاں ہے تو؟
گلشن ہے پُر فضا!
ہر گل میں ہے ادا!!
اور چھائی ہے گھٹا!
نغمہ کوئی سنا!!
اے موسمِ بہار کے قاصد کہاں ہے تو؟

"ترکی مناظر نمبر ۹"

شیخ فاضل کی نمکحرامی (غداری)

(مترجمہ محمد سلیم الحق صاحب حقی دہلوی بی۔ اے علیگ)

مگا در سٹرک پر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ بیسیوں مرد، عجیب عجیب وضع کا لباس پہنے اس شاندار رنگین مکان میں داخل ہو رہے تھے جو کہنے کو تو الجیریا و تیونس کے پیرس وارد طلباء کے آرام و استفادہ کی غرض سے قائم تھا۔ لیکن واقعتاً جمہوریت فرانس کے "دفتر عربیہ" کا صدر دفتر تھا۔ یہ دفتر شہنشاہیت پسند فرانسیسیوں کی اختراع تھا۔ جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی طرح مشرقی وسطی عرب میں ترکوں کا زور اور اقتدار گھٹا کر فرانس کے "پرامن داخلہ" کے لئے راستہ صاف کر لیا جائے۔ تاکہ کچھ عرصہ بعد یہ جمہوریت تمام عربی داں ممالک پر قابض و متصرف ہو کر بحیرہ روم میں ہر طرف پھیل جائے۔ یہ تجویز بلاشبہ نہایت درجہ حریصانہ تھی، لیکن چونکہ بفضلہ تعالیٰ فرانس مغربی اور شمالی افریقہ میں مقبوضات حاصل کرنے میں معقول کامیابی حاصل کر چکا تھا اس لئے ازمنۂ ماضی و حال کی نہایت زبردست شاہی طاقتوں کا رقیب بننے، اور ان جیسی عظمت و شان حاصل کرنے کا خیال، فرانس کے دل میں بھی گدگدیاں پیدا کرنے لگا تھا۔

آج کا مجمع زیادہ تر عرب نژاد افراد پر مشتمل تھا، تاہم متعدد فرانسیسی، الجیروی، اور کچھ نوعمر یوروپی لباس میں ملبوس نوجوان بھی، جو بلاتکلف شستہ عربی بول سکتے تھے اس جلسہ میں شریک دکھائی دیتے تھے۔ مقررہ وقت پر نقیب عذوری تقریرگاہ پر چڑھا اور اس نے نجم بستانی کا نام جلسہ کی صدارت کے لئے پیش کیا۔ نجم بستانی جو تقریباً ساٹھ سال کا تھا اور نگاہوں سے علوم

ہوتا تھا کہ بڑا عالم و فاضل شخص ہے۔ تقریر گاہ پر پہنچا اور کچھ دیر بعد اس نے یہ اعلان کیا کہ آج پان عربک (معاونِ اعراب) کانفرنس کا افتتاح ہوتا ہے۔ اس نے تمام عربی داں ممالک کے نام پڑھ کر سنائے اور بتایا کہ مصر، عراق، فلسطین اور شام کے نمائندے شریک جلسہ ہیں۔ ایک کثیر تعداد ان نمائندوں کی بھی تھی جو امریکہ میں بود و باش رکھنے والے عربوں کی طرف سے آئے تھے۔ اور فرانسیسی افریقی مقبوضات سے بھی ایک زبردست گروہ آ کر ان سب میں شامل ہو گیا تھا۔ پچھلی کرسیوں پر محکمۂ خارجہ کمیشن کے متعدد فرانسیسی افسر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر ظاہر تھا کہ دراصل اس جلسہ کی روحِ رواں اور کارکنانِ جلسہ کو تگنی کا ناچ نچانے والے یہی چند افسر تھے۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے بستانی نے ایک طویل تقریر کی جس میں اس نے عربوں کی شاندار فتوحات اور میدانِ علم و ادب و سائنس اور فنونِ حرب و عمرانیات میں ان کی عظمت و کامرانی کا تفصیل وار ذکر کیا۔ اس نے بتایا کہ "عرب کوئی مخلوط قوم نہیں بلکہ وہ ایک متحد و مجتمع قوم ہے۔ اور با ہمدگر متفق و متحد ہو کر اپنی حکومت آپ کر سکتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے ہیں یا دہنیں کہ (یہاں صدرِ جلسہ نے غصہ اور خفگی کا لہجہ اختیار کر لیا) دنیا میں اس سے زیادہ بھی کوئی اور رنج و افسوس کی بات ہو سکتی ہے کہ یہی مقتدر قوم ایک ایسی قوم کے پاؤں تلے روندی جا رہی ہے جسے ترک کہتے ہیں اور جس کے مورثِ اعلیٰ بعض مشہور تاریخی عرب تاجداروں اور ذوی الاقتدار کجکلاہوں کے زرخرید غلام تھے؛ ہم غیر ملکی حکومت کی برداشت کر سکتے ہیں اور اگر عرب قومیت غیر ملکی حکومت ہی کی دلدادہ ہو تو ہم ترکوں کے علاوہ ہر غیر قوم کی حکومت پر صبر و سکون سے کام لے سکتے ہیں! مثلاً —— میں محض آمد سخن کے طور پر کہتا ہوں کہ مثلاً ہم غالباً فرانسیسی حکومت کو پسند کر لیں!" اس فقرہ پر پچھلی صف کے کرسی نشینوں میں سے ایک نے چلّا کر فوراً کہا کہ "کوئی فرانسیسی اس سے زیادہ اور کوئی خواہش نہیں رکھتا کہ آزاد عرب قوم اپنی حکومت آپ کرے!"۔ بستانی نے کہا کہ "ہمیں انجمن اتحاد و ترقی سے بہت کچھ امیدیں تھیں مگر افسوس کہ اس انجمن نے بھی ہمیں مایوس ہی رکھا! ہمیں اصلاحات کے وعدوں پر بہت کچھ بھروسہ تھا لیکن یہ وعدے بھی پورے نہ ہوئے۔ اور شاید کبھی بھی پورے نہ ہوں! "ترک و عرب" مفاہمت جیسی

جسمیں حسب دستور عربوں کا ترکوں کے زیر اثر رہنا تجویز ہوا' ایک بے ضابطہ کارروائی ہے اور اسکا فوری دائمی انسداد ہو جانا ضروری ہے - اب ہماری نظریں (مقرر نے اپنی زبردست تقریر کے خاتمہ پر کہا) فرانس پر لگی ہیں کہ وہ ہمیں ہمارے مقاصد میں کامیاب ہونے میں مدد دے - اور بجائے اس کے کہ ہم کسی غیر سے استمداد کریں' ہم فرانس کی مدد کے طالب ہیں - کیونکہ یہ ملک مساوات آزادی اور اخوت کا زبردست حامی و طرفدار ہے "

یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ مقرر نے محض عمومی باتوں کا ہی تذکرہ کیا - کیونکہ اگر بدقسمتی سے وہ مبہم طور پر بھی الجیریا اور تیونس میں فرانسیسیوں کی ریشہ دوانیوں اور کارگزاریوں کا ذکر کر دیتا تو ابتدا ہی سے اس "معاون اعراب" تحریک میں فتور واقع ہو جاتا - اور بقول کسیکہ "بسم اللہ ہی غلط ہو جاتی - لیکن جائے مسرت ہے کہ مقرر نے ایسا نہیں کیا - اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے اس قسم کا حوالہ دینے کے خطرات سے بخوبی واقف تھا - یہی وجہ تھی کہ اپنی تقریر میں شروع سے آخر تک وہ محض ترکوں کا مذاق اڑاتا رہا اور ان پر فقرے چست کرتا رہا - اس کے علاوہ اس نے کوئی اور بات کسی قسم کی بالکل بیان نہ کی.

ایک اور مقرر بھی تھا جو اس "پان عربک ڈرامہ" میں اسٹیج کی روح رواں تھا یہ شخص بھی [illegible] کی طرح مارونی (نواح لبنان کا باشندہ) تھا - اور اس نے فرانس ہی میں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی اس کا نام نقیب عذدری تھا - اور اس کے خیال میں فرانس منتخب خلائق ملک تھا - جس کی زبان' طور طریقے' [illegible] تہذیب و تمدن سیکھنا گویا انسانی زندگی کا بہترین مقصد تھا - نقیب کے خیال میں فرانسیسی تو [illegible] ایک عمدہ نمونہ تھی - اور ترکی انجمن اتحاد و ترقی گویا اس شرق کی بداصل اولاد تھی - نقیب عذدری [illegible] پرست تھا - اور ترکوں کے خلاف اسقدر زہر اگلنے میں وہ معمولی تہذیب و فہم و فراست کی حد [illegible] تجاوز کر گیا - اس نے بیان کیا کہ " مذہب پرستی تمام مشرقی اقوام پر ایک عذاب الٰہی ہے اور [illegible] لئے بہتر ہوگا کہ وہ ان لوگوں کی جو صرف ایک قسم کے مظالم سے تنگ آ کر دوسری قسم کا عذاب مول لینا چاہتے ہیں ہرگز رو رعایت نہ کریں - ہم انسانی حقوق کے دلدادہ ہیں اور ہم ہرگز ان عرب صاحبان کی [illegible] کو برداشت نہیں کر سکتے - جو آج بھی محض مذہبی نقطۂ نظر سے متحدہ عرب عظمت و جبروت [illegible]

کرنا چاہتے ہیں"۔ عذوری اپنی تقریر میں عربوں کی غیرت و حمیت کو جوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن جوں جوں وہ خود جوش میں آتا جاتا تھا۔ حاضرین زیادہ نفرت اور حقارت سے اس کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ یہ ظاہر تھا کہ مسلمان عرب ہرگز اس صورت حالات کو پسند نہ کریں گے جو فی الوقت اس جلسے میں رونما ہو رہی تھی۔ اس شخص کی تقریر ختم ہوتے ہی تقریباً چھ سات آدمی تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ انہی ساتوں میں بستانی کی نظر شیخ صالح پر پڑی جو شامی مسلمانوں کا نمائندہ بن کر آیا تھا۔ اور فلسطینی اور حجازی بدوا میروں میں بہت معزز و ممتاز تھا۔ بستانی نے شیخ صالح کو اشارہ سے تقریر گاہ پر بلایا اور موخرالذکر نے کہنا شروع کیا "ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم عربوں میں اتفاق و اتحاد قائم رکھیں۔ ہم ترکوں کے محض اس لیے خلاف ہیں کہ وہ ظالم اور جابر ہیں۔ ورنہ ہماری مخالفت کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ ہم مذہبی طرز حکومت کو مٹا کر دنیاوی طرز حکومت قائم کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اگر ہم نے ایسا کیا، یا اگر ہم ایسا کر سکتے ہیں تو ہمیں عربستان کے تمام قدیم و مشہور خاندانوں کے نامور معزز افراد کی امداد سے قطعاً ہاتھ دھو لینے چاہئیں"۔ اس صلح جو معتدلانہ تقریر پر ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین و آفرین بلند ہوئے۔ اور فرانسیسی کمیشن کے ایک نمائندہ نے بعجلت تمام حاضرین کو یقین دلایا کہ کسی شورش و فساد کی کامیابی ہی اس کے ناممکن العمل ہونے کی دلیل ہے محض تقریروں سے کیا نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے۔ شیخ صالح کی تقریر نہایت فاضلانہ اور مدلل تھی۔ اور کانفرنس کے لئے مناسب یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اکثریت کی نظروں میں وقیع بن رہے۔ کیونکہ حقیقتاً یہی لوگ کونسل ف عربوں کی صداقت احتجاج کے اصلی موئد و معاون تھے

افتتاحی تقریروں کے بعد کانفرنس ایک منتخب کمیٹی کی صورت میں منتقل ہو گئی اور بہت سی تجویزیں پاس ہوئیں شام کے وقت کانفرنس کے تمام نمائندے اپنے فرانسیسی دوستوں کے مہمان ہوئے اور ایک شاندار پرتکلف دعوت پر مدعو کئے گئے۔

شیخ صالح جو قریش پارٹی کی طرف سے منتخب ہو کر آیا تھا۔ شام کے وقت اپنے ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عجیب الہیئت شخص خوب اوڑھے لپیٹے منہ ہاتھ چھپائے اس کے پاس آیا۔ نو وارد کا نام محمد عبد الصمد تھا۔ وہ فرانسیسی مسلم تھا۔ اور وزارت خارجہ کا معتمد ایجنٹ۔ "عبداللہ"

نے شیخ صالح کے سامنے بعض خاص تجاویز پیش کیں اور کامل خلوص و اعتماد ظاہر کرنے کے طور پر اُس نے کرنسی نوٹوں کا ایک پلندہ سامنے میز پر ڈال دیا۔ شیخ موصوف نے استحساناً ان قیمتی کاغذوں کو دیکھا اور مسکرایا۔ دونوں میں (نووارد اور شیخ موصوف) کچھ راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں۔ وعدے وعید ہوئے۔ اور قول و قرار بیکر عبداللہ ہوٹل سے واپس ہوا۔ (باقی آئندہ)

غزل

(از سید محمد ہادی دہلوی)

ہوگیا وجہ جنون عشق کا چرچا مجھ کو
دیکھیے کیا کرے یہ سوزش سودا مجھ کو

آنکھیں پتھرا گئیں دل ہجر سے بیتاب ہوا
ابتو دکھلادو خدا را رُخ زیبا مجھ کو

اس کی زلفوں کا بکھرنا تھا قیامت آئی
ہوگیا مجھ کو جنوں ہوگیا سودا مجھ کو

گلیوں گلیوں نہیں برسائے پتھر مجھ پر
کوچہ کوچہ نہ کیا عشق نے رسوا مجھ کو

گلیوں گلیوں نہیں کیا تنکے چبائے مجھ سے
جا بجا کیا نہ کیا عشق نے رسوا مجھ کو

نگہ ناز ادھر ملی کہ تماشائی ہوں
تیر کا کام کرے ایک اشارہ مجھ کو

وصل کے ذکر پہ غصہ سے وہ فرماتے ہیں
دل سے بھاتا نہیں یہ روز کا چرچا مجھ کو

شیخ جی مے کی مذمت تو کیا کرتے ہو!
تم اکیلے کبھی گلیوں میں نہ ملنا مجھ کو

ہادی یہ عشق فرنگن ہے مسلمانی میں
ڈھونڈتے پھرتے ہیں دو چار کلیسا مجھکو

جج ۔ تمہیں کیسے معلوم کہ یہ عورت مدعی کی بیوی ہے ۔

گواہ ۔ حضور میں نے اسے اس کے گھر میں دیکھا تھا ۔ اس کی آنکھیں سیاہ ہیں ۔

مذاق شاعری

(از مولانا حاجی قمر احمد صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈیٹر روزنامہ خلافت)

اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
تو شعر لغو ہے آسی، کلام ناکارہ

یہ تو سب پر ظاہر ہے کہ اردو زبان کو دنیا کی زبانوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہوئے ابھی پوری دو صدیاں بھی نہیں گذریں۔ نیز اردو جہاں اول رائج ہوئی وہاں پہلے فارسی کا رواج تھا جس کے باعث نہ صرف اردو شاعری بلکہ جملہ اصناف ادب اردو پر فارسی ہی کا اثر نمایاں ہوا۔ مسلمان چونکہ اپنے زمانۂ حکومت میں فارسی ہی کو ملکی زبان بنائے ہوئے تھے اور ملک کی خاص خاص دوسری زبانوں کے حصول سے گھبراتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ محض زبان فارسی کی پیدا کردہ ملکی فضا کے اثر سے متاثر ہو کر بلا دیکھے "کنار آب رکن آباد و گل گشت مصلےٰ" سے لطف زندگی حاصل کرنے لگے، صحرائے نجد میں بگولوں کے ساتھ آہوان وحشی کی طرح دوڑ کے مزے لینے لگے، اور بلا سوچے سمجھے کوہ بیستون سے جوئے شیر لانے کی فکر میں پڑ گئے۔

ہندوستان کی فلک پیما پہاڑیوں کا خیال تک نہ آیا۔ راجپوتانہ اور سندھ کے ریگستانوں میں بھول کر بھی صحرا نوردی کا حوصلہ نہ ہوا۔ خود ہندوستان جنت نشان تھا۔ مگر ہم ہمیشہ گلشن ایران پر جان دیتے رہے۔ دریائے جیحوں و جوئے مولیاں کی یاد میں سر دھنا کئے، کبھی گنگا جمنا پر دل نہ لہرایا۔ غرضیکہ ہمارے ذوق سلیم کی گنگا الٹی بہتی رہی۔ جس کا یہ انجام ہوا کہ آج اردو کی شاعری خلاف فطرت، تصنع اور بناوٹ سمجھی جا رہی ہے، ہم نے کبھی اپنے وطن کے پھولوں کو دنیائے شاعری میں کھلنے نہ دیا۔ ہمیشہ ایران کے سُنے سنائے پھول پر بلبل صفت نثار رہے۔ تشبیہ، استعارات، غرضیکہ شاعری کا ہر جزو کل فارسی کا رہین منت، سنسکرت

تو ہمارے لئے ایک کا واک زبان تھی ہی ہم نے تو ملکی اور صوبہ جاتی، ورنا کیولر مثل بھاکا بنگلہ پنجابی، گجراتی مرہٹی وغیرہ کی طرف توجہ ہی نہ کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آج اردو شاعری اپنی تمام ہمسایہ زبانوں کی شاعری سے بیگانہ اور غیر مانوس سی ہے۔ جو سچ پوچھئے تو یہ بہت بڑی کمی ہے اور جس کا پورا کرنا ہمارے قومی ہونہار نوجوانوں کا فرض ہے۔

اس موقع پر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ کچھ نہ کچھ کوشش کبھی نہ کبھی ضرور ہوا کی۔ کہ اردو زبان کو مقامی زبانوں سے بالکل بیگانہ نہ رکھا جائے۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو، مرزا عبدالرحیم خانخاناں۔ ملک محمد جائسی۔ انشاء اللہ خاں اور ایسے ہی متعدد نام ہیں ملتے ہیں۔ مگر ان کی کوششیں محض انفرادی کوششیں ہیں جو ان کے نام کے ساتھ، یا وقتی جوش کے ساتھ ختم ہوگئیں۔ اور اس زمانہ میں تو اردو اور ہندی کے جھگڑے نے ایک ایسی ناگوار صورت اختیار کر لی ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دونوں زبانیں کبھی ملیں گی ہی نہیں۔ حالانکہ اسی ملک میں ہمارے بچے یوں پڑھتے آئے،

خالق باری سرجن ہار — واحد ایک خدا کرتار
رسول پیمبر جان بسیٹھ — یار دوست بولی جا ایٹھ
مولوی صاحب سرن پناہ — گدا بھکاری خسرو شاہ

یا پھر یہ صدا کانوں میں آئی:۔

ایک تو ننبا مد بھرے دوجے انجن سار — اب بوری کو دیت ہے باور کو تھیا

جسے فارسی میں یوں پڑھا جاتا ہے:۔

یکے چشم سیہ داری، دگر سرمہ چہا کردی — برائے کشتن عاشق بلا اندر بلا کردی

یا یہ سنتے۔ کہ

جو میں ایسا جانتی کہ پیت کئے دکھ ہوئے — نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت نہ کیجو کوئے

جس کا ترجمہ یوں کیا جاتا:۔

اگر دانستم از رہ زاد دل داغ جدائی را … نمی کردم بدل روشن چراغ آشنائی را

جس وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ انگریزی زبان میں ہومر اور دوسرے قدیم شعرائے یونان کی نظموں کے ترجمے نظم میں موجود ہیں تو بیساختہ دل یہ چاہتا ہے کہ کاش آج اردو میں رامائن اور مہابھارت کے منظوم ترجمے اسی پایہ کے ہوتے، تاکہ اردو شعرا کو ہندی شعرا کا کمال اور ہندی شاعری کی خوبیاں معلوم ہوتیں۔ اور وہ یہ سمجھ سکتے کہ ان میں سے کون کون سی باتیں قابل قبول ہیں اور واقعی نیچرل شاعری کسے کہتے ہیں۔ اس موقع پر اردو شعرا نجف کے ساتھ میر انیس مرحوم کو پیش کریںگے ہم بھی اسے تسلیم کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی بتائیں گے کہ میر انیس صاحب کے یہاں ایک گریہ و بکا میں تو ضرور لکھنؤ بلکہ ہندوستان کا نقشہ سامنے آتا ہے، باقی ساری شاعری کا عطائہ بیدی اور فارسی کا ممنون احسان ہے۔ یہ امر کسی اعتراض کی رو سے نہیں عرض کیا جاتا۔ بلکہ یہ ایک امر واقع ہے، جس کے ذمہ دار اردو کے شعرا نہیں۔ بلکہ وہ فضا ہے جس نے انھیں دوسری ہندوستانی زبانوں سے بیگانہ رکھا۔

مرحوم میر انیس صاحب کے یہاں تو پھر بھی ہندوستانی تلمیحات ملجاتی ہیں، جو شعرائے ریختہ کی نگاہوں میں خار بنکر کھٹکتی ہیں۔ مثلاً آپ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ

چھیدوں دل ارجن جو کروں تیر کو پرتاب،

ایسی ہی اور بھی مثالیں ہیں۔ گر اس معاملہ میں سب سے زیادہ قابل مواخذہ موجودہ نسل ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور کی نظمیں ساری دنیا کی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ اور نہ ہوئیں تو اردو میں، (ترجمہ سے مراد اعلیٰ قسم کا منظوم ترجمہ ہے۔ گھٹیا قسم کی نثر میں اداے مطلب نہیں) بلبل ہند مسز نائیڈو کی نظمیں ساری مہذب دنیا میں گائی جاتی ہیں۔ مگر نہیں گائی جاتی تو اردو میں ترجمہ ہوکر۔ بمبئی کے شعرائے اردو کو یہ بھی تو معلوم نہیں کہ گجرات اور مہاراشٹر میں کون کون صاحب فن دکوی شاعر) ہوگذرے ہیں۔ اور ان کا کلام کیوں اس درجہ مقبول ہے۔ یقیناً آنیوالی نسلیں موجودہ نسل کی اس غفلت اور بےخیالی پر انھیں کچھ بہت اچھا نہ سمجھینگی۔ مگر اس کی تلافی

اب بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ سچ پوچھئے تو مجھے انجمن معین الادب اور اس کے ماہوار ادبی و علمی رسالہ ادبستان سے یہی توقع ہے کہ وہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے، اور اردو خواں پبلک کے سامنے کم از کم بمبئی کی مروجہ زبانوں یعنی گجراتی اور مرہٹی کے شاعرانہ خیالات پیش کرنیکا اہتمام کریں گے۔ تاکہ گل و بلبل کے فرضی داستانہائے عشق کے بجائے ہم آم کی ڈالی پر کوئل کی پُر درد کوک سن سکیں۔ نجد کے میدان میں قیس عامر کے ساتھ لیلیٰ کی محمل کے پیچھے بہت خاک اڑا چکے۔ اب وقت ہے کہ پنجاب کے ہیر رانجھا کی داستان ہمارے لئے دلچسپی کا باعث ہو۔ ان الفاظ کے ساتھ میں اس نئی انجمن معین الادب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اور ادبستان کی کامیابی کیلئے دعاگو ہوں۔

افکار پریشاں

(از جناب عبدالشکور صاحب شیدا)

ہر شے میں ترا جلوہ پنہاں نظر آتا ہے
عالم مری آنکھوں میں عریاں نظر آتا ہے

پھر یاد کوئی آیا، آنکھوں میں بھرے آنسو
پھر دیدۂ پرنم میں طوفان نظر آتا ہے

صحرائے تصور میں کچھ نقش خیالی ہیں
اب ڈھونڈنا منزل کا آساں نظر آتا ہے

شاید کہ گلستاں میں پھر فصل بہار آئی
گہوارۂ وحشت پھر جنباں نظر آتا ہے

خود نذر تماشہ ہو، پھر دیکھ تجھے شیدا
ویرانہ میں بھی کیسا ساماں نظر آتا ہے

افسانے

کامیاب محبت

(از منیر الہ آبادی)

(۱)

اعلیٰ تعلیم اور خاندانی شرافت کے علاوہ قدرت نے نسیم کو ایک حیرت خیز اور جذبات انگیز حسن بھی عطا فرمایا ہے۔ اس کے خوبصورت چہرے اور شکر ریز تبسم سے صا طور پر نمایاں ہے کہ اسکی پر کیف آنکھوں میں ایک دل لبھانے والا سحر مستور ہے۔ اسکی اقا گانوں کی اس کنارے والی پہاڑی کا ایک خوشنما بنگلہ ہے جس کے دروازہ پر مسٹر نسیم بی۔ کا ایک چھوٹا سا خوبصورت سائن بورڈ آویزاں ہے۔ یہ بنگلہ ہر اُس فرنیچر سے جو ایک عہد جدید وکیل کے بنگلے کی زینت ہو سکتی ہیں آراستہ و پیراستہ ہے۔ مقابل میں ایک نہایت خوشنما و فرحت بخ باغیچہ ہے جو بلحاظ خوبصورتی گرد و نواح میں عدیم النظیر ہے۔ علی الصباح اٹھنا اور بنگلہ کی سامنے وا گیلری میں بیٹھکر قدرت کی نیرنگیوں کا مشاہدہ کرنا مسٹر نسیم کا طبعی خاصہ تھا۔ چنانچہ آج بھی اس دلنواز منظر کے مطالعہ میں مصروف ہے۔ رات کی تاریکی مدھم ہو رہی ہے سپیدۂ صبح کا نور بنگ کی سفید دیواروں سے منعکس ہوکر باغیچہ کی تاریک فضا پر غالب آتا جاتا ہے۔ کلیاں چٹک رہی اور ان کی مشام افروز نکہت سے باد سحر کی ہلکی ہلکی موجیں فضائے عالم کو معطر کئے دیتی ہیں۔ پھولوں بھری ڈالیوں پر طائران نغمہ سنج کے دلپسند چہچہے گونج رہے ہیں۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ا دلفریب نظارہ نے ایک دوسری تشکیل کی۔ مشرق کی ارغوانی افق سے طلوع آفتاب کی گلابی کرنیں دلکشی کے ساتھ نمودار ہوئیں اور اب باغیچہ کی تمام چیزیں نمایاں طور پر نظر آنے لگیں۔ صبح صادق کا یہ لطیف منظر ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ یکایک کسی نورانی چمک نے نسیم کی متجسس نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور اس کو محسو ہوا کہ یہ رشک جنت باغیچہ کسی غیر مرئی نور سے جگمگا رہا ہے اور اس نورانی شئے کی تمام تجلیاں سمٹکر اس کی

نورانی فضا کو جلا دے رہی ہیں۔ ذرا غور کرکے دیکھا تو ایک نازک اندام ہستی نظر آئی۔ جسکی جان نواز رعنائی صانع ازل کی لطیف صنعتوں کی مظہر اتم تھی۔ گو زہرہ انتہائی محویت کے عالم میں محو خرام تھی تاہم اسکا جمال جہانتاب کا پرتو اس کے باریک ملبوس سے چھن چھن کر اس باغیچہ کو دریائے نور میں غوطے دے رہا تھا۔ حسن دلاویز کے کرشموں کا یہ محشرستان انسانی صبر و شکیب سے اٹکھیلیاں کرنے کو تیار تھا۔ اس کا نازنین جسم نور کے سانچے میں ڈھلا تھا۔ اس کے اعضا کا تناسب قلمکار قدرت کی لطیف صنعتوں کا ایک اجمالی منظر تھا۔ غرضکہ زہرہ کا حسن ایک تھا ایک لمعۂ نور تھا جو چرخ زمرد فام سے اس فردوس آفریں باغ میں اتر آیا تھا۔ ایک مقناطیسی روحانی کشش تھی جو نسیم کی تمام حساس قوتوں کو اپنی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ نسیم ابھی اس حسن و جمال کے خدا ساز منظر کو دیوانہ وار دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نورانی مجسمہ نے ایک برق پاش تبسم کے ساتھ دل ہی دل میں کسی واقعہ کا اعادہ کیا۔ پھر کیا تھا۔ وہی جو ظہور پزیر ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۲)

قلزم حیات حقیقی جب خشک ہوتے ہوتے سراب ہو جانے کو ہوتا ہے تو اس کی تہ سے ریگ کے ذرات میں سے ایک گوہر تابندہ نمودار ہوتا ہے اور اپنی حیات آفریں آب و تاب سے سراب زندگی کو آناً فاناً آب حیات کے سمندر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ دہر ناپائدار کا ہر پیکر فانی ہے۔ اور فنا ئے پیکر پر اشک ریزی کرنا ایک رسم فرسودہ۔ دنیا تغیر پسند ہے۔ زمانہ کے ساتھ انقلاب اسیطرح وابستہ ہے جسطرح سیاروں کے ساتھ گردش۔ یا یوں سمجھئے کہ زندگی ایک افسانہ ہے مطالعہ کے لئے۔ اور اس کے حوادثات چند نصائح ہیں عمل کرنے کیلئے۔ درحقیقت عاشق وہ نہیں ہے جو ایک مہوس دنیا دار اور چالاک ریاضی داں کی طرح ہمیشہ نفع و نقصان پر نظر رکھے۔ اور قدم پھونک پھونک کر راہ محبت طے کرے۔ رسوائی، بدنامی، ناکامی کا خیال آتے ہی عشق و عاشقی کو دور ہی سے سلام کرے۔ کوئی شخص اسوقت تک عشق کا سچا دعوی نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ خود فراموش نہو۔ گویا کہ عشق کے واسطے سراسیمگی، حیرانگی، دیوانگی بمنزلہ اجزائے ضروری کے ہیں۔ عشق اور ہوش دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس راہ میں مٹ جانا، فنا ہو جانا حقیقی وصل ہے۔ عشق کی کرشمہ سازیاں اور سحر طرازیاں دیکھ کر انسان کے ہوش و حواس بجا نہیں رہتے۔ لیکن خلاف دستور

عرصہ فراق کے طول بسیط کے بعد آج سنگدل زہرہ نے تارک الدنیا نسیم سے جس نے بلحاظ وحشت آفرینی قیس و فرہاد کی مردہ ارواح کو زندہ کر دیا ہے۔ اسکی خلوت گزینی سے دور ایک پر وحشت خطہ بیابان میں، ملنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ صحرا نشین نسیم نے جو سامنے والے کو ہمیشہ کے حیرت انگیز کوٹ سے کسی کے خمیر محبت کو اپنے دل میں پختہ کر چکا تھا اور کسی کے اس زریں مقولہ کی تصدیق کر رہا تھا کہ محبت جب جوش و خروش کے بعد سکون و متانت حاصل کر لیتی ہے تو زندہ مستقل اور اثر آفریں ہو جاتی ہے۔ جب ایک قریب سے گذرنے والے سے زہرہ کا یہ امید افزا پیغام سنا تو فرط مسرت سے بلکتی ہوئی ریت پر بیہوش ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۳)

مایوس نسیم بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی ناتواں آنکھیں کسی پیمان شکن اور وعدہ فراموش کی منتظر ہیں نیم باز ہیں۔ اور ضعیف و ۔۔۔ ۔۔۔ سے عالم میں محو گرانی ہوئی نغمہ واز ہے کہ ؎

وفا کے وعدے سے جیسے کہ اپنی ہمیشہ شرماتے آگاہ کرنا ؎ حضور نے کیا خوب سمجھا ہے منتظر کو تباہ کرنا

آف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زہرہ! سنگدل زہرہ!! یہ جوانی غارت ہو گئی۔ یہ دل تباہ ہو گیا۔ یہ دماغ ناکارہ ہو گیا۔ تیرا نسیم اب چراغ سحری ہے۔ تو نے وعدہ کیا۔ پیغام دیا۔ خط بھیجا کہ میں آؤنگی۔ ضرور آؤنگی۔ مگر آہ تیرا وعدہ جھوٹا۔ تیرا قول غلط۔ تیرا عہد ہیچ۔ مایوسی آئی۔ مگر تو نہ آئی۔ زہرہ: تو نے یہ نکپاتنی کس سے سیکھ لی۔ تجھے نیم بسمل بنانا کیوں کر آیا۔ ہاں۔ ہاں میں سمجھا۔ شاید ابھی میری محبت کا امتحان لینا باقی ہے۔ زہرہ! اگر یہ ٹھیک ہے تو آ۔ اور جلد آ۔ تاخیر نہ کر۔ ایسا نہ ہو کہ یہ خاک پھر تیری خدمات کے لائق نہ رہے۔ تیرا منتظر نسیم نیم جان ہے۔ تیری وعدہ وفائی کا منتظر ہے۔ آف۔ تو کب آئیگی۔ زہرہ! یاد رکھ! کہ اس وقت تیرا آنا عبث ہوگا۔ جب تو اپنے نرم نرم حنا مالیدہ نازک ہاتھ میرے فاتحہ کے لئے اٹھائے گی۔ اور میں بیحس و حرکت پڑا ہونگا۔ تیرا استقبال کون کریگا۔ تجھے خوش آمدید کون کہیگا۔ تیرے گلے میں نازک کلیوں کا ہار کون پہنائیگا۔ اس وقت تیرا نسیم انفعال، ندامت سے اپنا چہرہ کفن سے ڈھانپ لیگا۔ اسے چودھویں رات کے خوبصورت چاند تجھے اپنے تاروں بھرے آسمان کی قسم

گوارہ رہا کہ تمام کائنات جب خواب شیریں کے مزے سے لطف اندوز ہو رہی تھی تو نسیم زہرہ کی یاد میں محو تھا۔ ....

(۴)

آسمان ابر غلیظ سے پر ہے۔ ماہتاب کسی فرقت نصیب کی حسرتناک موت کے سوگ میں سیاہ پوش ہو رہا ہے۔ تارے چونکہ اس مرگ بیکسی کے نظارہ کی تاب نہ لا سکتے تھے اس لئے پہلے ہی سے ابر پوش ہو گئے ہیں۔ رات کی خوفناک تاریکی ہر طرف اپنے ڈیرے جمائے ہوئے ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے پر کیف جھونکے ایک دل ہلا دینے والا نغمہ سنا رہے ہیں۔ آبادی سے بہت دور ایک ویران مقام پر دنیا سے بے تعلق ما فیہا سے بے خبر نسیم فرش خاک پر پڑا ہوا زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا ہے۔ نازنین زہرہ نسیم کا سر اپنے زانو پر رکھے ہوئے نسیم کے غم آلود چہرے پر اپنے اشکوں کی موتیوں کا الوداعی ہار نثار کر رہی ہے۔ اسکی نازک اور حسین آواز فضا میں اسطرح گونج رہی ہے۔ نسیم! پیارے نسیم!! کیا تم نے مجھے اسی دن کے لئے چاہا تھا۔ کیا تم مجھسے اسیواسطے محبت کرتے تھے۔ خدا کے لئے ذرا آنکھیں کھولو! دیکھو تو تمہاری کنیز زہرہ تم سے اپنا وعدہ وفا کرنے آئی ہے۔ زہرہ کی اس مختصر تقریر نے مسیحائی کا کام کیا۔ مریض عشق نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ فرط جوش سے بول اٹھا۔ ہائے زہرہ پیاری زہرہ تم نے اپنے نسیم کی دلنوازی کے لئے یہانتک تکلیف فرمائی۔ زہرہ! وفاکیش زہرہ!! گستاخ ریت کے ذروں نے تمہارے حنائی کف پا کو تکلیف پہنچائی ہوگی۔ دیکھو! مخمور آنکھوں والی زہرہ ذرا میری طرف دیکھو!! بلبل شاخ گل پر چہچہہ زن ہے لیکن گل خاموش۔ تمہاری زلفوں میں غضب کا انتشار شاید رات ہو رہی ہے۔ اچھی زہرہ ذرا چہرے سے زلفیں تو ہٹا دو میرا دل پریشان ہو رہا ہے مشک الفت کی رشک ختن زہرہ تمہاری سحر کن اور دلکش اداؤں سے میرا غم آفریں تخیل منتشر ہو گیا۔ میں .... ایک ہچکی آئی اور سلسلہ زندگی منقطع۔ زہرہ غش کھا کر نسیم کی لاش پر گر پڑی۔ بادلوں سے چھن چھن کر نور برسنے لگا۔ آسمان کے دریچے کھل گئے۔ نسیم عنبر بیز کا ایک لطیف جھونکا آیا۔ ملائکہ نورانی اور انوار قدسیہ کا ہجوم لگ گیا۔ دونوں ارواح کو عطر آگیں سفید بہشتی حلوں میں ملفوظ کیا گیا۔ ایک نگاہ شکن تجلی کا ظہور ہوا زمین سے آسمان تک نور ہی نور نظر آنے لگا۔ اور اسی حالت میں یہ تمام مجمع عالم بالا کی طرف

انتخابات

دعائے نیم شبی

(از جناب سلطان حیدر جوشؔ)

آنریبل ایم۔ سی۔ (ممبر آف دی کانسل) کچھ عرصہ سے، اس وقت سے جبکہ وہ کونسل کے ممبر منتخب ہوکر آنریری مجسٹریٹ کے علاوہ آنریبل اور ایم۔ سی۔ بھی ہو گئے، بلا ناغہ آدھی رات کے سناٹے میں اپنے درد دل کا اظہار کچھ ایسے موثر الفاظ میں کیا کرتے ہیں، جو سننے اور غور کرنے کے قابل ہیں۔

"اے پارلیمنٹ اور کونسل کے خدائے صغیر!! اے وہ خدا جس کو سوائے دنیاوی ترقی کے پروردگار عالم سے کچھ مطلب نہیں! میں اپنے سچے دل کے ساتھ تجھ سے اور محض تجھ سے ملتجی ہوں کہ تو اپنی نگاہِ لطف آمیز مجھ ناچیز پر، اپنے بندۂ خاص پر، ڈال!! رحم و مہربانی آمیز نظر کے ساتھ اس عظیم الشان اور حیرت انگیز اتفاق کو ملاحظہ کر، جس نے مجھے کونسل کے آنریبل ممبر بنجانے کا موقع دیا۔ اور اپنی شان عیب پوشی و ابلہ نوازی کے صدقے میں، اپنے دامانِ عنایت میں، اپنے حفاظت اور طرفداری کے وسیع دامن میں، چھپالے، تاکہ میری جہالت، میری از سرتاپا قابلیت، کسی عیب جو اور نکتہ چیں نظر کو بھی نہ معلوم ہو سکے! قسم ہے تجھ کو اپنے قوت تکلم کی، اپنی طاقت لسانی کی، مجھ بے زبان میں کم از کم اتنی تو لیاقت پیدا کر دے کہ میں اس جرنلسٹ اور پریس رپورٹر کے پھندے سے نکلجاؤں جو میری اسپیچ اور تقریر کے لکھنے اور اصلاح کرنے کا معاوضہ وقت آنے سے پہلے مجھے یاد کراتے اور رٹوانے کا مطالبہ میری استطاعت سے بھی زیادہ مانگتا ہے!!

اے مذہبی فرقوں، سوشل گروہوں، اور پولیٹیکل جماعتوں پر حکمرانی کرنے والے خدائے خاص! اپنے زر نگار چکاچوند پیدا کرنے والے جڑاؤ عرش کے صدقہ میں میرے دل و دماغ کو مذہبی اسپرچوئل ٹیلیگرافی، یا روحانی تار برقی عام واقفیت سے صرف اس قدر بھر دے کہ میں وقتاً فوقتاً حلقہ رائے

دہندگان کے روبرو ہر پیش آنے والے معاملہ میں دخل درمعقولات کرسکوں۔ اور ان بیوقوفوں کو جو گورنمنٹ کی اطاعت کے محض ایسے ہی عادی ہیں جیسے ہولی کے موقعہ پر برانڈی یا رم کے، ہر مسئلہ پر اپنی جھوٹی سچی ٹانگ لڑا لڑا کے اپنا گرویدہ بناؤں۔ مجھے معلومات باطل اور حقوق فرضی کی ایسی عمیق تعلیم دے کہ میں اس کی بدولت اپنے گرد و پیش رہنے والے ناتراشیدہ دہقانیوں کو اپنی وسیع معلومات اور عظمت کا یقین دلا سکوں، اور مجھے تلقین کر کہ میں ان کی سادہ لوحی کو گندم نما جو فروشی کی اعانت میں اپنے آرام کے لئے خاطر خواہ کام میں لا سکوں!!

اے جاہل ہندوستان کے سوشل مرتبہ کے خدا، ہر دلعزیز بامروت خدا! مجھے ایسے ضروری اور موزوں علوم ہونے والے غرور تکبر سے ملبّب کر دے کہ میرا گستاخی آمیز پُرغرور برتاؤ، اہل قلم و اہل دماغ کے ساتھ ناقابل برداشت ہونے کی حد تک پہونچ جائے، مگر ساتھ ہی مجھ میں وہ چکیلا، اطاعت سے بھرا ہوا، اخلاق بھی قائم رکھ جس کی بدولت میں حکام بالا دست کی نگاہ میں چاپلوسی کرنے والے چپراسی اور خوشامدی ٹٹو سے زیادہ نہ جچوں! اور قسم ہے تجھ کو اپنے مہذب اور خاموش پالیسی کی، موجودہ دورنگی ڈپلومیسی کی، مجھے ایسی قابلیت عنایت کر کہ میں التفات آمیز سرپرستی اور ہمدردی بھری ہوئی امداد کے رنگ میں اپنے رائے دہندگان کے سر پر شفقت اور مہربانی کا ہاتھ پھراتا رہوں!!

اے جاہلوں کے مربی، چھوٹی سی شان والے نکتہ نواز! اپنی شان رحیمی کے طفیل میں اپنے روز بد سے، ایسی منحوس گھڑی سے بچا، کہ مجھے کونسل کے سامنے بولنے کی ضرورت پڑے! اے سب کچھ جاننے والے تو جانتا ہے کہ میں کوئی لکچرار یا اسپیکر نہیں ہوں۔ اور بفرض محال اگر ہوتا، تو بھی میرے ناکارہ دماغ میں کوئی ایسا قابل غور خیال نہیں جس کے لئے مجھے صرف ایک واہیات سے واہیات فقرہ بھی بولنا پڑے! اے دوربین کی امداد سے اصلیت کی تہ تک کو دیکھ لینے والے، دانا و بینا! تو دیکھتا ہے کہ تمام سوشیل فائدوں کے لحاظ سے، تمام قومی حقوق کے خیال سے، میری ذاتی رائے اگر ہے تو یہی اور صرف یہی ہے۔ کہ مردہ دوزخ میں جائے

یا بہشت میں، مجھے اپنے نام کے ساتھ ایم۔ سی۔ لکھنے کا حق ہمیشہ ہمیشہ تک حاصل رہے!

اے پارلیمنٹ اور کونسل کا حساب جانچنے والے، اور ایک ایک رائے کو شمار کرنے والے احکم الحاکمین! تو ضرور جانتا ہوگا کہ میں نے، تیرے بہترین بندہ نے محض ایم۔ سی۔ لکھنے کا حق حاصل کرنے میں مبلغ دو ہزار روپے سکۂ رائج الوقت مناسب اوقات پر خرچ کئے ہیں، یعنی ان دو حروف تہجی کو، ایم اور سی۔ کو بشرح ایک ہزار روپیہ فی حرف مول لیا ہے۔ اور اب میں ان کو، محض ان کو، تمام سوسائٹی، تمام قوم، اور تمام ملک، سے زیادہ عزیز، بلکہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں! اے مبلغ علیہ السلام کو ستار عیوب کا سچا مرتبہ عطا فرمانے والے کردگار! ان دو حرفوں کو اس قدر گراں مول لینے کے بعد اگر میں یہ التجا کروں کہ مجھے کبھی کسی ضروری سے ضروری معاملے میں بھی، کسی ایسے معاملہ میں بھی جس سے میری قوم کا فائدہ ہی وابستہ کیوں نہ ہوں مجھے ایک لفظ بھی بولنے کی ضرورت نہ پڑے، ہونٹ ہلانے تک کی حاجت نہ ہو، تو کیا بیجا ہوگی؟ نہیں نہیں، تو ضرور میری التجا پر غور کرے گا۔ غور کرے گا اور منظور فرمائے گا!

اے کونسل کے معاملات پر قدرت رکھنے والے چھوٹے سے بالشتیٔ قادر مطلق! تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس کمبخت جرنلسٹ اور پریس رپورٹر کو اپنی تحریر اور تقریر کی اصلاح وغیرہ کے معاوضہ میں بہت کچھ دیتا ہوں اور ساتھ ہی اس کی علمی قابلیت اور وسیع معلومات پر مجھے پورا بھروسہ بھی ہے، لیکن میں پھر بھی اس کی لکھائی ہوئی اسپیچ پڑھتے ڈرتا ہوں۔ اور محض اس خیال سے ڈرتا ہوں کہ کہیں وہسکی سوڈا، کہ معمول سے زیادہ چڑھا جانے سے وہ کچھ کا کچھ نہ لکھ گیا ہو! کیوں کہ اس کے الفاظ کچھ ایسے مشکل، اور اس کی عبارت کچھ ایسی پیچیدہ ہوتی ہے کہ مطلب سمجھنا تو درکنار میں اس کو بغیر پوری محنت کے صحیح صحیح طوطے کی طرح دہرا بھی نہیں سکتا اے حرف حرف پر پکڑتے اور نکتہ نکتہ پر چھوڑ دینے والے، ذوی اختیار نکتہ نواز! کیا اچھا ہو کہ میں تیرے سایۂ عاطفت میں رہ کر اس خوفناک شخص سے چھوٹ جاؤں، اور کم از کم مجھ میں اسی قدر دماغ اور جرأت پیدا ہو جائے کہ میں مرحوم لائق، سر برآوردہ حضرات کی یاد سے اتر جانے والی

تقریروں اور تحریروں کے وہ حصّے جو میرے لئے مناسب اور موزوں ہوں رٹ لیا کروں اور بغیر جھجکے وقت ضرورت سنا دیا کروں۔ اس میں سب سے زیادہ اطمینان بخش یہ بات ہے کہ مردہ حضرات اس خیانت کا، اس پوچ اور کمینہ پن کی چوری کا دعویٰ کرنے کیلئے قبر سے اٹھکر نہیں آسکتے، اور تو جانتا ہے کہ آج کل ایسی چوری، تحریر و تقریر کی چوری، شاعر، ناول نگار، لکچرار، تقار، غرض سب کے سب اطمینان کے ساتھ کر رہے ہیں! بس تو اے قسمت مجھ کو اپنی پولیٹکل اور اپنی ڈپلومیسی آمیز شان کی، مجھے بھی اس قابل کر دے کہ میں اپنی منشا کے موافق اکثر حصّے گمنامی میں پڑی ہوئی تصنیفات سے چھانٹ سکوں۔ اور بغیر حوالہ دئے، یہ ظاہر کئے کہ وہ کسی اور دماغ کا نتیجہ ہیں، نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ کونسل کے روبرو پڑھ سکوں۔ یہ تو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ زیادہ تر مجھ سے ہی ٹھوٹ اور ہیچمداں حضرات سے بھری ہوئی ہے۔ وہ خود ایسے ہی خاموش بیٹھے رہتے ہیں جیسے کہ ہیں، اور اگر شاذ و نادر کوئی ایک سمجھنے اور بولنے والا آبھی جاتا ہے تو ہم احمقوں کی تعداد کی زیادتی اس کی کچھ پیش نہ چلنے دیتی۔ اور وہ اپنی تمام علمی لیاقت اور دماغی جدّت کے ساتھ بھی ہمارے گروہ حماقت بے تمیزی کے مقابلہ میں کچھ ہستی نہیں رکھتا۔ اب رہے میرے رائے دہندہ، تو ان کی طرف سے مجھے یقین ہے کہ وہ مویشی چرانے والے، کھیت کاٹنے والے گنوار، کسی طرح میرا یہ الہام، چالاکی سے بھرا ہوا اٹھائی گیرا پن، خود معلوم نہیں کر سکتے، اور ساتھ ہی آج کل ایسا کوئی اڈیٹر بھی ڈگری یافتہ نہیں جو میری اس چوری کو سمجھ سکے، اور پبلک کو سمجھا سکے۔ سب سے زیادہ آسان، سب سے زیادہ اطمینان بخش، سب سے زیادہ سستا، کم خرچ بالا نشیں یہی طریقہ ہے کہ میں تحریر و تقریر کی چوری پر، دماغی قابلیت کے اُچکے پن پر، پابند ہو جاؤں، بشرطیکہ تو بھی مجھے اپنی مہربانی اور امداد سے، البتہ پوری ملی ہوئی امداد سے سرفراز فرماتا رہے!!

اے تمام دنیاوی اعزاز و مرتبہ عطا فرمانے والے قاضی الحاجات! مجھے!!

بلند اور اونچی شان، فریب، جھوٹ اور غرور سے بھری ہوئی شان عطا کر، جس کے بدولت میں سر سے پاؤں تک غیر معمولی قابلیت اور واجب التعظیم لیاقت کا پتلا نظر آنے لگوں۔ اور سوسائٹی کی ظاہر بین آنکھ میں اپنے آپ کو وہ ثابت کر سکوں جو دراصل میں نہیں ہوں! اے فلک کی قسمت پر قدرت رکھنے والے، فرشتوں کی کمیٹی کے صدر نشین! اپنی تمام انتظامی فراست کے صدقہ میں، میرے رائے دہندگان کو میری اصل وحقیقت کے دریافت کرنے کے معاملہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھا، بہرا اور گونگا کردے، کیونکہ ان کو میری بیہودگی اور جہالت کی ذرہ برابر بھی خبر ہوئی اور یقین آگیا، تو میں آئندہ الیکشن میں ضرور اپنی عزت کھو بیٹھوں گا۔ اور پھر اپنے آپ کو ایم۔ سی کبھی نہیں لکھ سکوں گا۔ جس کو میں اپنے نام کے ساتھ نتھی رکھنے کا دلدادہ ہوں۔ جس طرح ایک پولیس کا تھانیدار اپنی وردی پر تھانیداری کے چمکتے ہوئے مارک کا!!

اور تو اور، میری بیوی، تعلیم یافتہ ترقی یافتہ بیوی جس کا خوش رکھنا میری ہستی کا سب سے بڑا مقصد اور میری زندگی کا اکیلا فرض ہے، اس ناقابل برداشت صدمہ کی وجہ سے غصہ کے مارے بے آپے ہوجائیگی۔ اور تو جانتا ہے کہ اس کا غصہ تقسیم بنگالہ سے زیادہ مستحکم اور دیرپا غصہ ایسی چیز ہے جو نہ خوشامد سے دبے اور نہ بندر بھبکیوں سے کم ہو۔ کیونکہ زمانہ کی ہوا نے اُسے آزاد حاکم اور مجھے عاجز محکوم بنا دیا ہے۔ اس لئے اے حقوق نسوان اور آزادیٔ نسواں کے ناپید کنار سمندر کے بااختیار بچوں! مجھے اس منحوس گھڑی سے بچا، جبکہ میں ایم۔ سی لکھنے کا حق کھو بیٹھنے کی وجہ سے اپنی سرور فد بیوی کے کبھی نہ فرو ہونے والے غصہ اور نفرت کا شکار بنجاؤں!

اس سب کے علاوہ تو یہ بھی جانتا ہے، اور خوب جانتا ہے کہ میں تیرا تابع فرمان بندہ، کبھی کسی معاملہ میں اپنے ملک کی، اپنی قوم کی، اپنے مذہب کی بہتری کا طالب نہیں ہوں! ان تمام باتوں کی مجھے اتنی بھی پروا نہیں جتنی اڑد پر سفیدی۔ اور اسی وجہ سے ترکی کے جھگڑے میں یا روس وایران کے معاملہ میں کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار، میں ایک

فعل عبث سمجھتا ہوں! مارا چہ ازیں قصہ گاؤ آمد و خر رفت، میری طرف سے تمام دنیا جنت میں جائے یا جہنم میں مجھے اپنی چمکیلی شان وشوکت سے اپنی سرو قد حکمراں بیوی کی خوشنودی سے، اور اپنے نام کے ساتھ ایم۔ سی۔ لکھ لینے سے کام ہے، اور بس! اے لکشمی جی کے تیر نظر کے گھائل، اے مبلغ علیہ السلام کی جھنکار پر جان دینے والے کفایت شعار رزاق! ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مجھے کونسل کا ممبر رہنے کا فخر عنایت کر، اور ابدالا باد تک مجھے اپنی شان اہلہ نوازی کا مرجع قرار دے، آمین! ثم آمین۔

غزل

(جناب قدرت علی صاحب عزت)

اس تجاہل سے مدعا کیا ہے
تیری یہ ہر گھڑی کی "کیا" کیا ہے

اب وہ بیتا بیاں نہیں مجھ میں
جانے آنکھوں سے بہ گیا کیا ہے

درد دل ہو گیا دوا آخر
ہم نہیں جانتے دوا کیا ہے

بیقراری یہ کیوں ہے حضرتِ دل
کچھ تو فرمایئے ہوا کیا ہے

ہو نہ بوئے ریا تو پھر زاہد
فرش قالین و بوریا کیا ہے

بیخبر ہیں کسے خبر اتنی
ابتدا کیا تھی انتہا کیا ہے

سچ تو یہ ہے مریضِ عشق کبھی
جانتا ہی نہیں شفا کیا ہے

سُن تو لیجے کلام عزت کا
"مانا اچھا نہیں"۔ بُرا کیا ہے

معارف

(از مولانا وحید الدین صاحب، سلیم پروفیسر عثمانیہ کالج، حیدرآباد دکن)

کانپ اُٹھے دل! نہ محبت میں تمناؤں سے — ہے گزرنا تجھے، ان خون کے دریاؤں سے

تارے دیتے نہیں، کچھ منزلِ مقصد کا پتہ — پار جاتا ہوں نہیں ان حسن کی دنیاؤں سے

حُسن نے کر دیئے پھولوں سے گلستاں پیدا — عشق نے ذرّوں کو ٹکرا دیا صحراؤں سے

ایکدن عیش پسندی سے یہ محنت نے کہا — میں غلاموں کو بڑھا دیتی ہوں آقاؤں سے

دِل کی آنکھوں نے بھی دیکھا نہیں جن جلوؤں کو — اب بغلگیر ہیں وہ میری، تمناؤں سے

پہلے تفتیش دلوں کی ہوئی، اب روحوں کی — کوئی گوشہ نہ بچیگا، ترے جویاؤں سے

بینشیں دہر کے جلوؤں سے تحیّر میں ہیں غرق — دانشیں تنگ ہیں قدرت کے معمّاؤں سے

اپنی نادانی کا اقرار بھی دانائی ہے — بس یہی بات چھپی رہ گئی داناؤں سے

مردہ دل جنکو سمجھتے ہو، یہ وہ مُردے ہیں — زندہ ہوتے نہیں دیکھے، جو مسیحاؤں سے

مغنیۂ فطرت

(از رشید صدیقی)

چھیڑ دے، او مغنیہ! نغمۂ زندگی کوئی
کھینچ دلِ فسردہ پر، نقشۂ زندگی کوئی
پھونک دے! روحِ بیخودی، چھیڑ دے نغمۂ حیات
گردشِ چشم پر تری رقص کناں ہے کائنات
کیف ہے سب زمانہ کا، تیری صدائے ساز میں
آہ، بلا کا سوز ہے تیری نوائے راز میں

چھیڑ دے! کوئی راگنی، سازِ جہاں خموش ہے!
انجم و مہ خموش ہیں! کون و مکاں خموش ہے!
دامنِ ناز میں ترے کھیل رہی ہیں شوخیاں
تیرے ہر اک اشارہ میں کوند رہی ہیں بجلیاں
برشِ تیغ سے تری سینۂ غم فگار ہے!
تیری ادا کا بانکپن، صفحۂ زرنگار ہے
بھر دیں نسیمِ صبح میں شوخیاں تو نے کوٹ کر
نکہتِ گل ہے بیقرار، دامنِ گل سے چھوٹ کر
غنچۂ ناشگفتہ میں پہلے تو رنگ بھر دیا
پھر جو ہنسا کے گُل کیا، باغ میں طاق کر دیا

آیا بہار پر شباب حُسن ہے اب چمن چمن
نغمۂ و ساز سے ترے گونج رہی ہے انجمن



مغنیهٔ فطرت

دامنِ گل

معصومیتِ عشق

تُو کون ہے؟ میں تجھے نہیں جانتا۔ مگر پہچانتا ہوں۔ تجھ سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔ مگر محبت کرتا ہوں۔ تو دور ہوتا ہے تو میں قربت کی آرزو میں مبتلا ہوتا ہوں۔ تو سامنے آتا ہے تو میں رعبِ حُسن سے مرعوب ہو جاتا ہوں۔ تو بے نیازی برتتا ہے۔ میں پرستش کے لئے مرتا ہوں۔ تو تغافل شعار ہے۔ میں لگاوٹ کی فکر میں گرفتار۔ تو جفا کاری پر کمر بستہ۔ میں وفاداری کے لئے آمادہ۔ تاہم مجھے تیری تلاش ہے۔ جستجو ہے۔ کیونکہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں ——— ہاں میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اور تمام زمانہ سے محبت کرتا ہوں ——— میں اس عالم کے ایک ایک ذرہ سے محبت کرتا ہوں۔ کیونکہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ میری نظروں میں یہ معمورہ محبت سے معمور نظر آتا ہے ——— کیونکہ میری نگاہیں محبت سے آشنا ہیں۔۔ مجھے اس دنیا کی ہر شے میں محبت کا اثر معلوم ہوتا ہے ——— کیونکہ میرے قلب کی گہرائیوں میں محبت موجزن ہے۔ میں زمین سے آسمان تک محبت کی سنہری کرن دیکھتا ہوں ——— کیونکہ میری روح میں محبت کی رنگینی سرایت کر گئی ہے۔ میں ارض و سما کی وسعت میں محبت کا نور ضوفگن پاتا ہوں ——— کیونکہ میرا دل ظلمتِ ہستی میں مشعل محبت کا حامل ہے ——— مجھ میں شرابِ محبت کا خمار ہے۔ شعلۂ محبت کا سوز و گداز ہے۔ اور دریائے محبت کی فراوانی ہے ——— کیونکہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔

میں تجھے نہیں جانتا۔ مگر پہچانتا ہوں۔ تجھ سے واقف نہیں مگر آشنا ہوں ——— ۔۔۔۔ تیری آنکھوں میں نور ہے۔ کیف ہے۔ سرور ہے۔ تیری اداؤں میں ناز ہے۔

دامن گل

نازوں میں ادا ہے ۔ تجھ میں حُسن ہے ۔ حسن میں رعنائی اور رعنائی میں جاذبیت ہے ۔ تیرے بکھرے بکھرے گیسو دلکش ہیں ۔ جانفزا ہیں ۔ تیرے گلابی رخسار ۔ نظر فریب رخسار ۔ ہوشربا ہیں ۔ صبر آزما ہیں ۔ تیرا روئے تاباں ۔ عارض زیبا ۔ اُف ـــــ تیرا "مجمل حسن" ۔ ملائک فریب ہے ۔ زہد شکن ہے ۔ لیکن تیرا ہر طرز پسندیدہ ہے ۔ ہر انداز پیارا ہے ـــــ کیونکہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں ۔

میں تجھے جانتا نہیں مگر پہچانتا ہوں ۔ تیرا شریک نہیں ۔ مگر تجھ سے وابستہ ہوں ۔ تیری گفتار میں شیرینی ہے ۔ تیری رفتار میں نزاکت ہے ۔ تیرا ذکر مجھے بھاتا ہے ۔ تیری باتیں مجھے خوش آتی ہیں ـــــ کیونکہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں ـــــ

اگر میں تجھ سے محبت نہ کرتا ۔ تو کوئی کسی سے محبت نہ کرتا ۔ تیرا "شوخ حسن" "معصومیتِ عشق" کا گہوارہ ہے ۔ تیری گردشِ چشم میں اعجاز ہے ۔ اور اس اعجاز میں "حقیقت" کی جھلک ہے ۔ تیرے اشاروں میں جادو ہے ۔ اور اس جادو میں علویت کا منظر ـــــ آہ تیرا حسن ـــــ تیرے "حسن مجازی" میں "حسن حقیقی" کی جلوہ ریزیاں ہیں ـــــ اس "جزو" میں "کل" کی فسوں سازیاں ہیں ۔ ہاں تیری ہستی ـــــ نہیں نہیں خامۂ قدرت کی یہ رنگیں تحریر اُس "حسن نگار" کی نگارش ہے جسکی بوقلمونی کی نکتہ رسی سے عقل سلیم عاجز اور دیدۂ بینا قاصر ہے ـــــ اور ـــــ تو میرا محبوب ہے ۔ مطلوب ہے ۔ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں ـــــ کیونکہ میں تجھ میں اسکا عکس دیکھتا ہوں جس سے میں محبت کرتا ہوں ۔

(گلفروش)

مقالات

شاعر اور نغمہ

(از نسیم فردوسی)

آجکل حلقۂ شعرا میں اشعار کو عموماً گا کر پڑھنے کا رواج ہوگیا ہے۔ اور اس دستور نے کچھ ایسی شہرت حاصل کر لی ہے کہ "شاعر" کا نام آتے ہی دماغ "موسیقی" کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ مشاعروں پر جنھیں درحقیقت زبان۔ تخیل اور جذبات کا ٹکسال کہنا چاہئے عام طور پر محفل سماع" کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ مشاعروں کی وہ کثرت اور بہات اب باقی نہیں رہی۔ اور اگر کسی قدر ہے بھی تو اسے وہ اہمیت نہیں دیجاتی۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ شعر کو نغمہ سے وہی تعلق ہے جو روح کو جسم سے۔ روح کی غذا راگ ہے۔ لیکن اس غذا کے مہیا کرنے کا سامان شعر ہے۔ یا یوں کہئے کہ شعر کا زیور نغمہ ہے۔ بغیر نغمہ کے شعر سونا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نغمہ کی جان شعر ہے۔ اگر شعر نہ ہو تو نغمہ کوئی چیز نہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ شاعر کو نغمہ سے کیا تعلق ہے۔ اور دونوں کس حد تک ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ شعر اور نغمہ دونوں ایک دوسرے کے جزو لاینفک ہیں۔ تو یقیناً شاعر کو ان کی درمیانی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ جب کبھی شعر "سادگی" سے پڑھا جائیگا تو "نغمہ" کی کمی ضرور محسوس ہوگی۔ اور اگر نغمہ کے ساتھ پڑھا جائے گا تو گویا اپنے تمام ضروری اجزا سے ملکر مکمل ہوجائے گا۔ اور اس کا حسن دوبالا نظر آئے گا۔ اس حیثیت سے شعر کو اس کی بہترین صورت میں پیش کرنے کے لئے شاعر کا مغنی ہونا لازمی ٹھرتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اگلے وقتوں کے شعراء میں کثرت ایسے ہی لوگوں کی تھی جو نغمہ و ترنم سے بے نیاز ہوکر اشعار سنایا کرتے تھے۔ اور اگر دیکھا جائے تو آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے

مقالات

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس زمانہ کے شعرا کے دماغون پر "موسیقیت" کا اثر کیون ہوتا جاتا ہے۔

بظاہر اسکے دو اسباب معلوم ہوتے ہین (۱) لیاقت و استعداد شاعری کی کمی۔ (۲) اگلے مذاق کا فقدان :- ان دو وجوہ میں سے اول الذکر تو شاید کسی تشریح کا محتاج نہین۔ ملک مین شاعرون کی کچھ ایسی کثرت ہوگئی ہے کہ آپ ہرکس وناکس کی زبان سے یہ فقرہ سُن لیجئے "اس زمانہ مین تو برساتی مینڈکون کی طرح شاعر پیدا ہوتے ہین۔" اگر مین بر سر غلط نہین ہون تو وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہون کہ شاید ہی کوئی ایسا تعلیمیافتہ گھرانہ ہوگا جس مین کم از کم ایک شاعر نہ ہو۔ جب یہ عالم ہے تو آپ کو کہان تک ایسے شاعر ملین گے جن کے کلام مین آپ ایجاد معانی اور اختراع خیالی کی تلاش کرین۔ یہان تو یہ حالت ہے کہ بہتیرے نام نہاد شعرا ایسے ہین جو محض ردیف وقافیہ کی "تک بندی" بھی صحیح نہین کرسکتے۔ پھر حُسن زبان وبیان تو ایک بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن چونکہ شاعر بننے اور کہلانے کا شوق غالب ہے اس لئے "بزعم شاعر" مشاعرون مین شریک ہونے کے لئے ہمہ تن طیار نظر آتے ہین۔ اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ مجلس مشاعرہ مین جہان ایسے ویسے شاعر ہوتے ہین وہان بڑے بڑے نقادفن بھی ہوتے ہین۔ چنانچہ یہ "خانہ ساز شعرا" عیوب برہنگی چھپانے کے لئے نغمہ کی اوٹ ڈھونڈھنے پر مجبور ہوتے ہین۔ اور اس طرح نغمہ سرائی کی بدولت یہ لوگ اشعار مین ثقاہت لفظی اور وزن وغیرہ کی معمولی غلطیان بنھالے جانے کی کوشش کرتے ہین۔ یہ تو ان شعرائے کرام کا ذکر ہے جن مین لیاقت واستعداد شاعری مفقود ہے۔ اور چونکہ ایسے شعرا کی تعداد دن بدن ترقی پذیر ہے اس لئے اشعار کو گاکر پڑھنے کا رواج بھی بڑھتا جارہا ہے۔

دوسرا سبب اس "نغمہ سنجی" کا جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا اگلے مذاق کا فقدان

ہے۔ پہلے زمانہ مین ایک خاص جماعت ان شعرا کی ہوا کرتی تھی جو مشاعرون مین پڑھتے وقت شعر کا مفہوم اپنی ترنم ریزی۔ حرکات اور سکنات سے بھی ادا کردیا کرتے تھے۔ گویا وہ زبان اور عمل دونون طریقون سے شاعری کا حق ادا کرتے تھے۔ ایسے شعرا مین ریختی پڑھنے والے نمایان خصوصیت رکھتے تھے۔ اور اس صف مین جان صاحب سب سے آگے نظر آتے ہین۔ لیکن موجودہ دور مین ایسی ہستیان کہین نہین دکھائی دیتین۔ اور حقیقت تو یہ ہے ان لوگون کی نقل اتارنا کوئی آسان بات نہین ہے۔ لیکن تاہم اسوقت بھی ایسے لوگ موجود ہین جو شعر پڑھتے وقت اعضا کی جنبش اور اشارون کا استعمال کرتے ہین۔ شاید یہ لوگ ان ریختی پڑھنے والون کا چربہ ہی اتارنے کی کوشش مین یہ حرکتین کرتے ہین۔ اور بہت ممکن ہے کہ انھین کی دیکھا دیکھی نغمہ سرائی کا بھی رواج پڑ گیا ہو۔ بہرحال گمان غالب یہی ہے کہ انھین دووجوہ کی بنا پر شعرا مین نغمہ کا دستور ہوا۔ لیکن اسکی کوئی صحیح تاریخ نہین پیش کی جاسکتی کہ اسکی ابتدا کب اور کہان ہوئی۔

ایک تیسرا اگر میرے خیال مین غیر معقول سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مغربی تہذیب نے شعرا کی ذہنیت کو موسیقی کی طرف مائل کردیا ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہین کیا جاسکتا کہ شعر کا زیور نغمہ ہے۔ لیکن وہ نغمہ نہین جو عیوب کو چھپانے کا ذریعہ بنایا جائے۔

ماسٹر:۔ (نقشہ کی طرف اشارہ کرکے) احمد بتاؤ لقطے میں پانی کہاں تک ہے؟

احمد:۔ (غور سے دیکھکر) اگر نقشہ میں پانی ہوتا تو بھیگ نہ جاتا۔

انتخابات

نغمۂ الوہیت

میں تیرے دروازہ پر آؤں، اور یوں ہی خستہ و خراب، ایسے ہی افسردہ و مضمحل واپس چلی جاؤں! اے بادشاہ! میرے ہاتھ خالی تھے، اور ضرورت شدید، مگر تو نے مجھ پر رحم نہیں کیا۔ شام ہونے سے پہلے، شہر کے سارے مفلس و نادار سائل، دور کے تمام تھکے ہارے مسافر آئے، تو اپنی شاہانہ عظمت کے ساتھ، اپنے احترام و وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اچانک ان لوگوں کے درمیان آگیا، میں نے دیکھا، اے آقا تیرے ہی تبسم کی ضیاء میں، تیری ہی مسکراہٹ کی روشنی میں، تو نے اُنھیں کچھ مرحمت کیا، اور وہ خوش خوش چلے گئے، لیکن میں ویسے ہی محتاج، ویسی ہی گداگر کھڑی رہی، اور تیری نظر میری طرف سے پھر گئی،

دوسرا دن گذر جانے کے بعد، میں اُن لوگوں کے ساتھ پھر آئی، جو گذرگاہوں اور سڑکوں پر، جو گلیوں اور کوچوں میں، مانگتے ہوئے تیرے دروازے کی طرف آ رہے تھے، تو نے مجھے دیکھا اور کچھ نہیں بولا، میں نے سمجھا آج میری آرزو پوری ہو گئی، اس لئے کہ میرے پاس کچھ نہ تھا، اور میری احتیاج کثیر، تھوڑی دیر کے بعد تو اپنے آراستہ ملبوس، اپنے مزین تاج کے ساتھ نکلا، اور اُن کو کچھ لطف کیا، میں نے بھی مضطربانہ اپنا ہاتھ بڑھا دیا، کہ شاید، وہ چشمہ جس نے ملکوں کو سیراب کر دیا، وہ سمندر جس نے کائنات کو مستغنی بنا دیا، میرا دامن بھی تر کر دے۔ مگر تو نے نگاہیں پھیر لیں، اور میں ویسے ہی بے یار، ویسے ہی بے کس رہ گئی، شہر کے حاجت مند، فخر و غرور سے مجھے دیکھتے ہوئے، اور میری ناسازگاری بخت کا طعنہ دیتے ہوئے؟ میرے پاس سے گذر گئے، میں ہنوز خاموش تھی کہ تو نے مجھے دیکھا، میں نے کہا ایک درماندۂ عاجز، ایک تنگ دست و بے نوا، ایک غریب و بھکاری لڑکی کے

انتخابات

سانحۂ سلوک، اے تو دولتمند! یہ سُنکر تو نے ایک نغمۂ اُلوہیت گایا اور گاتا رہا، حتیٰ کہ میرا قلب تیری دولت سے مالا مال، اور میرا دل تیری مسرت سے معمور ہو گیا؛
مجھے کیا خبر تھی! اے مالک! کہ "تو یہ چاہتا ہے"

افکار عالیہ

(مولانا احمر ترمذی)

ابتو جنوں نے اور بھی زنجیر دیکھ لی ۔۔۔ اک یہ تھی چارہ ساز کی تدبیر۔ دیکھ لی
پنہاں ہے اس سکوت میں وہ داستانِ غم ۔۔۔ روئیگی خلق گر مری تصویر دیکھ لی
دیکھیں گی اور کیا مری ناکام حسرتیں ۔۔۔ اِک دیکھنے کی چیز تھی تقدیر۔ دیکھ لی
تو اور خیالِ صحبتِ بزمِ نشاط خیز ۔۔۔ اے غم نصیب! خواب کی تعبیر دیکھ لی
کھلتے ہیں اشکِ خوں سے کہیں عقدہ ہائے دل ۔۔۔ تیری بھی انتہا خلشِ تیر دیکھ لی
اب مٹ چکا فریب خیالِ طلسم ساز ۔۔۔ مٹتی ہے روز بنکے جو تعمیر دیکھ لی
محویتِ خیال کی یہہ شوخیٔ نظر ۔۔۔ اُس حسنِ صد حجاب کی تنویر دیکھ لی

آہوں سے چھا گیا ہے دُھواں اس کی بزم میں
احمرؔ مرے کلام کی تاثیر دیکھ لی!

نسائیات

مضمون نگار خواتین

(از ریحانہ خاتون عباسی)

ان دنوں ملک کے مختلف پرچوں اور رسالوں میں مضمون نگار خواتین کے متعلق مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ اس قسم کے اکثر مضامین کا موضوع یہی ہے کہ آجکل کی خواتین شاعری اور فسانہ نگاری کے ذریعہ انتہائی بے غیرتی' بے باکی' اور حیا فروشی کا ثبوت دے رہی ہیں چنانچہ بعض مضامین میں تو ایسی خواتین کے تخیلات اور جذبات پر حد سے زیادہ تجاوز کرکے غیض و غضب کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور ان کے افکار و حسیات کو مکدر بتایا گیا ہے۔

بعض مضامین نگاروں نے یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ ان خواتین کے قابل نفرت اور ناشائستہ مضامین نظم و نثر سے مثال کے طور پر اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کو پڑھکر انسانی حمیت و غیرت کو صدمہ پہنچتا ہے۔

سب سے پہلی بات جو ان واقعات کو دیکھ کر صاحب قلم بہنوں کے دماغ میں پیدا ہونی چاہیئے وہ یہ حقیقت ہے کہ ان کے خیالات کا ہر پہلو اور ان کی قلم کی ہر جنبش جنس مخالف کی دنیا میں بتصرانہ اور تنقیدی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ اور اس لئے انھیں اپنی دماغی اور دلی کیفیات کو تحریری جامہ پہنانے میں انتہائی ہوشیاری اور احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

مضامین کے قابل اعتراض ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ وہ خود کرسکتی ہیں۔ اس قسم کے اشعار و افسانے جو حقیقت میں بازاری باتوں کے دفتر ہوں مردوں کی قلم سے بھی قابل نفرت خیال کئے جاتے ہیں۔ پھر خواتین کے لئے جنھوں نے ابھی کل سے شد بد شروع کی ہے ایسی باتیں کب زیبا ہیں؟۔

دنیا سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔ اقوام عالم میں زبردست انقلابات رونما ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ترقی و تنزل دنیا کا خاصہ ہے۔ بیشک ہم پستی کے عالم میں ہیں

اور ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم دفعتاً کود کر اس بام ارتقا پر پہونچ جائیں جس کے بعد اقوام کا تنزل شروع ہوتا ہے۔

کوشش کا سلسلہ جاری ہے۔ خواتین کی طرف خاص توجہ ہے۔ اور انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جبکہ ہندوستانی خواتین بھی "مشرقی تمدن" کی زندہ کرنے والی اور "اپنی کھوئی ہوئی عظمت" کو واپس لینے والی کہلائیں گی۔ مگر اس کے لئے سعی پیہم اور استقلال چاہئے۔ نہ یہ کہ ترقی کی دھن میں ہم آنکھیں بند کر کے شرم و حیا اور دین و ایمان بھی صدقہ کر بیٹھیں۔

میں تو اپنی مقتدر بہنوں کو یہی مشورہ دونگی کہ ابھی وہ اپنی شاعری اور مضمون نگاری صرف خواتین کی ترقی و بہبود کے لئے وقف کر دیں اور جو کچھ کہیں اور لکھیں وہ محض اسی کے متعلق ہو۔

لطائف

ایک معلم نے شاگرد کو ہدایت کی کہ گفتگو بفصاحت و بلاغت کرنا چاہیئے۔ طالبعلموں نے تائید کی۔ ایک روز چلم کی چنگاری معلم صاحب کی پگڑی پر جا پڑی۔ شاگرد نے اطلاع کی۔ "جناب استاد صاحب مولانا و مقتدانا قبلہ و کعبہ ام حضور کی دستار عظمت آثار پر ایک اخگر ناہنجار شرر بار آتشکدۂ چلم سے پرواز کر کے شعلہ افگن ہے۔"

اس عرصہ میں معلم صاحب کی نصف پگڑی جل گئی۔ معلم صاحب فرمانے لگے "خود کردہ را علاجے نیست۔"

کسی جنرل نے بعد فتح کرنے مہم کے ایک سپاہی سے پوچھا کہ تو نے اس فتح میں کیا بہادری کی۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے ایک حریف سپاہی کا پانوں کاٹ ڈالا۔ جنرل نے کہا کہ پانوں کیوں کاٹ ڈالا اس سے کیا حاصل ہوا۔ سر کیوں نہ کاٹ ڈالا۔ سپاہی بے تحاشا بول اٹھا کہ حضور سر تو پہلے ہی سے کٹا ہوا تھا۔

نسائیات

جہیز میں کیا دو؟

(از ع - ص - بنارس)

اس پرآشوب زمانہ میں جبکہ ہر طرف گرانی کا بازار گرم ہے۔ عموماً ہر جہیز دینے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ کونسی ایسی چیز پیش کرے جو کم خرچ بالانشیں کی مصداق ہو۔

اول تو ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں میں جہیز کی قدیم رسم نہایت بے مصرف ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ جہیز پانے والی کو تھوڑا بہت اثاثہ ہاتھ لگ جاتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات وہ بجائے فائدہ بخش اور کارآمد ہونے کے وبال جان ثابت ہوتا ہے۔ پلنگ، مسہری، صندوق، اور اسی قسم کی دوسری اشیا ایسی چیزیں ہیں جو تقریباً ہر گھر میں کافی موجود ہوتی ہیں اور اگر بفرض محال نہ بھی ہوں تو ان کا مہیا کر لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ پھر ایسی چیزیں لیکر سوائے اس کے کہ ان کی صفائی اور نگرانی کی ایک بلا ضرورت مشکل کا اور اضافہ کر لیا جائے اور کوئی فائدہ نہیں۔

اس لئے جہیز دینے کے لئے سب سے عمدہ طریقہ تو یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو یہ معلوم کر لیا جائے کہ جہیز پانے والی کے یہاں ضروریات زندگی کی چیزوں میں کس چیز کی کمی ہے اور پھر وہی چیزیں دیجائیں۔ اس سے دینے اور پانیوالے دونوں فریق کو مسرت اور اطمینان حاصل ہوگا۔ دینے والے کو یہ خوشی ہوگی کہ اسباب جہیز میں اس نے جو کچھ خرچ کیا ہے وہ بیکار نہیں گیا۔ بلکہ پانے والی کی آرام رسانی میں صرف ہوا ہے۔ دوسری طرف پانیوالی کو یہ اطمینان ہوگا کہ بلاکسی ردوکد کے اسے اسکی ضرورت کی چیزیں میسر آگئیں۔

لیکن اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو اپنے ہی قیاس کی بناء پر ایسی چیزیں دیجائیں جنکی عام طور پر ہر گھر میں ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جہیز پانے والی کے مذاق سے بخوبی واقفیت ہے تو اس کے لئے وہی چیزیں زیادہ موزوں ہونگی جو اسے مطلوب ہوں۔ خواتین کی عام حالت کو دیکھتے ہوئے تو اسکی امید بہت کم ہوتی ہے۔ تاہم اگر جہیز پانے والی تعلیم یافتہ ہے تو اس کے لئے مختلف کارآمد علوم و فنون کی کتابیں اور اسی قسم کی دوسری

بیش بہا چیزیں ، زیادہ قابل قبول ہونگی۔

اسی سلسلہ میں اصل موضوع سے ذرا ہٹکر اگر لڑکیوں کی تعلیمی حالت پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ قدرتاً لڑکیاں والدین کے گھر سے جس چیز کے حاصل کرنے کی مشتاق اور مستحق ہوتی ہیں وہ تعلیم جیسی بے بہا دولت ہے۔ لیکن یہاں اسی کا ماتم ہے۔ جب کہیں شادی کا تذکرہ چھڑتا ہے تو اور باتوں کے ساتھ سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ "لڑکی تعلیم یافتہ ہے؟" معلوم نہیں وہ زمانہ کب آئیگا جب اس استفسار کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

الغرض جہیز کے لئے۔ علم خانہ داری ، دستکاری اور مفید پند و نصائح کے قسم کی لطیف مگر ہمیشہ ساتھ دینے اور کام آنے والی چیزیں سب سے بہتر ہیں۔

دنیائے ادب میں "ادبستان" اردو کا
سنہ ۲۶ - خیر مقدم - ۱۹ عیسوی

(از جناب مائل اجمیری)

گلشن ہستی میں ہے اقدام مہمان ادب
نغمہ پیرا چار سو ہیں عندلیبان ادب

قمری سیمیں بدن اور طوطی شیریں دہن
زمزمہ سنجان گلشن ہیں غزلخوان ادب

چہچہے یہ کس لئے ، یہ زمزمہ ریزی ہے کیوں
کون ایسا گلبدن آیا ہے مہمان ادب

ہوگیا آخر یقین ، وہ شان والا دلربا
ہے ادیب خوشنوا ہے زیب عنوان ادب

آج اس کا حسن وقف جلوہ آرائی ہوا
ہوگئے گھر گھر میں پیدا سازو سامان ادب

بیگماں آئیگا اسکو وجد "ادبستان" پر
دل میں مائل جس کے جا بیٹھا ہے پیکان ادب

مقالات

اسلام اور ملوکیت

(از راجہ غلام حیدر خان صاحب)

ہندوستان کے اسلامی حلقوں مین عام خیال یہی ہے کہ موتمر مکہ جس کے حالات آجکل اسلامی اور غیر اسلامی اخبارات مین شایع ہو رہے ہین دنیا کی سب سے پہلی موتمر ہے جو تیرہ صدی کے بعد مکہ معظمہ مین سلطان ابن سعود کی دعوت پر منعقد ہوئی۔ لیکن میرے خیال مین یہ دوسری مؤتمر اسلامی ہے۔ دس سال ہوئے کہ "مدینہ کا نفرنس" کے نام سے اردو کی ایک کتاب جسکی ضخامت غالباً دو سو سے زیادہ صفحے تھی۔ اور جسے لاہور کے ایک مسلمان تاجر کتب نے شائع کیا تھا میری نظر سے گذری۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ آج سے اندازاً تین سو سال پہلے مدینہ مین دنیائے اسلام کے مقتدر علمار کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کا بجز اس کے اور کوئی مقصد نہ تھا کہ نہ صرف اسلام کے زوال و انحطاط کے اسباب پر غور کیا جائے۔ بلکہ جو تجاویز دین قیمہ کے استحکام اور فرزندان توحید کی فلاح و بہبود کے لئے منظور کی جائین ان پر عمل کیا جائے۔

اس کتاب کے جس باب کو مین نے خاص دلچسپی سے پڑھا وہ مسلم فرمانرواؤں کے غیر محدود اختیارات کے متعلق تھا۔ تاریخ ہمین اس المناک اور جگردوز حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ دنیا مین بادشاہون کی مطلق العنانی اور خود مختاری ایسے خوفناک ہنگامون، فتنون اور خونریزیون کا سرچشمہ رہی ہے کہ ان کے تصور سے شاید ابلیس بھی کانپ اُٹھے۔ اگر اس مطلق العنانی اور خود مختاری کی داستان قلمبند کی جائے تو بلا مبالغہ اس سے سینکڑون ضخیم جلدین تیار ہو سکتی ہین۔ ایسی ملوکیت بنی نوع انسان کے لئے ایک لعنت ثابت ہوئی ہے کسی ملک یا قوم کی اس سے زیادہ سیاہ بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ملوکیت کے استبداد کی تختہ مشق

مقالات

بتائی جائے ۔خالق ذوالجلال نے دنیا مین پیغمبر اسی لئے بھیجے کہ وہ خدا کی مخلوق کو ظالمون کے ظلم سے بچائین اور انھین صراط مستقیم دکھائین تاکہ وہ اپنے خالق کو پہچانین اسکے احکام پر چلین اور سوائے اس کی ذات کے اور کسی طاقت کے سامنے اپنی گردن نہ جھکائین ۔

حضور سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی پیغام لے کر آئے ۔ آپنے دنیا کے بڑے بڑے گردن افرازون تک اپنی یہ آواز پہنچائی کہ پرستش کی سزاوار صرف خدائے واحد کی ذات ہے ۔ جس کا کوئی شریک نہین ۔ اور انسانون مین صرف وہی لوگ اعلیٰ اور افضل ہین جن کے اعمال اچھے ہین ۔ جب تک مسلمان اس مبارک تعلیم پر عامل رہے وہ باوجود قلیل التعداد ہونے کے اپنے دشمنون پر غالب رہے اور ایک صدی کے اندر دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھاگئے ۔ یہ بارگاہ خداوندی سے مسلمانون کو وہ انعام ملا جس کا ان سے وعدہ کیا تھا کہ تمہین زمین پر اپنا خلیفہ بنائین گے ۔ صدیق اکبر کی خلافت کے بعد فاروق اعظم کی حکومت ملوکیت نہین بلکہ وہ حقیقی جمہوریت تھی جس کی بنا دنیا کے مصلح اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے مبارک ہاتھون سے ڈالی تھی ۔ کیا دنیا کی کوئی موجودہ جمہوری سلطنت اس آزادی و بیباکی کی مثال پیش کر سکتی ہے جو ایک عامی کو فاروق اعظم جیسے باجبروت خلیفہ کے دربار مین حاصل تھی ؟ ہرگز نہین ! ۔ لیکن جب مسلمانون نے خداوند کریم کے اس سب سے بڑے عطیہ (جمہوریت) کی قدر نہ کرنے سے ناشکرگذاری کے جرم کا ارتکاب کیا تو وہ ملوکیت اور استبداد کی لعنت مین گرفتار ہوگئے ۔ وہ اس کے آہنی پنجہ سے رہائی پانا چاہتے ہین وہ آزادی اور حریت کے حصول کے لئے اپنی پوری قوت صرف کر رہے ہین لیکن چونکہ انھون نے خدا کی رسی کو دیدہ و دانستہ چھوڑ دیا تھا اس لئے باوجود ہزار کوشش کے وہ ناکام اور نامراد نظر آتے ہین ۔

ملوکیت اور استبداد کے بھی وہ خوفناک نتائج تھے جو مدینہ کانفرنس کے انعقاد کی وجہ تحریک تھے ۔ مدینہ کانفرنس کی مطبوعہ روئداد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرزندانِ توحید

مقالات

کی پستی اور تنزلی کے جو اسباب اس وقت غور و فکر کے قابل معلوم ہوتے ہین وہی آج سے تین صدی پہلے دنیائے اسلام کے علما کی خاص توجہ کا مرکز سمجھے جاتے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ مدینہ کانفرنس مین مسلمان فرمانرواؤن کی خودمختاری پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی گئی۔ افسوس ہے کہ میری قوت حافظہ کمزور ہے اور مین دس سال پہلے کے پڑھے ہوئے واقعات کو بجنسہ دُہرا نہین سکتا لیکن ملوکیت پر بحث کا یہ پہلو یقیناً ناظرین کرام کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا کہ مدینہ کانفرنس کے تمام مقتدر علما نے بالاتفاق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اسلام کے بقا اور استقلال کے لئے یہ ضروری ہے کہ بادشاہ کو ہر امکانی طریقہ سے سمجھایا جائے کہ وہ رعایا کے حقوق کے متعلق اپنے فرائض اسلامی قوانین کے مطابق بجا لائے۔ اگر بادشاہ لہو و لعب مین پڑا ہوا ہے تو تفریحی مشاغل ہی کے دوران مین اس کی اصلاح کی جائے۔ غرضکہ بادشاہ کی اصلاح کے لئے وزرا امرا اور علما کی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ اور اگر ان تمام کوششون اور تدبیرون کے باوجود بادشاہ راہ راست پر نہ آوے تو پھر سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہین کہ بادشاہ کی زندگی کا تلوار سے خاتمہ کر دیا جائے تاکہ جمہور کو ملوکیت اور اس کے ہولناک نتائج سے نجات ملے۔ یہ ہے مفہوم مذکورۂ بالا بحث کا۔

دنیا کے ادیان مین اسلام اور صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو حقیقی معنون مین انسان کی آزادی کا ضامن ہے۔ قرآن کریم مین فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اس قدر سبق آموز اور عبرت انگیز ہے کہ اگر ہر مسلمان اپنی زندگی مین اس کی حقیقت کو پیش نظر رکھے تو کسی فرعون کی فرعونیت اس کے دل پر اثر نہین ڈال سکتی۔ کلام پاک مین اس قصہ کے مذکور سے یہی مقصود ہے کہ مسلمان سوائے اپنے خالق کے دنیا مین کسی شخصیت سے مرعوب نہ ہو خواہ وہ کیسی ہی بارعب اور پُرجلال ہو۔ اگر جابر اور ظالم بادشاہ

مقالات

کی فرمانبرداری اور اطاعت ہر طرح سے جائز سمجھی جاتی تو خداوند کریم حضرت موسیٰ کو فرعون جیسے باجبروت اور طاقتور بادشاہ پر غالب نہ کرتا۔ حالانکہ دنیاوی پہلو سے حضرت موسیٰ کو فرعون سے وہی نسبت تھی جو رائی کو پہاڑ سے ہے۔ لیکن تمام دنیا جانتی ہے کہ فرعون آخر اپنی بداعمالیوں اور ظالمانہ حرکتوں کی پاداش میں جو دراصل خالق کی مکر ور مخلوق کے دلوں پر اپنی خدائی کا سکہ بٹھانا چاہتا تھا کس طرح دریائے نیل میں غرق ہوا اور اس کی خدائی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا فرعون اپنے اس اقتدار اور حکومت کو قائم رکھنا چاہتا تھا جو بنی اسرائیل کے لئے ایک لعنت تھی اور خدا نے حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے انھیں اس لعنت سے نجات دی۔

لیکن باوجود اس بصیرت افروز واقعہ کے دنیا میں فرعونیت کا خاتمہ نہیں ہوا تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں فرعون صفت ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے طاقت اور حکومت کے نشہ میں فساد اور ظلم کا بیج بویا اور لوگوں کو ان کے جائز اور پیدائشی حقوق سے محروم کیا۔ فساد اور ظلم کی سیاہ گھٹا سے چاروں طرف تاریکی چھاگئی اور جب لوگوں نے ظالم کے ظلم سے ڈر کر حق اور انصاف کی آواز بلند کرنے کے متعلق اپنے خالق کی ذات پر بھروسہ نہ کیا تو ان کی مصیبتیں اور پریشانیاں اور زیادہ بڑھ گئیں۔ مسلمان اگر ان مصیبتوں اور پریشانیوں سے نجات پانا چاہتے ہیں تو انھیں حضرت موسیٰ کے نقش قدم پر چلنا پڑیگا۔ جن کے دل میں سوائے اللہ کے ڈر کے اور کوئی ڈر نہ تھا۔ جب قرآن کریم نے فرعون اور حضرت موسیٰ کے قصہ سے انسان کی ملوکیت کا قصہ ہمیشہ کے لئے پاک کر دیا ہے تو ہر مسلم کا فرض ہے کہ وہ ملوکیت کے ناپاک اثرات کے مٹانے کے لئے ہر وقت کمربستہ رہے۔ ایسی ملوکیت جو جبر و استبداد اور غیر محدود اختیارات کا سرچشمہ ہے کسی صورت میں رعایا کی خوشحالی اور فارغ البالی کی ممد و معاون نہیں ہوسکتی۔ اسلام صرف اسی قسم کی ملوکیت کو جائز قرار دیتا ہے جس کی بنیاد خدا کی وحدانیت خدا کے خوف۔ تقویٰ اور پرہیزگاری۔ عدل و انصاف۔ اخوت اور محبت۔ ہمدردی اور فیاضی

مقالات

نیکی اور سچائی پر مبنی ہو۔ جو بادشاہ یا خلیفہ ان ربانی اصولوں کا حامل اور عامل ہوگا وہ صحیح معنون مین اللہ کے رسول کا نائب ہوگا۔

آج مسلمانون کا شیرازہ دنیا کے ہر حصہ مین منتشر نظر آتا ہے۔ وہ باوجود کثیر التعداد ہونے کے ہر جگہ دینی اور دنیاوی پہلو سے بحیثیت مجموعی پستی اور ذلت کے عمیق غار مین گرے ہوئے ہین وہ اس غار سے نکلنا چاہتے ہین مگر کوئی کوشش اب تک کارگر نہین ہوئی۔ تھوڑے سے غور وفکر کے بعد ہمین اپنی اس تباہی اور بربادی کی وجہ صاف معلوم ہوجائیگی اور وہ یہ ہے کہ ہم عملاً خدا کی وحدانیت اور اس کی حقیقت کے قائل نہین۔ اگر ہم خدائے ذوالجلال کی ہستی کو اپنی اس فانی زندگی کا مرکز قرار دین۔ اور ہمیشہ اس نکتہ کو ملحوظ رکھین کہ ہماری نجات اسی کی رضا جوئی پر ہے تو ہم کبھی صراط مستقیم سے نہ بھٹکین۔ لیکن جب ہر شخص اسلام کی جمہوریت کی عظمت برقرار رکھنے کے بجائے اپنے نفس کی خلافت قائم کرنے کی تدابیر مین منہمک رہیگا تو وہ گویا دیدہ ودانستہ خدا کی رسّی سے علیحدہ ہوگیا جس کے مضبوط تھامنے پر اس کی نجات کا انحصار تھا۔ بکھری ہوئی طاقتین صرف اسی صورت مین تحیر خیز اور انقلاب آفرین نتائج پیدا کرسکتی ہین کہ وہ ایک مرکز پر جمع ہون۔ خدا کی وحدانیت پر عملاً ایمان لانا یہی ہے کہ فرزندان اسلام من حیث الجماعت اپنی تمام طاقتون کو خواہ وہ جسمانی ہون یا روحانی اخلاقی ہون یا دماغی صرف ایک مرکز سے وابستہ رکھین تاکہ وہ اسلام کی دینی اور دنیاوی برکتون سے مستفید ہون۔ اسلام کی مرکزی طاقت ایک ایسا پورہاؤس (بجلی گھر) ہے جس کے عظیم الشان نتائج ایک معمولی انسان کے فہم وادراک سے بالاتر ہین۔ مسلمانون نے دنیا مین جہان کہین اس پورہاؤس سے کام لیا وہان اُجالا ہوگیا۔ اور وہ قومین جو تاریکی اور ضلالت مین بھٹک رہی تھین اسلام کی جمہوریت اور مسلمانون کی عالمگیر اخوت کے صدقہ مین ان کی قوت بازو بن گئین۔ مگر اس بدبختی اور نامرادی کا کیا علاج ہوسکتا ہے کہ باوجود سب کچھ دیکھنے اور جاننے کے مسلمان ایک مرکز پر جمع نہین ہونا چاہتے۔

اور اس لئے نہیں ہونا چاہتے کہ ان میں سے ہر اس شخص کو جسے اپنی محدود قابلیت اور رسوخ پر کچھ بھی تاثر ہوتا ہے اپنا علیحدہ مرکز اور دائرہ عمل قائم کرنے کی فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں فرزندانِ توحید کی تعداد آٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ اور اگرچہ دنیا کا کوئی اسلامی ملک آبادی کے اعتبار سے ہندوستان کا مقابلہ نہیں کرسکتا لیکن کوئی نہیں جانتا کہ مسلمانانِ ہند کی پستی اور ذلت اسلام کے جسمانی نظام میں ایک ایسا رستا ہوا ناسور ہے جس کا اثر اسلامی حکومتوں کی آزادی اور خودمختاری کے لئے خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں سینکڑوں نہیں ہزاروں اسلامی انجمنیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا مقصد اور نصب العین یہ ہے کہ مسلمانوں کا دین اور دنیا درست ہو جائے مگر جب نتائج پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو نتیجہ برعکس نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی اجتماعی قوت روز بروز زائل ہو رہی ہے اور زائل کیوں نہ ہو جبکہ ان کی پوری قوت ایک دوسرے کی تخریب اور تذلیل پر صرف ہو رہی ہے صاف ظاہر ہے کہ جسقدر زیادہ انجمنیں بنائی جائیں گی یا دوسرے الفاظ میں جسقدر زیادہ مرکز قائم کئے جائیں گے مسلمان زیادہ تباہ اور پریشان حال ہوتے جائیں گے۔

وہ کیا چیز ہے جو افراد یا جماعتوں کے اندر ایک علیحدہ مرکز قائم کرنے کا ہلاکت آفریں جذبہ پیدا کرتی ہے؟ وہی ملوکیت یعنی ایک چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر اپنے اقتدار کے دائرہ کو محض اس مقصد سے وسیع کیا جائے کہ اس سے نفسانی خواہشات کے پورا کرنے کی صورت نکل آئے۔ نفسانی خواہشات کا سب سے بڑا عنصر ہر ممکن سے ممکن طریق سے سیم و زر کی فراہمی ہے جس کے ذریعے لوگوں کے اخلاق اور ایمان کی متاع پر کامیابی کے ساتھ حملہ نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا میں بڑی بڑی سلطنتوں کی بنیاد رکھنے والے اپنے جنگی کارناموں کی وجہ سے خواہ کیسے ہی بڑے آدمی خیال کئے جائیں لیکن اخلاقی اور روحانی پہلو سے ان کی زندگی ایسی نہیں جو انسانیت کے لئے مایہ ناز ہو۔ وہ ابتدا میں ڈاکو تھے اور جب ان کی ڈکیتی کا دائرہ زیادہ وسیع ہوتا گیا اور خدا کی کمزور مخلوق نے ان کی وحشیانہ طاقت کے سامنے سرِ تسلیم خم

کردیا تو ان کی ڈکیتی نے ملوکیت کی صورت اختیار کرلی۔ ملوکیت کے حامیوں نے بہت جلد اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اگر دنیا میں ملوکیت کی بنیادیں مستحکم ہوسکتی ہیں تو اسی صورت میں کہ جمہور کے دلوں سے جمہوریت کے تصور کا نقش حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے تاکہ بادشاہ انکی نافرمانی اور سرکشی کے نتائج سے خواہ وہ کیسے ہی جائز مطالبات پر مبنی ہوں محفوظ رہے چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ملوکیت پرستوں نے دنیا کے سامنے مذہبی رنگ میں یہ عقیدہ پیش کیا کہ بادشاہ خدا کا سایہ ہے۔ شاہ پرست جماعت جس کی ذاتی اغراض اس امر کی متقاضی تھیں کہ اس عقیدہ سے لوگوں کے دلوں پر ہیبت اور خوف کی کیفیت طاری کی جائے بتدریج حصول مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ عوام نے سچ مچ بادشاہ کو خدا کا سایہ سمجھنا شروع کردیا۔ بادشاہ اور رعایا کے درمیان رعب اور اقتدار کی ایک ایسی وسیع اور عمیق خلیج حائل ہوگئی کہ کمزوروں اور مظلوموں کا بادشاہ تک پہنچنا ناممکنات سے تھا۔ شاہ پرستوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ رعایا کے جذبات اور حسیات سے بادشاہ کو بالکل بے خبر رکھا جائے تاکہ انھیں من مانی کارروائی کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

آہ! انسان کی بیچارگی مظلومیت اور غلامانہ زندگی نے اس کی سیرت کو اس قدر مسخ کردیا ہے کہ اس کے نزدیک وہ فانی ہستی جس کے ہاتھ سینکڑوں نہیں ہزاروں بیگناہوں کے خون سے آلودہ ہیں جس نے غریبوں یتیموں اور بیواؤں کے مال کو غصب کرکے اپنا خزانہ بھر رکھا ہے جس نے بیکسوں اور بے زبانوں کے حقوق کی پائمالی سے اپنے جاہ و جلال کی بنیاد مستحکم کر رکھی ہے ظل اللہ یعنی خدا کا سایہ ہے حالانکہ وہ اپنے افعال اور اعمال کے لحاظ سے خدا کا نہیں بلکہ شیطان کا سایہ ہے۔ ایسی ظالم ہستی کو خدا کا سایہ قرار دینا یقیناً ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ دنیا کے جن جن حصوں پر فرعون صفت بادشاہوں کا سایہ پڑا وہاں جلدی یا دیر میں قہر الٰہی نازل ہوا اور ان کی سلطنتیں ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں۔ ہمیں رنج اور افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ بجز شاذ مستثنیات کے مسلمان بادشاہوں نے بھی اسلام کی

جمہوریت کے مقدس اصول کا مطلق احترام نہ کیا۔ اُنھوں نے خدا کی فرمانبرداری اور رضا جوئی پر اپنی شوکت وسلوت کے قیام کو مقدم اور ضروری خیال کیا۔ یہ اسی نافرمانی اور سرکشی کا نتیجہ ہے کہ فرزندانِ توحید جن کی تعداد اس وقت چالیس کروڑ کے قریب بتائی جاتی ہے دنیا کے ہر حصہ میں ذلیل وخوار نظر آتے ہیں۔ وہ اس گئی گذری حالت میں بھی دنیا کی محفل اقوام میں اپنے لئے ایک معزز جگہ حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ آج سے تیرہ سو سال پہلے کے بھولے ہوئے سبق کو اپنی زندگی کا دستور العمل قرار دیں جسکی بدولتؐ باوجود مٹھی بھر ہونے کے اپنے دشمنوں پر بھاری تھے۔ مسلمانوں کی ہستی کا راز ان کی کثرتِ تعداد میں نہیں بلکہ قوت عمل میں پوشیدہ ہے۔

لڑکا۔ ابا۔ آج میں نے ایک پیشنگوئی کرنے والے کو اپنا ہاتھ دکھایا۔ اس نے کہا کہ تمہیں ایک نئی سائیکل ملیگی۔

باپ۔ اسی لئے میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ ہاتھ دیکھنے والے کبھی سچ نہیں کہتے۔

ضعیف العمر معلمہ۔ لڑکیو! بتاؤ "میں خوبصورت ہوں" میں کونسا زمانہ پایا جاتا ہے۔

ایک لڑکی۔ استانی جی۔ ماضی۔

سوال۔ کیا تم اس کے شوہر ہو۔

جواب۔ نہیں میں اب اس کا بھائی ہوں۔ کیونکہ اس نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔

رام گنیش گڑکری

رام گنیش گڈکری مرہٹی زبان کا ایک گرانمایہ شاعر گذرا ہے۔ آغا حشر کاشمیری کی طرح یہ مرہٹی کا زبردست شاعر۔ ڈرامہ نویس اور ادب لطیف کا انشاء پرداز تھا افسوس کہ نہایت کم عمری ہی میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر گیا مہاراشٹر کے باشندے اس کی جوانا مرگ کو اس وقت تک مرہٹی زبان کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان تصور کرتے ہیں۔ اس کی تصنیفات میں۔ پلتبہ پربھاؤ۔ بھاؤ بندھن۔ راج سنیاس۔ رکام ناجی اور رکام گیری۔ وغیرہ نہایت ہر دلعزیز کتابیں ہیں اور مرہٹی لٹریچر کی سرمایۂ ناز خیال کی جاتی ہیں۔

ذیل میں ہم اس زبردست شاعر کی ایک مختصر نیچرل نظم کا شگفتہ ترجمہ دیتے ہیں۔ ہم نے "ادبستان" کی اس اشاعت کے لئے اس کی بیشمار نظموں میں سے جس نظم کا انتخاب کیا ہے۔ وہ اردو کے لحاظ سے "ایک پامال" موضوع پر کہی گئی ہے۔ لیکن جس بلند پروازی۔ رنگینی اور ندرت کا ثبوت اس نظم میں دیا گیا ہے وہ شاید اردو میں ایک نئی چیز ہے۔

ہم انشاء اللہ اگلی اشاعت میں اس شاعر کی کوئی طویل "تاریخی" یا "نیچرل" نظم پیش کریں گے۔

(نوٹ) [اس سلسلہ میں جناب اسلامی کا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صاحب موصوف مرہٹی کے مشہور شاعر اور ادیب ہیں۔ اگرچہ آپ کے نام سے اردو دنیا بخوبی واقف نہیں ہے۔ تاہم آپ کی "سادہ بیانی" اور "حسن ترجمہ" آپ کے زور طبع کا کافی وکیل ہے۔]

کلی

(۱)

فضا کو کس درجہ اے کلی! تو شمیم گل سے بسا رہی ہے
تجھے کسی سے غرض نہیں ہے مگر تو سب کو ہنسا رہی ہے

(۲)

تو حسن صبر آزما سے اپنے دلوں پہ بجلی گرا رہی ہے!
مجھے تری پہلی مسکراہٹ ابھی تلک یاد آ رہی ہے!

---

(۱)

تری جو رنگت بدل رہی ہے نیا جنم اور پائیگی تو!
اور اس میں کیا شک! کہ ہم سبھوں کو بہت سی باتیں بتائیگی تو!

(۲)

دماغ و دل کے مطالعہ کو نقاب رخ جب اٹھائیگی تو!
سنی نہ ہونگی کبھی کسی نے! وہ داستانیں سنائیگی تو!

---

(۱)

میں پھول سے تیرے جوش ہوا ہوں مجھے تو جلوہ دکھا دیا کر
کلی کی صورت میں جب تو آئے اسی طرح کھل کھلا دیا کر

(اسلامی)

نسائیات

بسم اللہ خوانی

(از جناب بدرالدین صاحب)

یوں تو تمام مسلمان اس رسم کو حسب دستور ادا کرتے رہتے ہیں مگر ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اس تقریب کی غرض اور حقیقت سے واقف ہو کر اس کو انجام دیتے ہوں۔ جہاں تک دیکھا گیا ہے والدین محض ارمان نکالنے کی غرض سے بچوں کی بسم اللہ خوانی کیا کرتے ہیں جس سے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ آج بچے کی بسم اللہ خوانی بڑی دُھوم دھام سے کی اور کل سے کھیل کود شروع ہوا تختی باقاعدہ بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ بچے کی بسم اللہ کس غرض سے کی گئی اور اوس کی کونسی ضرورت لاحق ہوئی انھوں نے تو اس رسم کو ایک عام رواج اور خوشی منانے کا دن سمجھ لیا ہے۔ اگر اس تقریب کا یہی حال ہے تو مسلمانوں کے بچے کیونکر تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے بچے جو اکثر جاہل نظر آتے ہیں اسکی یہ ایک وجہ ہے ورنہ بعد بسم اللہ خوانی چار چار حروف بلا ناغہ پڑھائے جائیں تو رفتہ رفتہ بچے اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں۔ بچوں کی بسم اللہ خوانی کی عمر قدرتاً اثر پذیر ہوا کرتی ہے جو کچھ اوس وقت انکے ذہن نشین کیا جائے نقش ہو جاتا ہے۔

والدین کے حقیقی ارمان بچوں کی بسم اللہ خوانی سے اوس وقت ہی نکل سکتے ہیں جبکہ بچہ تعلیم یافتہ ہو۔ اگر بسم اللہ خوانی کی بسم اللہ ہی غلط نکلی اور بچہ اَن پڑھ رہا تو بیکے نقصان مایہ ودیگر شماتت ہمسایہ کا مضمون ہوگا۔ اسلئے کہ جاہل بچوں سے جو صدمے والدین کو پہنچتے رہتے ہیں اوس سے ہر فرد بشر واقف ہے۔

اگر والدین اس رسم کی اصل حقیقت کو مد نظر رکھکر بسم اللہ خوانی کریں اور اوسی دن سے

نسائیات

تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں تو آئندہ انھیں حقیقی خوشی حاصل ہوگی اور ان کے حقیقی ارمان نکلیں گے اتنا ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے تمام بچے خواندہ نظر آئیں گے شاید ہی کوئی ایسا کم نصیب بچہ ہوگا جو جاہل کہلائیگا۔ حقیقت کو نظر انداز کیا جائے اور فقط پلاؤ اور بریانی ہی کو بسم اللہ خوانی بھی جائے تو ممکن نہیں کہ اوس سے کوئی فائدہ پہنچے اور والدین کو اس سے کچھ سرخروئی حاصل ہو۔ البتہ تھوڑی دیر کے لئے انھیں اپنی غلط فہمی سے مصنوعی خوشی حاصل ہوسکتی ہے مگر اوس کا خمیازہ آگے چلکر عمر بھر انھیں بھگتنا پڑتا ہے۔

نوائے نعت

(از فرمودۂ بیگم مستور)

اک کیف بیخودی جو یہ دل میں جگر میں ہے
کس کی نگاہِ ناز کا جلوہ نظر میں ہے

جلوہ احد کے نور کا ہر بام و در میں ہے
اک نسبت سا وجود ہے جو بحر و بر میں ہے

نالے پہنچ نہ جائیں اجابت کے در تلک
لذت عجیب سوز میں درد جگر میں ہے

ہے عکس یہ بھی اک دلِ سوزاں کے داغ کا
تابش جو آفتاب میں۔ دھبہ قمر میں ہے

جس ہستیٔ بزرگ کی خاطر ہے دو جہاں
اللہ رے وہ ذات بھی نوع بشر میں ہے

موسیٰ سے کہدو۔ ہوگئے بیہوش کس لئے؟
جلوہ اسی حسین کا ہر دم نظر میں ہے

مستور کو خیال ہے روزِ حساب کا
گو حاصلِ حیات تری اک نظر میں ہے

پاسبانِ فلک

(از جناب عبدالغفور صاحب فاضل)

اے نخلِ شامِ مرغِ شب افروز ماہ تاب تو ہے نگارِ عام ترا حُسن بے نقاب
وہ طفلِ نور نور سے ہیں تیرے جلوہ تاب اور خواب گاہ غول نے پائی ہے تجھ سے آب
کیا طشتِ خاک نور سے پُر نور ہو گئی
ظلمت جہاں سے آن میں کافور ہو گئی

جب طشتِ خوں پہ ہو گیا جلوہ تیرا عیاں تھے طشتِ خاک نور سے پُر نور سب مکاں
سیارے تیرے نور سے سب ہو گئے نہاں لمعانِ نور سے ترے روشن ہوا جہاں
معمور تیرے نور سے گلزار بھی ہوئے
نیلی نقاب دشت بھی کہسار بھی ہوئے

تیرا عروج ماہ میں منظر ہلال تھا تو ہی زوالِ ماہ میں بدرِ کمال تھا
بے نور جنت بانو تھے اُن پر زوال تھا تیرا عروس عدن میں جاہ و جلال تھا
وہ طفلِ نور نے بھی ضیا تجھ سے پائی ہے
وہ صحن میں بھی روشنی تیری سمائی ہے

اے زینتِ فلک مہِ انور لقائے نور شرمندہ تارے ہوتے ہیں جب ہو ترا ظہور
فرحت ہو دل کو تجھ سے اور آنکھوں میں بھی ہو نور اے روشنیٔ حُسن جہاں باعثِ سرور
کیا چاندنی ہے تیری سفیدی ہے نور کی
گویا زمیں نے اوڑھی ہے چادر بلور کی

پُرلطف معنی خیز مضامیں اثر پذیر
یہ جدتِ طبیعتِ موزوں کی ہے نظیر
کیا قدرتِ خدا سے ملی طاقتِ بصیر
ہے روشنیِ طبیعت فاضل نشاط گیر
شہرت کی ہے غرض نہ تو خواہش ہے نام کی
فہمیدہ داد دیتے ہیں میرے کلام کی

نوائے منصور

(از حضرت منصور)

نوعِ انساں کو کبھی راہِ بقا ملتی نہیں
یہ وہ منزل ہے کہ بے حکمِ خدا ملتی نہیں
پوچھتے کیا ہو گنہگارِ محبت کا مآل
میں وہ مجرم ہوں جسے کوئی سزا ملتی نہیں
صبحِ محشر سے بندھا ہے رشتۂ شامِ فراق
انتہا ملتی ہے لیکن ابتدا ملتی نہیں
نقدِ دل دیکر کوئی کیوں ہو طلبگارِ جناں
قیمتِ جنسِ گراں روزِ جزا ملتی نہیں
مبتلائے عشق ہے منصور یارب خیر ہو
مرض وہ لاحق ہوا جسکی دوا ملتی نہیں

ایک شخص جسے تھرما میٹر دیکھنا نہیں آتا تھا مریض کے بخار کی کیفیت تھرما میٹر ہی کے ذریعہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے قیاس کی بنا پر سمجھ لیا کہ بخار ایکسو بیس ڈگری ہے چنانچہ اس نے فوراً ڈاکٹر کو لکھا فوراً آؤ۔ مریض کو ایکسو بیس ڈگری بخار ہے۔
ڈاکٹر نے اسی رقعہ پر جواب تحریر کرکے واپس کر دیا کہ "اگر یہ حالت ہے تو آگ بجھانے کے انجن کو

جواہر ریزے

(از جناب اصغر علی صدیقی)

(۱) عجلت میں جو کام کیا جاتا ہے، ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔ (۲) سننے سے انسان عقلمند ہوتا ہے اور بولنے سے متاسف (۳) زندگی کا بہترین راستہ اعلیٰ خیالی ہے (۴) راحت بلا تکلیف حاصل نہیں ہوتی۔ (۵) محنت سے صحت اور صحت سے قناعت ہے؛ (۶) لوگ شادی کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ دو ایک سے بہتر ہیں۔ (۷) ارادہ مستقیم ہے تو کوئی چیز ناممکن نہیں۔ (۸) وہ پیشہ اختیار کرو جس کے تم اہل ہو۔ (۹) آرام کا خیال رکھو مگر مشغول رہو (۱۰) ہر شخص اپنی قسمت کا معمار ہے، (۱۱) ایک عمدہ مثال مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ (۱۲) تین آدمیوں میں رازداری رہ سکتی ہے بشرطیکہ دو مر جائیں۔ (۱۳) عزت حاصل کرنے کیلئے عاجزی اختیار کرو۔ (۱۴) ہر عورت عقلمند مرد کو بیوقوف بنا سکتی ہے، لیکن بہترین عورت وہ ہے جو بیوقوف مرد کو عقلمند بنائے۔ (۱۵) اعلیٰ مراتب حاصل کرنیکے متمنی ہو تو اپنی اصلیت کو نہ بھولو۔ (۱۶) جب دو آدمی جھگڑتے ہوں تو تمکو ایک بیوقوف ملے گا۔ (۱۷) غلطی کا اعتراف اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ عذر لنگ کا نبھانا دشوار۔ (۱۸) عورت جب بلا سوچے گفتگو کرتی ہے تو اپنے حقیقی خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ (۱۹) اگر ہم میں سے ہر ایک دوسروں کے عیوب جانتا تو کوئی کسی سے نہ ملتا۔ (۲۰) ہم میں سے کوئی اس قابل نہیں کہ ایک اچھا آقا بن سکے، اور نہ کوئی اس قابل ہے کہ اچھا خادم ثابت ہو

غزل

(از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم-اے - بڑودہ)

سناتے ہیں عبث قصہ مجھے بخت سکندر کا — مجھے ملجائیگا لکھا ہے جو میرے مقدر کا
دماغ افلاک پر ہے گو ہیں فرش خاک پر بیٹھے — نظر آتا ہے دل ہی میں تماشا جم کے ساغر کا
تجھے مشق ستم کرنا ہے ظالم شوق سے کر لے — ہے پتھر کا کلیجہ میرا دل تیرا بھی پتھر کا
یہ ممکن ہے کہ راز الفت کا لب فشا نہ ہونے دیں — مگر کچھ اور ہی نقشہ ہے اپنے دیدۂ تر کا
بھری محفل میں وہ رسوا نہو جائے کہیں اے دل — نہ لینا نام بھولے سے بھی محشر میں ستمگر کا
نگاہِ یار میں پر لگ گیا ہے ناز کا ورنہ — نشانہ کب اڑا سکتا جو ہوتا تیر بے پر کا
جناب خضر کیا جانیں کہ مرنا اسپہ کیا شے ہے — حیات جاوداں ہے اسکی تیغ ناز کا چرکا
جو دیوانے ہیں تیرے ان کا عالم ہی نرالا ہے — نہ کچھ پا کی خبر ان کو نہ ہی کچھ ہوش انہیں سر کا
اسی کو دوستی کہتے ہیں کیا- انصاف کر تو ہی — تری ہر بات ناصح کام کر جاتی ہے خنجر کا
ہوئی ہے زر پرستی دین و ایمان آجکل ایسی — سوا اللہ کے کوئی نہیں اب آ ہ بے زر کا
کہیگا مدعی کیا جسپہ گذری ہو وہی جانے — مزہ پوچھو تو کچھ بسمل سے پوچھو آب خنجر کا
میں خوش اسپر بھی ہوں ساقی مگر ہے تیری بدنامی — دیا جام سفالین مجھکو وہ بھی خیر سے در کا
ہے دنیا مردنی کیا مال نواب اسکی نظروں میں — دو عالم سے ہے مستغنی جو سائل اسکے ہے در کا

انگلستان میں مچھلی کی تجارت

اگر آج کوئی مچھلی بیچنے والا اپنے کسی خریدار سے کہے کہ "جناب یہ مچھلیاں آج ہی سمندر سے آئی ہیں" تو وہ اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھیگا۔ کیونکہ لندن اور اسی قسم کے دوسرے بڑے شہروں میں یہ قطعی غیر ممکن ہے کہ اتنی کثیر تعداد میں تازہ شکار کی ہوئی مچھلیاں روز کی روز پہونچتی رہیں۔ لیکن وہ دن دور نہیں جبکہ مچھلی بیچنے والے بہت آسانی سے اپنے گاہکوں کو اس بات کا یقین دلاسکیں گے کہ "یہ مچھلیاں ابھی ابھی آئی ہیں" کیونکہ اب یہ انتظام کیا جارہا ہے کہ سمندر سے مچھلیاں پکڑ کر ایک تالاب میں پالی جائیں وہ اسی میں انڈے دیں۔ بچے پیدا ہوں اور تعداد بڑھتی جائے۔ چنانچہ یہ کام ایک چھوٹے پیمانہ پر شروع بھی کردیا گیا ہے جسمیں ایک بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مچھلیوں کو تالابوں میں مقید کرکے پالنے سے کیا فائدہ جبکہ سمندر ان سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن تحقیق و تفتیش سے معلوم ہوا ہے کہ مچھلیوں کے انڈے سمندروں میں سلامت نہیں بچتے جن سے کسی اضافہ کی امید ہو۔ کیونکہ دریائی جانوروں میں وہیل مچھلی سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے جانور تک اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور عموماً اسی پر گذارہ کرتے ہیں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک لاکھ انڈوں میں صرف ایک انڈا بچتا ہے جس سے مچھلی پیدا ہوتی ہے۔ ان اعداد و شمار کو دیکھتے ہوئے مجبوراً اس بات کا بیڑہ اٹھایا گیا ہے کہ مچھلیوں کے انڈوں کی حفاظت کیجائے تاکہ ان کی تعداد میں کمی واقع نہ ہوسکے۔

چنانچہ جب مچھلیوں کے انڈے دینے کا زمانہ آتا ہے تو بہت سی کشتیاں سمندروں میں صرف اسی لئے پھرتی رہتی ہیں کہ وہ سطح آب پر بہتے ہوئے انڈوں کو جمع کریں۔ اور

پھر وہ انہیں تالابوں میں پہنچا دیئے جاتے ہیں جو خاص اس مقصد کے لئے طیار کئے گئے ہیں اور جنہیں نلوں کے ذریعہ سے ہر وقت سمندر کا تازہ پانی آتا رہتا ہے۔

مچھلی کے انڈے نہایت نازک ہوتے ہیں اور ذرا سی غفلت سے ہزاروں کی تعداد میں ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے ان کی بہت حفاظت اور نگرانی کی جاتی ہے۔

جب انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں تو انہیں تالابوں سے نکال کر سمندر کے ان حصوں میں چھوڑ آتے ہیں جہاں ماہی گیری بہت آسان ہے تاکہ دوبارہ پکڑنے میں زیادہ دقت نہ ہو۔ اس قسم کے تالاب پورٹ ایرن میں بنائے گئے ہیں۔ اس تالاب میں ایک لاکھ تیس ہزار گیلن پانی آتا ہے۔ اور صرف ایک موسم میں اسی لاکھ بچے پیدا کئے گئے ہیں۔

شفاخانوں کا ابتدائی دَور

ایک سرسری نظر

۱۶۶۵ء میں جب طاعون کی زبردست وبا پھیلی تو اس وقت لندن میں صرف تین یا چار ہسپتال تھے عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مرض ہوا کے ذریعہ سے پھیلتا ہے چنانچہ سڑکوں اور گلیوں میں آگ جلائی گئی۔ پھر لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ مرض جانوروں کے ذریعہ سے پھیلتا ہے اور اس لئے چالیس ہزار سے زیادہ کتے اور بلیاں لندن کی سڑکوں پر مار ڈالی گئیں۔ ہسپتالوں میں سائنٹفک اصول پر امراض کی جانچ پڑتال تقریباً سو سال ہوئے کہ شروع ہوئی۔ اور گذشتہ پچاس سالوں میں طبابت اور جراحی نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اسوقت تقریباً تیس ہزار مریض لندن کے ہسپتالوں کے کمروں میں روزانہ قیام پذیر رہتے ہیں۔ گذشتہ سال ان ہسپتالوں سے نو ہزار سے زیادہ مصنوعی اعضاء لوگوں کو دئے گئے جنہیں ساڑھے تین ہزار دانت۔ نو سو عینکیں اور دو ہزار مصنوعی پاؤں شامل ہیں۔ لندن میں ایک ہاسپٹل سنڈے فنڈ ہے جس میں لوگ اسلئے چندے دیتے ہیں کہ ان سے صرف شفاخانے کھولے جائیں اس فنڈ کو قائم ہوئے تقریباً ۴۵ سال گذرے ہیں اور اسوقت تک اس میں سے مریضوں پر

معلومات

آج کل دنیا کے سائنس داں حلقوں میں اس تجویز پر بہت دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ تمام روئے زمین کی اس گہرائی تک کیمیائی اور جماداتی تحقیقات کی جائے جہاں تک اس وقت تک کوئی نہ پہونچ سکا ہو۔

اس سلسلہ میں میکگل یونیورسٹی میں جو کوششیں کی گئیں ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ دور حاضرہ کی انجینئرنگ بارہ میل کی گہرائی تک کامیابی کے ساتھ تحقیق و تفتیش کر سکتی ہے۔ اور بعض مقامات پر بیس میل کی گہرائی بھی کوئی بڑی چیز نہیں۔ دنیا کی انتہائی گہرائی جو اس زمانہ کی سائنس کا نتیجہ ہے۔ وہ برازیل میں مورو ویلہو کی کان ہے۔ جہاں سوا میل کی گہرائی پر سونا اور چاندی نکالی جاتی ہے۔

اس نئی تجویز کو بروئے کار لانے میں انجینئروں کو جو سب سے بڑی دقت پیش آئیگی وہ شدید گرمی کا مقابلہ کرنا ہے۔ سطح زمین سے نیچے کی جانب ہر تیس گز کے بعد ٹمپریچر ایک ڈگری بڑھ جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ دو میل کی گہرائی میں پانی کھولنے لگے گا۔ اور پچیس میل کی گہرائی میں دنیا کی سب سے زیادہ سخت دھات بھی پگھل جائیگی۔

دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا نام انگریزی کے بعض حروف تہجی کے نام پر ہے۔ چنانچہ ہالینڈ میں ایک دریا ہے جس کا نام "وائی" ہے۔ چین کے شہر کا نام "یو" اور سویڈن کے ایک قصبہ کا نام " اے" ہے

کیمبرج کے ایک سائنٹسٹ نے عجیب آلہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے وہ تمام خفیہ خبریں معلوم کیجا سکتی ہیں جو دماغ رگوں کے مرکز کو پہونچاتا ہے۔ یہ آلہ بالکل وائرلس کے

آلہ کے جیسا ہے جس میں ایک فوٹو گرافک پلیٹ بھی لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ جب یہ رگوں پر لگایا جاتا ہے تو اسی فوٹو گرافک پلیٹ پر تمام خبریں بہت سے نقطوں اور خطوں کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ یہ آلہ اس قدر "موثر" ہے کہ اس کے ذریعہ سے مینڈک کے دماغ کی خبریں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔

دنیا میں سب سے زیادہ حیرت انگیز سلسلۂ آب رسانی لندن کی سڑکوں کے نیچے ہے۔ اس شہر میں اکیس سو اسی میل سے زیادہ لمبائی کے پائپ لگے ہوئے ہیں۔ ان پائپوں میں پانی کا وزن بہت ہی زیادہ ہے جس کا اوسط فی مربع انچ سات سو پچاس پونڈ ہے۔ اور گذشتہ سال دو کروڑ چالیس لاکھ گیلن فی ہفتہ سے زیادہ پانی خرچ ہوا لندن کی حیرت ناک ترقی کا اندازہ صرف اسی امر سے ہو سکتا ہے کہ اب سے تیس سال پیشتر صرف ساٹھ لاکھ گیلن فی ہفتہ پانی خرچ ہوتا تھا۔

دنیا میں "گئوسالے" "اصطبل" "چڑیا خانے" وغیرہ تو بہت ہیں لیکن "شیر خانہ" صرف ایک ہی ہے۔ جو کلیفورنیا میں واقع ہے۔ اس کی عمارت دو ایکڑ زمین میں پھیلی ہوئی ہے جس کے کنارے کنارے بلند فصیل ہے اور اس میں چوہتر شیر پلے ہوئے ہیں۔

شیرنیاں سال میں دو مرتبہ بچے دیتی ہیں۔ ایک بچّہ کی قیمت ۵۰ پونڈ اور ایک پورے شیر نر کی قیمت دس ہزار پونڈ ہوتی ہے۔ اکثر یہ جانور فلم اور سرکس کمپنیوں میں کام کرنے کے لئے کرایہ پر بھی دئے جاتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ایک شیرنی نے اسی طرح چار سو پونڈ کی آمدنی کی۔

لیکن ان کی دیکھ بھال کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ خصوصاً بچوں کی پرورش میں سخت دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان شیروں کو گھوڑے کا گوشت کھلایا جاتا ہے۔

بعض تتلیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے منہ نہیں ہوتا اور وہ اپنی مختصر زندگی بھر کچھ نہیں کھاتیں۔

محمد عبد الرحمن نے خلافت پریس واقع سلطان منشن ڈونگری بمبئی نمبر ۹ میں چھاپا ۔ اور رشید صدیقی نے دفتر "اودستان" ۱۶۳ بھادرمین روڈ بمبئی نمبر ۱۴ سے شائع کیا۔